چودھری محمد علی ردولوی : حیات اور فن

تحقیقی مقالہ برائے

پی ایچ۔ڈی (اردو)

تحقیق: ثریا شمیل

ایم۔اے (اردو ادب)۔ایم۔اے (اردو لسانیات)۔ڈپلوما (ہندی)

اسسٹنٹ پروفیسر۔شعبہ اردو۔جامعہ کراچی

نگراں: پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال

سابق صدر شعبہ اردو۔جامعہ کراچی

رئیس کلیہ فنون، تجارت و قانون۔وفاقی جامعہ اردو۔عبدالحق کیمپس۔کراچی

تحقیقی مقالہ پی ایچ۔ڈی (اردو) کی سند کیلئے شعبہ اردو کے توسط سے برائے منظوری

بورڈ برائے اعلیٰ تعلیم و تحقیق۔جامعہ کراچی

کو پیش کیا گیا

مارچ ۲۰۰۴ء

فہرستِ ابواب

فہرست تصاویر ---------- ۵
ابتدائیہ ---------- ۶

باب اول : ردولی کا تاریخی وتہذیبی پسِ منظر

۱۔ قصبہ ردولی کی تاریخ ---------- ۱۱
۲۔ قصبہ ردولی کا جغرافیہ ---------- ۱۶
۳۔ ردولی کی سماجی وتہذیبی زندگی کی جھلکیاں ---------- ۲۴
۴۔ ردولی کے قابلِ ذکر صوفیائے کرام، مذہبی اور سیاسی شخصیات ---------- ۲۸
۵۔ ردولی کا علمی وادبی ماحول ---------- ۳۲

باب دوم : چودھری محمد علی ردولوی کے حالاتِ زندگی

۱۔ شجرہ ءنسب اور خاندان ---------- ۴۴
۲۔ ولادت اور تعلیم وتربیت ---------- ۴۶
۳۔ ازدواج اور اولاد ---------- ۵۰
۴۔ مزاج، وضع قطع اور افتادِ طبع ---------- ۶۰
۵۔ علمی اور ادبی سرگرمیاں ---------- ۶۵
۶۔ معاصرین کے ساتھ رابطہ ---------- ۷۰
۷۔ سماجی خدمات، ملازمت اور مذہبی رجحانات ---------- ۷۸
۸۔ خامیاں، تقریری صلاحیت اور وفات ---------- ۸۳

باب سوم : چودھری محمد علی ردولوی کی مکتوب نگاری

۱۔ اردو مکتوب نگاری کی قدیم روایات ---------- ۹۴
۲۔ خطوط نگاری کا ادبی جائزہ ---------- ۹۷
۳۔ چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط کا تجزیہ ---------- ۹۹
۴۔ اردو کے مکاتیبی ادب میں ''گویا دبستاں کھل گیا'' کا مقام اور تنقیدی جائزہ ---------- ۱۰۹

۵۔ چودھری صاحب کے مکتوبات کا موضوعاتی جائزہ ۔۔۔۔۔ ۱۱۴
۶۔ مکتوب الیہان سے تعلقات کی نوعیت ۔۔۔۔۔ ۱۳۰
۷۔ مکتوبات میں شعروادب کے مختلف رجحانات ۔۔۔۔۔ ۱۳۶
۸۔ چودھری محمد علی ردولوی کے غیر مطبوعہ خطوط ۔۔۔۔۔ ۱۴۲

باب چہارم : چودھری محمد علی ردولوی کی افسانہ نگاری

۱۔ اردو افسانہ نگاری کا پسِ منظر ۔۔۔۔۔ ۱۴۹
۲۔ چودھری محمد علی ردولوی کے معاصر افسانہ نگار ۔۔۔۔۔ ۱۵۰
۳۔ چودھری صاحب کے افسانوں کے اسلوب اور موضوعات ۔۔۔۔۔ ۱۵۲
۴۔ افسانوں کی زبان کا تجزیہ، قدرتِ بیان، محاورے کا استعمال ۔۔۔۔۔ ۱۵۴
۵۔ اردو کے افسانوی ادب میں چودھری صاحب کی قدر و قیمت کا تعین ۔۔۔۔۔ ۱۶۱

باب پنجم : چودھری محمد علی ردولوی بحیثیت انشائیہ نگار

۱۔ انشائیہ کی تعریف ۔۔۔۔۔ ۱۶۴
۲۔ انشائیہ نگاری کا پسِ منظر مغرب میں ۔۔۔۔۔ ۱۶۸
۳۔ اردو انشائیہ کا پسِ منظر ۔۔۔۔۔ ۱۶۹
۴۔ انشائیہ کے موضوعات اور اسلوب کی وسعت ۔۔۔۔۔ ۱۷۳
۵۔ چودھری محمد علی ردولوی کی انشائیہ نگاری ۔۔۔۔۔ ۱۷۶
۶۔ چودھری صاحب کے انشائیوں کے موضوعات ۔۔۔۔۔ ۱۸۲
۷۔ چودھری محمد علی کی انشائیہ نگاری کا اسلوب ۔۔۔۔۔ ۱۸۵

باب ششم : چودھری محمد علی ردولوی بحیثیت مزاح نگار

۱۔ مزاح نگاری کا پسِ منظر ۔۔۔۔۔ ۱۸۸
۲۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کی تعریف ۔۔۔۔۔ ۱۹۳
۳۔ اردو مزاح نگاری کا آغاز اور ارتقاء ۔۔۔۔۔ ۱۹۴
۴۔ چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط میں مزاح ۔۔۔۔۔ ۱۹۹
۵۔ چودھری صاحب کے افسانوں، کہانیوں اور مضامین میں طنز و مزاح ۔۔۔۔۔ ۲۰۴

باب ہفتم : چودھری محمد علی ردولوی بحیثیت خاکہ نگار

۱۔ فنِ خاکہ نگاری ---------- ۲۱۲

۲۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری ---------- ۲۱۵

۳۔ چودھری محمد علی کے تحریر کردہ خاکے ---------- ۲۱۷

۴۔ چودھری صاحب کی خاکہ نگاری کا فن ---------- ۲۱۸

۵۔ چودھری محمد علی کی خاکہ نگاری کے اسلوب ---------- ۲۲۵

باب ہشتم : چودھری محمد علی ردولوی کی ادبی خدمات

۱۔ چودھری صاحب کی تصانیف ---------- ۲۲۸

۲۔ اہم تصانیف کا تفصیلی جائزہ ---------- ۲۲۹

۳۔ جملہ تصانیف کا لسانیاتی جائزہ ---------- ۲۴۳

۴۔ ادبی تخلیقات کی خصوصیات ---------- ۲۶۰

۵۔ ادبی خدمات کی قدر و قیمت کا تعین ---------- ۲۶۴

باب نہم : کتابیات

۱۔ کتب ---------- ۲۷۳

۲۔ رسائل و اخبارات ---------- ۲۷۶

۳۔ مضامین ---------- ۲۷۷

۴۔ مستند سرکاری و غیر سرکاری کاغذات ---------- ۲۸۰

فہرستِ تصاویر

۱۔ قصبہ ردولی کے محلے شیخانہ اور قضیانہ کے درمیان واقع تالاب جھری تارا کا ایک دلکش منظر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹

۲۔ چودھری محمد علی ردولوی عہد شباب میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۹

۳۔ چودھری محمد علی ردولوی کی زوجہء اولیٰ عابدہ بیگم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۱

۴۔ چودھری صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہما بیگم عمر کے آخری دور میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۵

۵۔ ہما بیگم اپنے صاحبزادگان رضا کاظم اور سید علی کاظم (دائیں) کے درمیان میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۶

۶۔ ہما بیگم اپنی اولادوں رتی بیگم، رضا کاظم اور مدحت کاظم (دائیں سے بائیں) کے ہمراہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۷

۷۔ ہما بیگم اپنی ۹۳ ویں سالگرہ کا کیک کاٹتے ہوئے اپنی اولادوں اور ان کے بچوں کے درمیان میں ۔۔۔۔۔۔ ۵۸

۸۔ چودھری صاحب کی زوجہء ثانی قیصر بیگم اپنے بیٹے چودھری سعید مصطفیٰ علی کے ساتھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱

۹۔ چودھری محمد علی ردولوی اپنی عام وضع قطع کے ساتھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۳

۱۰۔ چودھری صاحب اپنے تصنیفی دور میں اپنے منشی کے ساتھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۹

۱۱۔ چودھری محمد علی ردولوی عہد پیری میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۷

۱۲۔ اپنی عمر کے آخری زمانے میں چودھری صاحب تصنیف و تالیف میں مصروف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۸

۱۳۔ ردولی کے محلہ سالار میں واقع چودھری محمد علی کی کوٹھی جہاں انہوں نے ساری عمر گزاری۔ پھاٹک کے اندر عمارت کا وہ حصہ جہاں وہ ہومیوپیتھی کا مطب چلایا کرتے تھے۔ عمارت کے سامنے چودھری سعید مصطفیٰ مع رضی حیدر برنی اور اپنے دوسرے بیٹے (بائیں سے دائیں) کے ساتھ کھڑے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۹

۱۴۔ عمر کے آخری زمانے میں چودھری صاحب کی ایک تحریر کا عکس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۰

۱۵۔ ردولی کے قبرستان ''عیدی میراں'' میں چودھری محمد علی ردولوی کی آخری آرامگاہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۲

۱۶۔ چودھری محمد علی ردولوی کے ۶ / مارچ ۱۹۴۸ء کے تحریر کردہ خط کا عکس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۱

۱۷۔ چودھری صاحب کے گزشتہ خط میں انگریزی تحریر کا عکس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۲

۱۸۔ چودھری صاحب کے ۳/ نومبر ۱۹۵۱ء کے تحریر کردہ خط کا عکس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۳

۱۹۔ چودھری صاحب کے ۲۳/ اپریل ۱۹۵۵ء کے تحریر کردہ خط کا عکس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۴

۲۰۔ چودھری محمد علی ردولوی کے ۳/ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے تحریر کردہ خط کا عکس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۵

ابتدائیہ

بابری مسجد کے افسوسناک واقعہ کے تحت شہرت حاصل کرنے والے بھارت کے شہر اجودھیا کے نزدیک اودھ کا قدیم ضلع فیض آباد واقع ہے۔ اس کے حدود میں ایک خوبصورت سا قصبہ ردولی ہے جو چند سال پیشتر لکھنؤ کے قریب واقع بارہ بنکی ضلع میں شامل تھا۔ یہ ادبا' شعراء اور صوفیائے کرام کی سرزمین ہے۔ تقسیم برصغیر سے قبل یہاں رؤسا' تعلقہ دار اور شرفاء کثیر تعداد میں رہائش پذیر تھے' جو اعلیٰ ادبی ذوق کے حامل تھے۔ اسی سرزمین کے ایک تعلقہ دار گھرانے سے تعلق رکھنے والے چودھری محمد علی ردولوی اردو کے دور اول کی افسانہ نگاری' خاکہ اور انشائیہ نگاری کی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ بہت زیادہ معروف تو نہیں ہیں' لیکن سنجیدہ اور ثقہ ادبی مورخین و ناقدین ان کی ادبی حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا تحریری اسلوب ان کی ہمہ جہت شخصیت کا غماز ہے۔ ان کے افسانوں اور خاکوں کے موضوعات زندگی کی عام صورتِ حال سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس وجہ سے وہ نہ صرف اس زمانے کے اندازِ فکر کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ وسیع تر انسانی مسائل کی غمازی بھی کرتے ہیں۔

چودھری محمد علی نے اپنے اعزاء و اقربا اور دوست و احباب کو جو خطوط تحریر کئے ان میں ایک ایسا والہانہ پن پایا جاتا ہے' جو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ خط نہیں لکھتے بلکہ باتیں کرتے ہیں۔ ان کی مکتوب نگاری کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے تحریر کردہ خطوط میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہہ کے فاصلے کو پاٹ دیا گیا ہے اور تحریر و گفتگو کے فرق کو مٹا دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اندازِ بیان کے پیش رو غالب تھے مگر چودھری محمد علی نے نہ صرف اس اندازِ بیان کو اپنایا' بلکہ اسے وسعت دے کر دلکش اور جاذبِ نظر بنا دیا۔ ایک خاص قسم کی آزاد خیالی جو چودھری محمد علی کے خطوط کا طرہ امتیاز ہے وہ غالب کے یہاں بھی نہیں ملتی۔

قصبہ ردولی کے رئیس چودھری محمد علی ان چند اکابرین ادب میں سے ہیں جن کی ذات میں مشرقی وضع داری اور مغربی آزاد خیالی کی بہترین کیفیتیں ایک ہی وقت میں جمع ہوگئی ہیں۔ ان کی تحریروں میں نفسیات و جنسیات' فلسفہ و ادب' معاشرت و لطافت' حسن زبان و لطفِ مزاح کا ایسا لطیف مجموعہ ملتا ہے کہ قاری اس سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسلوب موضوعات اور زبان و بیان کے لحاظ سے چودھری صاحب اس بات کے مستحق ہیں کہ نہ صرف ان کی شخصیت کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے بلکہ ان کے ادبی خد و خال کو بھی اجاگر کر کے علمی دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اور اسی ضرورت اور علمی امر نے اس تحقیقی مقالے کا جواز پیدا کیا۔

زیرِ نظر مقالہ نو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں قصبہ ردولی کا تاریخی و تہذیبی پسِ منظر پیش کیا گیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس زمانے کی ردولی کو بیان کیا گیا ہے' جہاں چودھری صاحب نے اپنی زندگی کے سنہرے اوقات گزارے اور بہترین ادب پارے تخلیق کیے۔ اس باب میں ردولی کے نام کی وجہ تسمیہ' مختصر سی تاریخ اور تفصیل سے اس کا جغرافیہ بیان کیا گیا ہے۔ حدود اربعہ' رقبہ' زمین اور پیداوار کے علاوہ تالابوں کی تفصیل' آبپاشی' موسم' محلوں کی تفصیل اور آبادی کی تشریح کی گئی ہے۔ یہاں کی سماجی و تہذیبی زندگی کی جھلکیاں پیش کرنے کے بعد روزمرہ زندگی کے انِ پہلوؤں پر لکھنؤ' بارہ بنکی' دریا آباد' ردولی اور فیض آباد کے اثرات دکھائے گئے ہیں۔ خاص طور پر یہاں بولی جانے والی زبان پر قرب و جوار کے اثرات تلاش کیے گئے ہیں۔ بعدازاں یہاں کے قابلِ ذکر صوفیائے کرام' مذہبی اور سیاسی شخصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ردولی کا علمی اور ادبی ماحول بیان کرنے کی غرض سے یہاں کے مشہور ادیب' شعراء اور ادبی انجمنوں کی وضاحت کی گئی ہے اور آخر میں یہ دکھانے کی غرض سے چند نظمیں پیش کی گئی ہیں کہ ردولی شعراء کی نظر میں کیسی ہے اور کس طرح کا ماحول پیش کرتی ہے۔ گویا ہر طرح سے چودھری صاحب کے گرد و پیش کے ماحول کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرا باب چودھری محمد علی کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے' جس میں ان کے شجرہ نسب' خاندان کے حالات اور اسلاف کی تفصیلات تحریر کی گئی ہیں۔ ان کی ولادت کے بارے میں لکھنے کے بعد ان کے برادران و ہمشیرگان' ازدواج اور اولادوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ان کی تعلیم پر روشنی ڈالنے کے بعد چودھری صاحب کے مزاج' وضع قطع اور افتادِ طبع کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ بعدازاں ان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا اور پھر معاصرین کے ساتھ ان کے رابطے بیان کیے گئے۔ بعدازاں یہ بھی اندازہ لگایا گیا کہ وہ اپنے زمانے کی کن اہم شخصیات سے متاثر ہوئے۔ ان کی سماجی خدمات اور مذہبی خیالات کا بھی جائزہ لیا گیا۔ ان کی تقریری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی خامیوں کو بھی پرکھا گیا اور آخر میں ان کی وفات کی بھی تفصیل بیان کی گئی۔ گویا اس باب میں نہ صرف چودھری محمد علی کے جملہ کوائف بیان کیے گئے ہیں بلکہ ان کی شخصیت کا ہر زاویہ سے جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب چودھری محمد علی ردولوی کی مکتوب نگاری پر روشنی ڈالتا ہے۔ اردو زبان میں مکتوب نگاری کی قدیم روایات کو بیان کرنے کے بعد خطوط نگاری کا ادبی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ناقدین ادب کی آراء سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد چودھری صاحب کے تحریر کردہ خطوط کا تجزیہ کیا گیا۔ اور ان کے خطوط کے مجموعے ''گویا دبستاں کھل گیا'' کا اردو کے مکاتیبی ادب میں مقام کا تنقیدی جائزہ لیا گیا۔ پھر انتہائی تفصیل سے چودھری صاحب کے مکتوبات کا

موضوعاتی تجزیہ کیا گیا' جس میں ہر طرح کے موضوعات تلاش کئے گئے ۔ بعد ازاں چودھری صاحب کے مکتوب الیہان سے تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالی گئی اور مکتوبات میں شعر و ادب کے رجحانات کا مطالعہ پیش کیا گیا۔ اس سلسلے میں بھی چند تنقید نگاروں کی آراء سے استفادہ کیا گیا۔ آخر میں چودھری صاحب کے چند غیر مطبوعہ خطوط پیش کئے گئے جو تلاشِ بسیار کے بعد حاصل کئے گئے تھے۔

چوتھے باب میں چودھری محمد علی ردولوی کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اردو افسانہ نگاری کا پسِ منظر بیان کیا گیا ہے۔ پھر چودھری صاحب کے معاصر افسانہ نگاروں پر ایک نظر ڈالی گئی ہے' یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ اس وقت کی فنِ افسانہ نگاری کی روش کیا تھی۔ اس کے بعد چودھری صاحب کے تحریر کردہ افسانوں کو پرکھا گیا ہے۔ بعد ازاں ان کے اسلوب و موضوعات تلاش کئے گئے اور تفصیل سے ان کے افسانوں کی زبان کا تجزیہ کیا گیا۔ ان میں قدرتِ بیان اور محاوروں کے استعمال کا جائزہ لیا گیا۔ آخر میں اردو کے افسانوی ادب میں چودھری محمد علی کی افسانہ نگاری کی قدر و قیمت کا تعین کیا گیا۔ اس سلسلے میں مختلف نقادوں کی آراء بھی پیش کی گئیں۔

پانچواں باب چودھری صاحب کی انشائیہ نگاری کو اجاگر کرتا ہے۔ یہاں سب سے پہلے انشائیہ کی تعریف کی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں بڑے بڑے ناقدین اور محققین کی آراء بیان کی گئیں ہیں جن میں مشرقی اور مغربی دونوں طرح کے ادباء شامل ہیں۔ پہلے مغرب میں انشائیہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے اور پھر اردو انشائیہ کا پسِ منظر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں بھی ناقدین ادب کی آراء کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ انشائیہ کے موضوعات اور اسلوب کی وسعت کا اندازہ لگانے کے بعد اصل موضوع یعنی چودھری محمد علی ردولوی کی انشائیہ نگاری کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات تلاش کئے گئے ہیں۔ اور آخر میں ان کی انشائیہ نگاری کے اسلوب کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

چھٹے باب میں چودھری صاحب کی مزاح نگاری کی صلاحیت کو واضح کیا گیا ہے۔ مزاح نگاری کا پسِ منظر بیان کرنے کے بعد اردو میں طنز و مزاح کی تعریف پیش کی گئی ہے۔ اور پھر اردو ادب میں مزاح نگاری کا آغاز ضبطِ تحریر میں لانے کے بعد نثر میں اس کی ارتقائی منازل کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے چودھری محمد علی ردولوی کی تحریروں میں مزاح تلاش کیا گیا ہے اور مزاح کی خوبیاں بیان کی گئیں۔ آخر میں چودھری صاحب کے جملہ افسانوں' کہانیوں اور تحریر کردہ مختلف مضامین میں طنز و مزاح کا انتہائی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

ساتویں باب میں چودھری محمد علی ردولوی کی خاکہ نگاری کے فن کو اجاگر کر کے پیش کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے خاکہ نگاری کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سوانح نگاری اور خاکہ نگاری میں تمیز کیا گیا ہے۔ تذکرے اور خاکے کے فرق کو واضح

کیا گیا ہے اور پھر کرداری اور شخصی خاکوں میں تفریق کی گئی ہے۔ اس کے بعد اردو ادب میں خاکہ نگاری کا مختصر سا جائزہ لیا گیا اور پھر اس کے بعد چودھری محمد علی ردولوی کے تحریر کردہ خاکوں کا تجزیہ کیا گیا۔ چودھری صاحب کی خاکہ نگاری کے فن کا انتہائی تفصیل سے جائزہ لیا گیا اور آخر میں ان کی خاکہ نگاری کے اسلوب بیان کئے گئے ہیں۔

آٹھویں باب میں چودھری صاحب کی جملہ ادبی خدمات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ سب سے پہلے چودھری صاحب کی تصانیف مختصراً بیان کی گئیں اور پھر ان کی اہم تصانیف کا ایک ایک کر کے انتہائی تفصیل سے جائزہ لیا گیا۔ بعد ازاں چودھری صاحب کی تمام تصانیف کا لسانیاتی نقطہ نگاہ سے تجزیہ کیا گیا۔ اس کے بعد ان کے طرز تحریر کی خصوصیات بیان کی گئیں۔ آخر میں چودھری صاحب کی تمام تصانیف جن میں کہانیاں' افسانے' انشائیے' مضامین اور ان کے تحریر کردہ خطوط بھی شامل ہیں' ان سب کی علیحدہ علیحدہ قدر و قیمت کا تعین کیا گیا ہے۔

نواں اور آخری باب کتابیات سے متعلق ہے۔ کتب' رسائل و اخبارات اور مضامین کی الگ الگ فہرستیں بنائی گئی ہیں۔ جن کتابوں یا رسائل سے استفادہ کیا گیا ہے حواشی میں ان کے نام مصنفین کے نام کے ساتھ مع صفحہ نمبر دیئے گئے ہیں۔ مکمل تفصیلات کتابیات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں' جو مصنفین کے مکمل ناموں کے لحاظ سے باعتبار حروف تہجی مرتب کی گئی ہے۔ مکمل نام سے مراد وہ نام اسی اعتبار سے تحریر کیا گیا ہے جس اعتبار سے طبع کیا گیا تھا۔ یعنی چودھری' حکیم' ڈاکٹر' پروفیسر' شیخ' سید وغیرہ کے سابقے اور لاحقے برقرار رکھے گئے ہیں۔ ایک ہی مصنف کی متعدد تصانیف سنِ اشاعت کی عددی ترتیب کے لحاظ سے ترتیب دی گئی ہیں۔ اگر کسی مصنف کی ایک ہی سن میں ایک سے زائد کتب شائع ہوئی ہیں تو انہیں کتابوں کے نام سے بہ لحاظِ حروف تہجی ترتیب دیا گیا ہے۔ سنِ اشاعت کو قلابین میں لکھا گیا ہے اور ابہام کی صورت میں اسے سوالیہ نشان سے ظاہر کیا گیا ہے۔ سنِ اشاعت کے بعد کتاب یا مضمون کا عنوان دیا گیا ہے۔ بعد ازاں کتاب کی صورت میں ناشر اور مقامِ اشاعت رسالہ یا جریدے کی شکل میں اس کا نام' مقامِ اشاعت اور ماہنامے کا مہینہ تحریر کیا گیا ہے۔ مضامین کے عنوان کے بعد ''مشمولہ'' کے لفظ کے ساتھ اس کتاب یا رسالے کا مکمل حوالہ دیا گیا ہے۔ جس میں وہ مضمون شامل ہے۔ آخر میں کتاب کے مکمل صفحات اور رسالے کے وہ صفحات لکھے گئے ہیں جن پر متعلقہ مضمون محیط ہے۔ کتابیات کے اختتام پر ایسے مستند سرکاری و غیر سرکاری کاغذات کے حوالے دیئے گئے ہیں جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ان میں اکثر انگریزی زبان میں تحریر شدہ ہیں۔

یہ مقالہ پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال' سابق صدر شعبہ اردو' جامعہ کراچی اور موجودہ رئیس کلیہ فنون' تجارت و فنون' وفاقی جامعہ اردو' عبدالحق کیمپس' کراچی کی نگرانی میں پی ایچ' ڈی کی سند کے حصول کے لئے تحریر کیا گیا ہے۔ اس مقالے کی تکمیل ڈاکٹر صاحب کی مستقل رہنمائی' اعانت اور حوصلہ افزائی سے ہی ممکن ہوسکی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چودھری محمد علی

ردولوی کی تحریر کردہ اوران سے متعلق چند نایاب کتب ورسائل انہوں نے ہی تلاشِ بسیار کے بعد فراہم کیئے۔ ان کے علم و فضل کے علاوہ ان کے وسیع وعریض کتب خانے سے بے شمار تنقیدی کتابوں کے استفادے کا موقع بھی میسر آیا۔ تحریر کے آغاز میں جب انسان اندھیرے میں ادھر ادھر ہاتھ پیر مارتا ہے اور گھبراہٹ کا شکار ہوتا ہے' محترم استاد پروفیسر سحر انصاری نے بعض نہایت مفید مشورے دیئے اور ہمت بھی بندھائی۔ محترم ڈاکٹر فرمان فتح پوری میرے بہت ہی شفیق اور پسندیدہ استاد ہیں' انہوں نے بھی قدم قدم پر خوبصورت اور پرشفقت الفاظ کے ذریعے رہنمائی کی۔ اس کے علاوہ پروفیسر اسلم فرخی' پروفیسر ابوالخیر کشفی' پروفیسر حنیف فوق وغیرہ کی شاگردی کا شرف حاصل رہا اوران اساتذہ نے بھی بہت حوصلہ افزائی کی اور آخر میں میرے ہمدرد اور بہت ہی عزیز استاد محترم جناب پروفیسر جمیل اختر مرحوم جنکی خواہش یہ تھی کہ میں پی ایچ۔ ڈی کرلوں۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر تم پی' ایچ۔ ڈی کرلوگی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ کاش آج وہ زندہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔

چودھری صاحب کی کتابوں اوران کے خاندان کے افراد کے بارے میں معلومات اوران کی تصاویر کے حصول میں بہت زیادہ جدوجہد کرنا پڑی۔ کتابوں کے سلسلے میں ابتدائی مدد قصبہ ردولی میں مقیم محترم قارب قرنی اوران کی ہمشیرہ نسرین برنی نے کی۔ اوران کے توسط سے ہما بیگم کے چھوٹے صاحبزادے سید علی کاظم سے رابطہ ہوا جنہوں نے کتابیں' خاندانی معلومات اور تصاویر کی فراہمی میں بڑی فراخدلی سے مدد کی۔ ان کے توسط سے لاہور میں مقیم ہما بیگم سے رابطہ ممکن ہوسکا' جن سے سماعت کی کمی اور ضعیف العمری کی وجہ سے بڑی مشکل سے گفتگو ٹیپ کی جاسکی جو بڑی مفید رہی۔ بعدازاں کینیڈا میں مقیم چودھری محمد علی کے پوتے عابد سلمان سے رابطہ ممکن ہوا جن سے چودھری صاحب اوراہلِ خاندان کی چند بہت ہی نایاب تصاویر حاصل ہوئیں' جو اس مقالے کی زینت بنیں۔ ردولی میں واقع چودھری صاحب کے مکان اوراندرونِ خانہ کی تصاویر بھی حاصل کی گئیں' جنہوں نے اس مقالے میں چار چاند لگا دیئے۔ ان سارے مواد کے حصول سے ہی اس مقالے کی تکمیل ممکن ہوسکی۔ لہٰذا مذکورہ بالا تمام افراد کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ جناب محمد جاوید نیاز صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی لازمی ہے' جنہوں نے اس مسودے کو بڑی جانفشانی سے ٹائپ کیا اور میری تحریر کو کمپیوٹر کے قلب میں اتار دیا۔ اپنی دونوں بیٹیوں ڈاکٹر سیمیں خلیق اور ڈاکٹر نوشیں شمیل کی بھی شکرگزار ہوں' جو اس مقالے کی تکمیل کے لیئے مسلسل دعاگو رہیں۔ سب سے آخر میں خصوصی اظہارِ تشکر اس عظیم شخص کیلیئے جسکی بدولت آج میں اس مقام تک پہنچی ہوں۔ یہ شخص کوئی غیر نہیں' بلکہ میرا جنم جنم کا ساتھی' میرے ہر دکھ درد میں شریک' میرا پیارا شوہر' ڈاکٹر مصطفیٰ شمیل ہے۔ انہوں نے اس مقالے کی تیاری میں ہر قدم پر میری رہنمائی کی' بہت زیادہ حوصلہ دیا اور ہر جگہ میری معاونت کی۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں' جن سے میں مناسب طور پر ان کا شکریہ ادا کرسکوں۔

باب اول

ردولی کا تاریخی وتہذیبی پس منظر

کسی بھی سرزمین کا مردم خیز ہونا وہاں کے آب وگل پر منحصر نہیں بلکہ کچھ اور عناصر بھی ہوتے ہیں جو کہ وہاں پر ایسی فضا قائم کر دیتے ہیں جو خداداد صلاحیتوں کو نشو ونما اور بالیدگی بخش کر سرسبز وشاداب کر دیتی ہے۔ ردولی تحصیل رام سہنی گھاٹ اور ضلع بارہ بنکی کا قدیم اور سب سے بڑا قصبہ ہے' اور پرگنہ کا صدر مقام ہے۔ آج کل یہ بارہ بنکی سے منتقل ہو کر فیض آباد ضلع میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ لکھنؤ' فیض آباد اور دریا آباد جیسے مشہور تاریخی شہروں کے درمیان بسا ہوا ہے' جس کی وجہ سے اس قصبہ کو اپنی جائے وقوع پر فضیلت حاصل ہے۔ اور اس کے ساتھ اس سرزمین کو خاصی مذہبی اہمیت بھی حاصل ہے' کیونکہ یہاں پر اوتار' رشی' سنت' صوفی' علماء اور فضلا نے قدم رکھا اور اپنی مذہبی تعلیم سے قصبہ کو کافی شہرت دی۔ قصبہ ردولی کے کوائف بیان کرنے کے لئے سب سے زیادہ استفادہ چودھری سید علی محمد زیدی صاحب عرف ببن میاں کی تصنیف کردہ کتاب ''اپنی یادیں' ردولی کی باتیں'' سے کیا گیا ہے۔ ان کا تعلق ردولی کے سب سے بڑے رئیس چودھری سید ارشاد حسین کے گھرانے سے ہے۔ چودھری ببن ردولی میں پیدا تو نہیں ہوئے لیکن اپنی زندگی کے پچاس سے زائد قیمتی سال تسلسل کے ساتھ ردولی میں گذارنے کے بعد انہوں نے بڑی جانفشانی اور انتہائی تحقیق کے بعد یہ کتاب تحریر کی ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس عرصے کے دوران ایک ہی مرتبے ایک ہی فقہ اور ایک جیسے چودھری (تعلقہ دار) گھرانوں سے تعلق ہونے کے باعث ان کا انتہائی قریبی تعلق اور رفاقت چودھری محمد علی کے ساتھ رہی۔ لہذا ان کی بیان کردہ ردولی کو چودھری محمد علی کی ردولی کہا جا سکتا ہے۔

ا۔ قصبہ رودلی کی تاریخ:

جب آریا قوم ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئی تو ان لوگوں نے مختلف سلطنتیں قائم کیں۔ ان میں سے ایک سلطنت کوشل نام کی تھی' جس کو چھتری ذات کے ایک شخص نے قائم کیا تھا۔ چونکہ اس شخص کا نام کوشل تھا اس لئے اس نے اپنے ہی نام کی مناسبت سے اس سلطنت کا نام کوشل رکھا اور اجودھیا کو اپنا دارالسلطنت بنایا یہی اجودھیا شہر بعد میں اودھ کے نام سے مشہور ہوا۔

''پہلے پہل جو بنیاد شہر کی ڈالی گئی وہ یہ شہر اودھ تھا۔ کشن نے اس شہر اودھ کو نہایت خوبی و آراستگی سے آباد کر کے پایہ تخت حکومت قرار دیا۔ چونکہ یہ شہر اس کی وسط سلطنت میں یعنی آدھوں آدھ ملک کے واقع تھا' اس لئے اودھ نام رکھا گیا۔ اس سلطنت میں ردولی بھی شامل تھا۔ اس خاندان میں ایک بہت ہی مشہور راجہ دشرتھ تھے جن کے بیٹے رام چندر جی تھی۔ کافی عرصہ تک اسی خاندان کی حکومت رہی۔ جب اس سلطنت کا خاتمہ ہوا' تو کافی عرصے تک اس سلطنت پر دوسرے راجاؤں نے قبضہ رکھا۔ پھر بارہویں صدی میں قنوج سلطنت سے منسلک ہوگئی۔ قنوج کو راجہ سورج نے گنگا کے کنارے بسایا تھا' اس نے اودھ کے بجائے قنوج کو دارالسلطنت قرار دیا۔ یہاں کا پہلا راجہ جے چند تھا''[1]۔

بھر قوم:

قنوج کے دور حکومت میں زیادہ تر بھر قوم کے لوگ اودھ میں آباد تھے۔ بارہویں صدی کے تیس پینتیس سال گزرنے کے بعد راجہ جے چند والئی قنوج نے آلہا اودل کو بھروں پر فتح حاصل کرنے اور ان کے قلعوں کو برباد کرنے کے لئے اس علاقے میں بھیجا جنہوں نے بھروں کو شکست دیکر ان کے قلعوں کو برباد کر دیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے بھاگ کر دوسری جگہوں پر پناہ لی۔ کچھ عرصے کے بعد راجپوتوں نے بھی ان کو شکست دینے کی کوشش کی۔ اس وقت بھروں نے برائے نام اطاعت قبول کر لی مگر ان پر راجپوتوں کا پوری طرح سے تسلط نہ ہو سکا۔

''بھر قوم راجہ بھوج کے بعد ہندوؤں سے الگ ہو کر غیر مہذب و نیم وحشی قوم کی طرح اودھ کے مختلف مقامات پر آباد ہوگئی' جس کا تعلق ہندوؤں کے ادنیٰ فرقے سے تھا۔ اس قوم کے باشندے مہذب اور شائستہ لوگوں سے دور رہنے لگے۔ اور مقام سکونت کو پہاڑ اور جنگل کے ذریعہ پوشیدہ رکھتے تھے''[2]۔

ردولی کے نام کی وجہ تسمیہ:

کہا جاتا ہے کہ قصبہ ردولی کو بھر راجہ رودرمل نے تخمیناً آٹھ سو سال قبل ۶۲۱ھ یعنی ۱۲۲۴ء میں آباد کیا تھا۔ اور اپنے نام کی مناسبت سے اس کا نام رکھا تھا جو ردولی کے نام سے مشہور ہوا (واجب العرض نرولی)۔ جتنے بھی مستند کاغذات اور کتابوں کا مطالعہ کیا گیا اس میں سے کوئی بھی عبارت ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتی۔ صرف واجب العرض برئی اور

---

[1] تاریخ اودھ' صفحہ ۴۔
[2] تاریخ دریا آباد' صفحہ ۶۔

ڈسٹرکٹ گزیٹیر بارہ بنکی میں تحریر شدہ سن عیسوی ضرور ایک دوسرے سے کچھ ملتے جلتے ہیں۔ اس کی بنا پر اگر یہ مان لیا جائے کہ راجہ رودرمل کا زمانہ شرقی دورحکومت یا اس سے کچھ قبل کا زمانہ ہوگا تو پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ اس سے قبل اس قصبہ کا کیا نام تھا۔ کیونکہ ۱۰۳۰ء میں سید سالار مسعود غازیؒ کے حملے کے بعد حسن رضا کا قیام یہ ثابت کرتا ہے کہ قصبہ مذکور موجود تھا اور اس کا نام ردولی تھا جس کی تصدیق گزیٹیر صوبہ اودھ سے بھی ہوتی ہے جس میں تحریر ہے کہ: ''سید حسن رضا غزنوی نے جو سید سالار مسعود غازیؒ کے ہمراہ آئے' ریاست اسیر پور کی بنیاد ڈالی اور امیر پور میں مقیم ہوئے جو ردولی کا ایک گاؤں ہے''[۳]۔

رودِوَلی: سلسلہ سہروردیہ کی بنیاد شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے ہندوستان میں قائم کی' ان کی ولادت ۱۱۸۲ء میں ہوئی۔ ایک اور بزرگ شیخ صلاح الدین سہروردیؒ جو کہ شیخ سیاح کے نام سے مشہور ہوئے' وہ سب سے پہلے اس قصبہ میں تشریف لائے اور مقیم ہو گئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے بہت سے مرید تھے۔ آپ کی شہرت سن کر بہت سے اولیاء کرام باہر سے آپ کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی بزرگ نے اس بستی کو جذبات سے متاثر ہوکر'' رودِوَلی'' کہہ دیا ہو۔ ویسے کسی بھی کتاب یا سرکاری کاغذ یا کسی دستاویز میں ''رودِوَلی'' لکھا ہوا نہیں دیکھا گیا ہے۔ چونکہ لکھنے میں ''رودِوَلی'' اور ''ردولی'' کا املا مشابہہ ہے اس وجہ سے ممکن ہے کہ کسی زمانے میں 'رودِوَلی' نام رہا ہو۔

رودراولی: ابھی تک کسی کی بھی نظر سے ''رودراولی'' نام نہیں گزرا ہے۔ واجب العرض میں حسب ذیل عبارت تحریر ہے۔

۱۔ واجب العرض تعلقہ ردولی ''رودرمل سنگھ کی آبادکی ہوئی ردولی خاص''

۲۔ واجب العرض قصبہ ردولی ''راجہ رودرمل سنگھ قوم بھر نے قصبہ مذکور کو اپنے نام سے آباد کیا''۔

ردولی کے ریلوے اسٹیشن پر آج بھی جو پتھر کا سلیب لگا ہوا ہے اس میں بھی ''ردولی'' تحریر ہے۔ اور یہ پتھر سوا سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ تمام مستند کاغذات جن کا حوالہ دیا گیا ہے ان سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ابتداء سے اس قصبہ کا نام ''ردولی'' تھا اور اب بھی اس کا صحیح املا ہے۔

مسلمانوں کے تسلط کے ادوار:

ہندوستان پر حکمرانی کرنے والے مختلف خاندانوں کے ادوار میں ردولی کی کیا حیثیت تھی' اس کا ایک مختصر سا جائزہ

۳۔ گزیٹیر آف اودھ' صفحہ ۲۷۴۔

درج ذیل ہے۔

محمود غزنوی: محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ان کا زمانہ ۹۸۸ء سے ۱۰۳۰ء تک کا ہے۔ان کے ساتھ بہت سے اولیاء کرام جہاد میں شریک ہونے کے لئے آئے اور یہیں مقیم ہوگئے تھے۔ اسی سلسلے میں سالار ساہو ۴۰۱ھ میں ہندوستان آئے جن سے کافی معرکے مختلف مقامات پر ہوئے۔۴۰۵ھ میں سالار ساہو کے یہاں سید سالار مسعود غازی پیدا ہوئے جو محمود غزنوی کی بہن کے بیٹے تھے یہ ۴۲۲ھ میں ردولی آئے۔مسلمان حملہ آوروں کے سلسلے میں ردولی اور اس کے نواح میں سب سے پہلے سید سالار مسعود غازیؒ ۱۰۳۰ء میں آئے۔ان کا بھروں سے مختلف جگہوں پر مقابلہ ہوا۔آپ سورج کنڈ بہرائچ کی جنگ میں ۱۴ جون ۱۰۳۳ء کو شہید ہوئے[۴]۔

شہاب الدین غوری: ۱۱۹۴ء میں محمد غوری نے جے پور پر حملہ کیا' جس میں انہیں فتح ہوئی اور سلطنت قنوج پر انکا قبضہ ہوگیا' اس میں اودھ بھی شامل تھا' بشمول ردولی۔

شمس الدین التتمش: شمس الدین التتمش کے عہد میں ۱۲۲۶ء میں ان کا بیٹا نصر الدین التتمش اودھ کا گورنر ہوا۔ان کے لئے بھر قوم اور راجپوت پھر پریشانی کا باعث ہوئے جن سے مختلف مقامات پر معرکہ ہوئے۔انہیں معرکوں میں ایک معرکہ ردولی میں بھی ہوا[۵]۔

علاؤالدین خلجی: ''جس وقت الہوانہ نیست و نابود ہوگیا اس وقت تخمیناً ۷۰۰ھ میں شاہ علاؤالدین خلجی کی فوجوں نے ردولی پر قبضہ کرلیا''[۶]۔

سلطان محمد بن تغلق: ۱۳۴۵ء میں سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں بھروں پر کافی دباؤ رہا اور بھر قوم کے کوئی بھی راجہ کسی قسم کی شورش نہیں کر پائے' اور ردولی بدستور ان کے قبضے میں رہا۔

شاہان شرقی: ۱۳۹۴ء میں ملک سرور خواجہ جہاں نے شرقی خاندان کی حکومت جونپور میں قائم کی اور قنوج سے لے کر

---

۴ واجب العرض تعلقہ امیر پور' مورخہ ۲ رمئی ۱۸۷۰ء۔
۵ واجب العرض تعلقہ قصبہ ردولی' ۲۶ رفروری ۱۸۷۰ء۔
۶ گزیٹیر آف اودھ' صفحہ ۲۵۶۔

جونپور تک کا کل حصہ خاندان شرقی کی حکومت میں شامل کرلیا۔ ۱۴۱۸ء میں سلطان ابراہیم شرقی نے سید محمد صالح صوفی جو شاہ شجاع کے پوتے تھے بہ غرض تسخیر ملک بھیجا۔ اسی زمانے میں ملک ہندوستان کے راجگان بھر کثرت سے مالک ریاست تھے۔ اکثر مقامات پر بھروں کا محاصرہ کر کے قتل کر دیا اور سکہ وخطبہ بنام بادشاہ جاری کیا۔

راجہ نرول مل سنگھ قلعہ دار نرولی' راجہ رودرمل سنگھ قلعہ دار ردولی خاص' راجہ پورن مل سنگھ قلعہ دار پورائے' یہ تینوں حقیقی بھائی تھے۔ ان تینوں راجاؤں نے اپنے اپنے نام سے ایک ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا' اور انہیں قلعوں میں رعایا آباد تھی۔ راجہ نرول سنگھ کی آباد کی ہوئی نرولی تھی' راجہ رودرمل سنگھ کی آباد کی ہوئی ردولی خاص تھی اور راجہ پورن سنگھ کی آباد کی ہوئی پورائے تھی اور اب تک یہ تینوں موضع انہیں کے نام سے مشہور ہیں۔ سید سالار موصوف دہلی سے مع افواج شاہی روانہ ہوئے اور یہاں پہنچ کر قلعہ نرول کا محاصرہ کیا۔ اتفاق سے اسی قلعہ میں راجہ نرول سنگھ کے ساتھ راجہ رودرمل سنگھ اور پورن سنگھ بھی موجود تھے۔ چند روز تک جنگ جاری رہی اور آخر کار راجاؤں کو شکست ہوئی۔ تینوں راجہ مع اپنی سوار اور پیدل فوج کے قتل کر دیئے گئے اور تمام دولت پر سید سالار موصوف کا قبضہ ہو گیا۔ سید سالار نے وہ دیہات جو انہیں عطیہ میں ملا تھا' اس پر اپنا قبضہ رکھا اور خود ردولی میں سکونت اختیار کر لی۔ اپنے مکان کے قریب ایک مسجد بنوائی جو آج بھی موجود ہے۔ ان کے تین بیٹے تھے' سب سے بڑے محمد شاہ دوسرے محمد سلیمان اور تیسرے سید محمد عمر[۷]۔

خاندان مغلیہ: شرقی حکومت کے ختم ہونے کے بعد ردولی کے سلسلہ میں کوئی تاریخی دور حکومت' لودھی' مغلیہ' سوری وغیرہ میں نہیں ملتا۔ اکبر بادشاہ ۱۵۶۲ء میں تخت نشین ہوئے اور اس کے چار سال کے بعد علی قلی خان نے اودھ کو فتح کیا اور راجپوتوں کو مطیع بنایا۔ اس کے بعد بارہ بنکی ضلع کی از سر نو ترتیب دی اور بہت سے محال قائم کئے۔ اس میں سے ایک محال ردولی ہی تھا' جہاں فوج کے لئے ایک قلعہ بنایا گیا جس میں کافی فوج رہتی تھی[۸]۔

شاہان اودھ: نواب سعادت خان ۱۷۲۲ء میں اودھ کے گورنر ہو کر حکومت دہلی کی طرف سے پہلے لکھنؤ آئے وہاں قیام کیا۔ شیوخ لکھنؤ جو سرکشی پر آمادہ تھے ان پر قابو حاصل کیا۔ اور پھر اجودھیا چلے گئے جو اودھ کا دارالسلطنت تھا۔ راستہ میں ردولی اور دریا آباد کی عملداریاں تھیں جہاں کافی بدامنی تھی ان پر قابو حاصل کیا اور اس طرح لکھنؤ سے لے کر

---

۷ واجب العرض تعلقہ نرولی' مورخہ ۱۰ جنوری ۱۸۷۰ء۔
۸ آئین اکبری' جلد دوم' صفحہ ۸۰۔

اجودھیا تک امن قائم کرلیا۔ سعادت خان کے بعد عبدالمنصور صفدر جنگ نے اپنے دور میں سعادت خان کی پالیسی پر عمل کیا۔ شجاع الدولہ جب صفدر جنگ کی جگہ پر گورنر مقرر ہوئے تو سب سے پہلے باغی زمینداروں کو دبایا۔ اس وقت نور بیگ ردولی اور دریا آباد کی مالگزاری وصول کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے مقرر تھے۔ انہوں نے کوئی روپیہ سرکاری خزانہ میں جمع نہیں کرایا تھا' جس کی وجہ سے ان کو سزائے موت ہوئی۔ حیدر بیگ جو نور بیگ کے بھائی تھے ان کو بھی سزا دی گئی مگر بہو بیگم کی سفارش پر خطا معاف ہوگئی اور ردولی اور دریا آباد کا نظام ان کے سپرد کیا گیا۔ آصف الدولہ کے بعد ضلع میں کفایت شعاری کے پیش نظر کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ ردولی اور دریا آباد کو جو اب تک پرگنہ تھے' مالگزاری وصول کرنے کیلئے چکلا بنایا گیا اور نظامت فیض آباد کے تحت کیا گیا۔ ۱۸۳۲ء میں ردولی اور دریا آباد کو امر لال کو ٹھیکہ پر دیا گیا۔ انہوں نے ان دونوں عملداریوں کو خوب برباد کیا۔ ۱۸۳۴ء میں امرت لال فوت ہوگئے ان کے بعد کوئی بھی شخص ردولی اور دریا آباد کی عملداریوں کو لینے کیلئے تیار نہ ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں ردولی اور دریا آباد کو نظامت سلطان پور میں شامل کر دیا گیا جس کے ناظم راجہ مان سنگھ تھے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں ۱۸۴۹ء یا ۱۸۵۰ء میں گردھر سنگھ کمانڈنٹ اودھ رجمنٹ کو ردولی کا علاقہ مالگزاری کی وصولیابی کی غرض سے دیا گیا۔ ان کی سختی اور بے رحمی کی وجہ سے بہت سے کاشتکاروں نے کاشت کرنا بند کر دیا۔ ۵۴-۱۸۵۱ء کے درمیان راجہ بختاور سنگھ چکلے دار ردولی و دریا آباد نے بقایا کی رقم کم کر کے ہر شخص سے مصالحت کر لی جس کی وجہ سے یہ عملداریاں پھر درست ہوگئیں۔ ۷/فروری ۱۸۵۶ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے سلطنت اودھ پر قبضہ کرلیا اور واجد علی شاہ کو تخت سے الگ کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ اس طریقہ سے شاہان اودھ کی حکومت ختم ہوگئی اور انگریزوں کا راج ہوگیا۔ نئے طرز معاشرت کا دور دورہ شروع ہوا اور ردولی بھی اسی رنگ میں رنگ گیا[۹]۔

۲۔ قصبہ ردولی کا جغرافیہ:

قصبہ ردولی ضلع فیض آباد کا سب سے بڑا قصبہ ہے جو شمالی عرض البلد ۴۵-۲۶ اور مشرقی طول البلد ۴۵-۸۱ پر واقع ہے۔ قومی شاہراہ نمبر ۲۸ جو لکھنؤ سے فیض آباد گئی ہے اس سے تین کلومیٹر جنوب کی جانب واقع ہے۔ یہی شاہراہ ایک متصل سڑک کے ذریعہ موضع بھلسر کے سہ راہے سے ملتی ہے' جہاں سے فیض آباد ۳۸ کلومیٹر دور رہ جاتا ہے۔

---

۹ گزیٹیر آف اودھ' صفحہ ۲۵۷۔

حدود اربعہ:

ردولی کے شمال میں موضع ہائے جلال پور' کریم پور اور جسمڈ واقع ہیں۔ جنوب میں موضع براہیم پور' کاشی پور' مرزا پور اور مشرق میں موضع کریم پور' پرسولی اور سرائے حمید' نیز مغرب میں مواضعات' جسمڈ' شاہ پور اور سلیم پور وقوع پذیر ہیں۔ ۲۲ فروری ۱۹۰۸ء میں حسب ذیل مواضعات کے کچھ نمبر ردولی میں شامل کر دیئے گئے ہیں: موضع جسمڈ' کریم پور اور ابراہیم پور[۱۰]۔

رقبہ:

قصبہ کا کل رقبہ ۱۱۶۳ ایکڑ پر مشتمل ہے' جس کی تفصیل یہ ہے[۱۱]۔

۱۔	آبادی: ۳۳۵/۱ ایکڑ	۲۔	مزروعہ: ۱۰۱۱/۱ ایکڑ
۳۔	باغات: ۱۲۱/۱ ایکڑ	۴۔	تالاب: ۳۴/۱ ایکڑ
۵۔	راستہ اور پرتی وغیرہ: ۱۲۰/۱ ایکڑ	۶۔	قبرستان: ۱۰/۱ ایکڑ

زمین اور پیداوار:

زمین زیادہ تر بلند اور ہموار ہے مگر منڈھا تالاب کے کنارے پر جو آراضی ہے وہ نشیب میں ہے اور مسطح نہیں ہے۔ صرف فصل ربیع کی کاشت ہوتی ہے۔ جتنی بھی آراضی زیر کاشت ہے اس میں ہر قسم کا اناج پیدا ہوتا ہے۔ خاص طور سے سبزی کے لئے یہ زمین بہت اچھی ہے۔ ٹماٹر' بنڈا' آلو' اروی' گوبھی وغیرہ بہت پیدا ہوتی ہیں اور بڑی تعداد میں روزانہ ٹرکوں کے ذریعہ لکھنؤ' کانپور' گورکھپور' بنارس وغیرہ بھیجی جاتی ہیں۔ خربوزہ' کھیرا اور ککڑی کی کاشت عام طور سے قصبے کے ملحقہ مواضعات میں ہوتی ہے جس کا خاصہ حصہ باہر جاتا ہے۔ تربوز دریاؤں کے آس پاس زیادہ ہوتا ہے۔ وزیر گنج میں گنے کی کاشت خاصی اچھی ہوتی ہے اور وزیر گنج کا گنا بہت مشہور ہے۔ ردولی کے آس پاس کی ملحقہ اراضی پر کافی آم کے باغات ہیں' جن میں قلمی اور تخمی یعنی چھوٹے رس دار چوسنے والے آم بہت ہوتے ہیں۔ ردولی کے آم بہت مشہور ہیں اور خاصی تعداد میں ردولی سے باہر بھیجے جاتے ہیں۔ خاص طور سے یہاں کے قلمی آم بہت شہرت رکھتے ہیں۔

۱۰۔ گزیٹیر آف انڈیا (جلد ۲۱)' صفحات ۳۳۸ تا ۳۳۹۔
۱۱۔ گزیٹیر آف دی پراونس آف اودھ (جلد ۳)' صفحہ ۲۷۳۔

ردولی کے تالاب:

آبادی کے مغربی حصے میں ایک بہت بڑا تالاب ہے جو ''منڈہا'' کے نام سے مشہور ہے جس کا سلسلہ موضع روضہ گاؤں کے ایک بہت بڑے میدان سے شروع ہوتا ہے۔ اسی میدان سے قومی شاہراہ نمبر ۲۸ گزرتی ہے جس پر ایک بڑا سا پل بنا ہوا ہے۔ اس پل کا نام ''چھ موری'' ہے اور یہیں سے یہ تالاب ایک بڑی سی نالی کی صورت میں شروع ہوتا ہے اور ردولی پہنچنے سے کچھ قبل اس کا پھیلاؤ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور قصبہ کے اندر ایک بہت بڑا رقبہ پانی کے تحت آتا ہے۔ ''منڈہا'' تال کا سلسلہ اعظم گڑھ تک ہے اور اس کو وہاں دریائے ''ٹونس'' کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس کا فاصلہ کافی ہے اس لئے پانی کا پھیلاؤ بہت ہو جاتا ہے اس وجہ سے حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ درمیان میں کئی جگہ سے کاٹ کر اس کا پانی دریائے گھاگھر میں گرا دیا جائے جو ردولی سے شمال کی جانب تقریباً پانچ چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے تاکہ فصل کو نقصان سے بچایا جا سکے۔ اس لئے کہ جب طغیانی کی کیفیت ہوتی ہے تو خریف کی فصل کو بہت نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے تالاب ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حوض تال: یہ بہت بڑا تالاب ہے جو جھیل کی شکل میں آبادی کے جنوبی اور مشرقی کونے پر واقع ہے۔

۲۔ میرا تال: یہ تالاب کاشی پور اور میرا پور کے قریب ہے۔

۳۔ جہری تارا: محلہ شیخانہ اور محلہ قصیانہ کے درمیان ہے۔

۴۔ ڈوبنوا: پرانے کوٹ اور مخدوم زادہ کے درمیان ہے اور اب اس کا کافی حصہ پٹتا جا رہا ہے۔

۵۔ بنگہا: یہ تالاب محلہ خواجہ حال میں چودھری اویس کے مکان کے شمال کی طرف ہے۔

ان تالابوں کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے بہت سے تالاب ہیں جیسے کولہنیاں، چھپکیہ اور محلہ صوفیانہ میں بھی لڑکیوں کے اسکول کے پاس سڑک کے دونوں جانب تالاب ہیں۔ ان سب تالابوں میں سنگھاڑہ لگایا جاتا تھا جو خاصی تعداد میں پیدا ہوتا تھا، اور مثل سبزی کے بڑی مقدار میں باہر بھیجا جاتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اب اکثر تالاب ''جل کھمبی'' کا شکار ہو گئے ہیں۔ ''جل کھمبی'' ایک قسم کا خودرو آبی پودہ ہے جس کی شاخیں ایک عفریت کے مانند پانی کی سطح پر پھیلتی چلی جاتی ہیں اور سطح آب کو مکمل طور پر ڈھانپ لیتی ہیں۔ اس عفریت نے سنگھاڑے کی فصل کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ورنہ چودھری صاحب کے زمانے میں سنگھاڑے بہت تعداد میں ہوا کرتے تھے۔ مچھلی بھی ان تالابوں میں ملتی ہیں۔ بعض تالابوں میں جن

۱۔ قصبہ ردولی کے محلے شیخانہ اور قضیانہ کے درمیان واقع تالاب جہری تارا کا ایک دلکش منظر۔

میں پانی کا معقول انتظام ہے' لاکھوں کی تعداد میں مچھلی کے بچے کلکتہ سے منگوا کر ڈال دیے گئے ہیں اور لوگ مچھلی کی تجارت کرتے ہیں۔

آبپاشی:

ردولی کے مختلف تالابوں سے کھیتی کی کافی آبپاشی ہو جاتی ہے اور جب تالابوں میں پانی خشک ہو جاتا ہے تو کاشت کار اپنے کھیتوں کے ایک کونے میں کنواں کھود لیتے ہیں۔ چونکہ پانی کی سطح زیادہ گہری نہیں ہے اس لئے وہ چرخی یا ڈھیکل سے پانی نکال کر اپنے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں اور جب پانی کی ضرورت نہیں رہتی تو وہ یہ کنویں پاٹ دیتے ہیں۔ اور دوسری فصل کے لئے نئے سرے سے کھیت بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کچے کنویں وہی کاشتکار بناتے ہیں جن کے پاس ایک ایکڑ کے اندر زمین یا آراضی ہوتی ہے اور جو لوگ زیادہ آراضی کے مالک ہوتے ہیں وہ پختہ کنواں بنواتے ہیں اور اس میں رہٹ لگاتے ہیں۔ ردولی کے شمالی اور شمال مشرقی حصے میں ''شاردا'' نام کی ایک نہر ہے' جس کی وجہ سے آبپاشی کی بڑی سہولت ہوگئی ہے۔ نہر کے آس پاس سبزی بوئی جاتی ہے' نیز خریف اور ربیع دونوں فصلوں میں اسی نہر کا پانی استعمال کیا جاتا ہے۔

موسم:

ردولی کا موسم لکھنؤ' بارہ بنکی اور فیض آباد جیسا ہے۔ بارش بھی یہاں پر خوب ہوتی ہے۔ مارچ اور اپریل کے مہینے یہاں بہت اچھے ہوتے ہیں۔ مئی اور جون میں شدید گرمی پڑتی ہے مگر ردولی کی راتیں بڑی خوشگوار ہوتی ہیں۔ بارش کے موسم میں جب تک بارش ہوتی رہتی ہے اور ہوا چلتی رہتی ہے تو موسم بڑا ہی سہانا ہوتا ہے اور جب ہوا رک جاتی ہے اور بارش نہیں ہوتی ہے تو بڑی امس ہو جاتی ہے۔ سردی بھی بہت شدید پڑتی ہے اور خاص کر دسمبر اور جنوری کے مہینے میں صبح کے وقت لوگ آگ کے پاس بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ رات کے اوقات میں زیادہ تر لوگ چولہے کے پاس بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اونچے طبقے کے لوگ عموماً انگیٹھی کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں۔ غریب لوگ چولہے کے پاس بیٹھ کر صبح کا ناشتہ بھی کرتے ہیں۔ دن میں جب سورج نکل آتا ہے تو عام طور پر لوگ دھوپ میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔

آبادی:

قصبہ ردولی کی آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۸۷۹۶/ افراد پر مشتمل ہے۔ آبادی کا رقبہ

۳۳۵/۱ ایکڑ ہے اس حساب سے پرتہ آبادی فی ایکڑ ۵۶ نفر ہے جس میں ۵۵ فیصد مسلمان اور ۴۵ فیصد ہندو ہیں[۱۲]۔ ردولی میں کل ۳۶ محلے ہیں جن کی تفصیل نیچے درج ہے۔ ان محلوں میں بھی کچھ ایسے حصے ہیں جن کے نام ان کے مکینوں کی قوم یا پیشے کی مناسبت سے مشہور ہیں۔ ان محلوں میں وہ مواضعات بھی شامل ہیں جو دراصل الگ نمبروں کے حامل گاؤں ہیں مگر ان کی آبادی اسی نام سے ردولی میں شامل ہو کر ایک محلہ بن گیا۔

ردولی کے محلے:

صوفیانہ: یہاں صوفی بزرگ سید محمد صالح کا مزار ہے اور لفظ صوفی کی مناسبت سے صوفیانہ مشہور ہو گیا۔

کٹرہ: کٹرہ کے معنی ہیں منڈی، چوک، چھوٹا بازار وغیرہ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شروع میں یہاں بازار رہا ہوگا اور اسی وجہ سے یہ نام مشہور ہو گیا۔

ٹیڑھی بازار: ۱۹۶۵ء تک یہاں پر جمعہ اور اتوار کو بازار لگتا تھا۔ بازار کی جائے وقوع بہت ہی ٹیڑھی میڑھی تھی۔ شاید اسی وجہ سے یہ نام پڑ گیا۔

گھوسیانہ: یہاں پر گھوسیوں کے مکان ہیں اور اسی مناسبت سے یہ نام مشہور ہوا ہے۔

مخدوم زادہ: یہاں شیخ مخدوم عبدالحقؒ کا مزار ہے۔ اردگرد ان کی اولادیں سکونت پذیر ہیں اور اس وجہ سے یہ نام مشہور ہوا۔

پورہ میاں: اس کی کوئی وجہ ابھی تک نہیں معلوم ہو سکی۔ شاید کسی ''میاں'' (صاحب حیثیت شخصیت) کی مناسبت سے موسوم ہوا۔

۱۲؎ گزیٹیر آف اودھ (جلد ۳)، صفحات ۲۷۴ تا ۲۷۵۔

پرانا کوٹ : کوٹ کے معنی قلع کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ راجہ رودرمل کا یہاں قلعہ تھا جس میں فوج رہتی تھی۔ یہ جنگ میں مسمار ہوگیا تھا۔ پھر اکبر بادشاہ کے عہد میں ایک قلعہ تعمیر ہوا تھا اور اس جگہ کا نام پرانا کوٹ ہوگیا۔

کاشی پور : نرائن داس شاہ التتمش کے زمانے میں دہلی سے یہاں آ کر آباد ہوئے اور اپنے بیٹے کاشی داس کے نام سے یہ محلہ آباد کیا۔

میراں پور : اس کے بارے میں ابھی تک نہیں معلوم ہوسکا کہ کس وجہ سے یہ نام پڑا' اور میراں کون سے افراد تھے۔

خواجہ حال : خواجہ محمد افتخار بارونی تعلقداران برئی کے مورث اعلیٰ تھے۔ جس مقام پر ان کا مکان تھا' وہ جگہ ان کی ہی مناسبت سے مشہور ہوگئی۔

کوٹھی (پرانا بازار) : آج کل اسے عام طور سے کوٹھی کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے' ہندوؤں کی بنائی ہوئی کوٹھیوں کی نسبت سے۔ ردولی میں سب سے پہلے یہیں بازار قائم ہوا تھا' اور جب دوسرے بازار بن گئے تو اس کا نام پرانا بازار ہوگیا۔

کائستھانہ : کائستھ حضرات کی آبادی کافی ہے اور ان کی اکثریت کے پیش نظر یہ نام وجود میں آیا۔

قضیانہ : اس کی وجہ بھی نہ معلوم ہوسکی شاید یہاں قاضیوں کی آبادی زیادہ تھی اس کی وجہ سے یہ نام پڑا۔ آج بھی یہاں قادری حضرات کے علاوہ شیخ صفی الدینؒ کی نسل سے تعلق رکھنے والے چند قاضی گھرانے آباد ہیں۔

عباسی : شاہ التتمش کے عہد میں فوج میں کچھ لوگ بغداد کے رہنے والے تھے اور عباسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں ان لوگوں نے اپنے مکانات بنائے ان کی مناسبت سے اس جگہ کا نام عباسی پڑا۔

ملک زادہ : ملک ایک خطاب ہے جو اکثر مسلمانوں میں رائج ہے۔ اس جگہ پر زیادہ تر ملک لوگ آباد ہیں ''ملک شمون'' ایک بزرگ سب سے پہلے یہاں آباد ہوئے۔ ان کا خطاب ملک تھا' لہٰذا اسی لقب کی مناسبت سے اس محلہ کا نام پڑا۔

پورہ ملک : اس جگہ کو ملک لوگوں نے آباد کیا' اس لئے پورہ ملک نام رکھا گیا۔

پورہ بیلداران : پہلے اس جگہ پر صرف بیلدار آباد تھے' اس لئے یہ نام پڑ گیا۔

سنجری : جو لوگ شاہ التتمش کی فوج میں سنجری کے رہنے والے تھے' جہاں وہ آباد ہوئے اس کا نام سنجری پڑ گیا۔

نیا گنج : اس کا پہلا نام سلطان گنج تھا جو شاہ نصیر الدین سرفراز احمد نے اپنے زمانے میں آباد کیا تھا۔ بعد ازاں نئی آبادی کے طور پر یہ نام پڑ گیا۔

سالار محلہ : سید حسن رضا' سید سالار مسعود غازیؒ کے ساتھ ۱۰۳۰ء میں ردولی آئے اور بھروں کو شکست دے کر جس جگہ اپنا مکان بنایا اس جگہ کا نام سید سالار کی مناسبت سے سالار محلہ پڑ گیا۔

اکبر گنج : اکبر علی جو حیدر بیگ عامل ردولوی کے صاحب زادے تھے' انہوں نے آصف الدولہ کے زمانے میں اس کو اپنے نام سے آباد کیا تھا۔

شیخانہ : شیخ ابوالفتاح جو شیخ سلیمان کی نسل سے تھے ان کا مکان جس جگہ پر تھا اس کا نام شیخانہ رکھا گیا۔

نریا پار : چونکہ یہ محلہ قصبہ ردولی کے مغرب کی جانب ''منڈھا'' تالاب کے کنارے پر واقع ہے اور قصبہ کی آخری آبادی ہے' درمیان میں تالاب ہونے کی وجہ سے نریا پار ہو گیا ہے۔

عیدگاہ : قصبہ کی عیدگاہ جہاں پر واقع ہے اس کے متصل جو آبادی ہے وہ عیدگاہ کہی جاتی ہے۔

پورہ قاضی : قاضی محمود نے چودھری عبدالمجید تعلقدار امیر پور سے اجازت لے کر اس محلہ کو آباد کیا تھا۔

علاوہ ازیں ردولی کے چند محلے ایسے بھی ہیں جن کے نام کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہو سکی ہے' مثلاً پورہ جامی' پورہ غلام مخدوم' پورہ بہادر بیگ' پورہ شاہ حسین' پورہ رسول بخش' پورہ حسین خاں' پورہ غلام محمد' پورہ خان (عرف عام میں خاں کا پورہ)'

وزیر گنج، رسول آباد، پورہ بساون، وغیرہ۔

آبادی کی تشریح:

قصبہ ردولی میں صرف مسلمان اور ہندو آباد ہیں۔ مسلمانوں میں دو فرقے ہیں: (۱) سنی اور (۲) شیعہ۔ سنی فرقے کے لوگ تعداد میں زیادہ ہیں اور شیعہ فرقے کے لوگ کم ہیں۔ ہندوؤں میں دو مکتب خیال کے لوگ ہیں: (۱) سناتن دھرم اور (۲) آریا سماجسٹ۔ سناتن دھرم کے ماننے والے زیادہ تعداد میں ہیں اور آریا سماجسٹ کی تعداد کم ہے۔ ہندوؤں میں آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ بودھ قوم کے لوگ ہیں۔ قصبہ ردولی کی مسلم آبادی میں جتنے اشراف ہیں، ان کے مورث اعلیٰ یا بزرگ، سلاطین وقت کے ہمراہ جنگ کے سلسلے میں آئے اور فتح یابی کے بعد اسی قصبہ میں سکونت اختیار کر لی، صوفیائے کرائم جو تبلیغ دین کی غرض سے آئے یہیں مقیم ہو گئے۔ انہیں دونوں سلسلوں سے ردولی میں مسلمانوں کی آمد کی ابتدا ہوئی۔

''مسلمان دو نسلی گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ نمبر ایک وہ لوگ جو ابتدا میں آنے والے مہاجرین، سید، شیخ، مغل یا پٹھان کی اصلی یا مصنوعی اولادیں ہیں۔ نمبر ۲ وہ لوگ جو دیسی لوگوں کی اولادیں ہیں اور جن کے آباؤ اجداد مشرف بہ اسلام ہوئے وہ اپنے پیشوں کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ وہ تین نمایاں گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں: نمبر ا۔ ہندو سماج کے اونچی ذات کے لوگ جو مشرف بہ اسلام ہوئے جیسے راجپوت۔ نمبر ۲۔ وہ پیشہ ور لوگ جن کا پیشہ صاف ستھرے کاموں سے تعلق رکھتا ہے۔ نمبر ۳۔ نجس کام کرنے والی ذاتیں: مثلاً بھنگی، چمار، خاکروب'' [۱۳]۔

۳۔ ردولی کی سماجی و تہذیبی زندگی کی جھلکیاں:

قصبہ ردولی میں بزرگوں کے بہت سے مزارات اور خانقاہیں ہیں۔ یہاں کے کچھ مزار تو بڑی اچھی حالت میں ہیں، اس لئے کہ ان کی مرمت اور دیکھ بھال کی طرف لوگوں کی خاصی توجہ ہے۔ مگر خانقاہیں البتہ بے توجہی کا شکار ہیں اور زیادہ تر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ یہاں کے اکثر شرفاء کا تعلق زمیندار طبقہ سے تھا۔ یہ طبقہ کام کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ اللہ کا دیا ہوا ان کے پاس سب کچھ تھا مگر اعتدال کی طرف کبھی توجہ نہیں کی گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمینداری ختم ہونے سے

---

۱۳ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، صفحہ ۹۲۔

پہلے ہی بہت سے زمینداروں کی جائیدادیں مہاجنوں کے قبضے میں چلی گئیں اور یہ طبقہ تنگ دستی کی زندگی گزارنے لگا۔ انیسویں صدی کی آخری اور بیسویں صدی کی ابتدائی تین چار دہائیوں کے جو قصبے یہاں کے رؤسا کے طرز معاشرت کے مشہور ہیں' ان میں سے کچھ کے بارے میں لکھنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ اس سے ان کے طور طریقہ اور آن بان اور شان و شوکت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان اعلیٰ رؤسا کی روزمرہ زندگی کی نقل چھوٹے زمیندار بھی کرتے تھے' جس کا نتیجہ کچھ دنوں میں ظاہر ہو جاتا تھا۔ آمدنی کم اخراجات زیادہ اس لئے جائیدادیں رہن رکھ دی جاتی تھیں اور ادائیگی ہو نہیں پاتی تھی۔ اور اس طرح تمام جائیداد ختم ہو جاتی تھی۔ مگر جائیداد ختم ہو جانے کے بعد ظاہری شان و شوکت میں کمی آ جانے کی وجہ سے لوگ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے تھے۔

رؤسا مساوات کے بالکل قائل نہیں تھے۔ مجال نہیں تھی کہ کوئی ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والا شخص کسی رئیس کے برابر بیٹھ جائے یا اس کے سامنے سگریٹ وغیرہ پی لے۔ ویسے یہ اصول صرف چھوٹے طبقے کے لئے ہی نہیں تھے بلکہ خود رؤسا کے طبقے میں بھی آداب ملاقات' تعظیم و تکریم کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ چھوٹے کو بزرگ کا احترام کرنا' ان کو سلام کرنا' ان کی تعظیم کرنا فرض خیال کیا جاتا تھا۔ جب رؤسا کسی محفل میں جاتے تو صاحب خانہ اس کے معیار عظمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے آداب عرض سے تسلیم بجالاتا ہوں کے بعد مزاج پرسی کرتا تھا اور پھر مناسب جگہ پر اسے بٹھاتا تھا۔ اگر ان رسمی باتوں میں ذرا سی بھی کوتاہی ہو جاتی تھی تو رئیس اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا۔ ایک واقعہ چودھری محمد علی ردولوی کے ساتھ پیش آیا۔ اس بات کو انہوں نے اکثر لوگوں کو بتایا ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ چودھری صاحب کے مطب میں محلہ کا ایک بقال اکثر دوا لینے آیا کرتا تھا اور زمین پر بیٹھ کر اپنا حال بیان کرتا تھا۔ جب زمینداری کے خاتمہ کا اعلان ہوا تو اس کے دوسرے دن صبح کے وقت وہ بقال دوا لینے کے لئے پھر آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ چودھری محمد علی صاحب نے یہ دیکھتے ہی اپنی کرسی چھوڑ دی اور زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر اس سے کہا کہ کل تک یہ کرسی یعنی یہ جگہ میری تھی آج سے تمہاری ہوگئی۔ بقال نے لاکھ معذرت کی کرسی سے اٹھنا چاہا مگر چودھری صاحب نے اس کو کرسی سے اٹھنے نہ دیا اور زمین پر بیٹھے بیٹھے اسے دیکھا' دوا دی اور گیٹ تک اس کو رخصت کرنے گئے۔

نصف صدی پہلے کی ردولی آج کی ردولی سے بہت مختلف تھی۔ چودھریوں کے گھرانے سب کے سب زمینداروں اور تعلقہ داروں پر مشتمل تھے ان کی زمینداریاں اور تعلقہ ردولی کے قریب دیہی علاقوں میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ زمینوں پر کام کرنے والے اہلکار دیہی علاقوں سے رقمیں وصول کر کے لاتے۔ محل نما مکانات کے اندر دولت کی فراوانی عیش و عشرت کے سامان فراہم کرتی۔ قصبہ کی زیادہ تر آبادی کسی نہ کسی حیثیت سے انہیں زمینداروں کے اور تعلقہ داروں کے عام

نظام زندگی کی رہین منت تھی۔ تمام مذہبی رسمیں شادی بیاہ کی تقریبات بڑی دھوم دھام سے منائی جاتیں۔ حد یہ کہ غمی کی تقریبات بھی بڑے اہتمام سے انجام پاتیں۔ معاشی خوش حالی اور زمیندارانہ جاہ وجلال' نفاست اور خوش سلیقگی' خوش مزاجی' وضعداری' آن بان اور عیش وعشرت کے نئے طریقوں کو اپنائے لوگ ملک کی عام فضا سے بے خبر اپنی چھوٹی سی جنت میں بے فکری کی زندگی گزارتے تھے۔ ردولی کے چودھریوں کی زندگی کا انداز ہ چودھری محمد علی کے خاکے سے ہوتا ہے جو کہ ان کی چھوٹی بیٹی ہما بیگم نے ان کی زندگی ہی میں لکھا تھا۔ اس کی تفصیل باب دوم میں بیان کی گئی ہے۔

ردولی کے رؤسا کو ادنیٰ طبقے کے لوگ عام طور پر سلام کچھ اس طرح کرتے تھے۔ بھیا سلام' سرکار سلام' میاں سلام' وغیرہ۔ سلام علیکم کہنا بڑی بے ادبی سمجھی جاتی تھی۔ سلام علیکم کہنے کا رواج اس لئے نہیں تھا کیونکہ اس سے برابری ثابت ہوتی تھی۔ رئیس نے اگر سلام کے جواب میں ہاتھ اٹھا دیا تو بڑی بات ورنہ صرف سر کا اشارہ ہی سلام کے جواب کیلئے کافی ہوتا تھا۔ اس قصبہ کے شرفاء اور رؤسا میں جو ایک بہت خاص بات قابل تعریف تھی اور اب بھی ہے وہ یہ کہ وہ اپنے غریب عزیزوں اور دوستوں سے بڑی محبت اور خلوص سے ملتے ہیں۔ ان کے ادب واحترام میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے دیتے' ان کو حقیر نہیں سمجھتے۔ اور اگر وہ عزیز ان کے گھر میں آ گیا ہے تو اسے صدر مقام پر بٹھاتے ہیں اور بڑے تپاک سے پیش آتے ہیں۔ نچلے طبقہ کے کسی بھی شخص کے یہاں شادی بیاہ یا غمی وغیرہ میں رؤسا شرکت نہیں کرتے تھے مگر اس شخص نے اگر بہت زیادہ خدمت کی ہے تو اس کی دعوت اس شرط پر قبول کی جاتی تھی کہ وہ گھر پر کھانا بھیج دے۔ اگر اس شخص کے کافی اثر ورسوخ رئیس کے یہاں ہیں تو اس کے گھر پر رئیس خاص موقعوں پر جاتا تھا۔ اب یہ شان وشوکت آہستہ آہستہ تبدیل ہونا شروع ہوگئی ہے۔ شرفاء نے اپنے آپ کو عوام کے قریب کرلیا ہے اس سے عوام کے دلوں میں شرفا کے لئے ایک خاص مقام پیدا ہوگیا ہے اور عام لوگ اب شرفا کی عزت اور زیادہ کرنے لگے ہیں۔

ردولی کی تہذیبی اور سماجی زندگی پر لکھنؤ' بارہ بنکی' دریا آباد' ردولی اور فیض آباد کے اثرات:

ردولی کی تہذیب' زبان' اخلاق وآداب اور طرز گفتگو وغیرہ پر فیض آباد اور لکھنؤ کا خاصہ اثر ہے۔ ردولی میں بہت ہی نرم ونازک لکھنؤ کی زبان بولی جاتی ہے جس میں خاصی دلکشی ہے۔ وہ تمام خصوصیات ردولی کی تہذیب میں پائی جاتی ہیں جو کہ لکھنؤ میں ہیں۔ آداب وسلام کے قائدے بیٹھنے اٹھنے کا انداز' استقبال اور مزاج پرسی کرنے کا طریقہ' آداب مجلس کے طور طریقے ان سب باتوں پر عمل ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ قدیم تہذیب تقریباً ختم ہونے کے قریب ہے اور نئی تہذیب نے اپنا تسلط جمالیا ہے۔ پرانی تہذیب اب صرف چند گنے چنے گھرانوں میں ہے۔

پہلے یہاں کے شرفا بغیر شیروانی پہنے گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ سڑک پر کھڑے ہو کر کچھ بھی کھانا بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ پان اگر ڈبیہ سے نکال کر کھانا ہوتا تو منہ میں پان رکھتے وقت رومال لگا لیتے تھے۔ عام طور پر سڑک پر کھڑے ہو کر بات کرنا شان کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ گھر کے بچے صبح اٹھ کر بزرگوں کو سلام کرتے تھے۔ بزرگ پیار سے پیش آتے تھے اور اس طرح بچوں کی تربیت ہوتی تھی۔ اب اس نئے دور میں پرانی تہذیب کے اصولوں اور قاعدوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

زبان:

ردولی پر لکھنؤ کی زبان کا بہت اثر ہے عام طور پر اونچے طبقے میں لکھنؤ سے ملتی جلتی زبان بولی جاتی ہے۔ خاص کر شرفائے گھروں میں اور ہندوؤں کے اعلیٰ گھروں میں کچھ ردوبدل کے ساتھ یہی زبان بولی جاتی تھی۔ مگر اب یہ بات نہیں ہے اس لئے کہ اردو ہندی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ لہذا ہندوؤں کی بول چال میں کافی الفاظ ہندی کے شامل ہو گئے ہیں مگر مسلمان ابھی وہی زبان بولتے ہیں۔ پیشہ ور عوام جو زبان پہلے بولتے تھے وہی اب بھی بولتے ہیں، جو بہت ہی عام فہم ہے اور اسے اودھی زبان (پوربی) کہا جاتا ہے۔ مولانا تقی شبر نے ایک کتاب ''صرف نحو اور رموز زبان ردولی'' تحریر کی ہے جس کا کچھ حصہ حسب ذیل ہے۔

''ردولی اور لکھنؤ کی منجھی ہوئی ٹکسالی زبان کا روزمرہ اور محاورہ لہجہ اور ساخت یکساں ہے۔ دونوں میں اگر فرق ہے تو صرف ''ہیئت افعال'' کا فرق ہے لکھنؤ والے کھڑی بولی ''آتا ہوں'' ''جاتا ہوں'' بولتے ہیں اور ردولی والوں کی زبان اودھی بولی کا تتبع کرتی ہوئی ''آوت ہن'' اور ''جات ہن'' پر عمل پیرا ہے۔ لیکن شائستہ طبقہ زیادہ تر ''آتے ہیں'' اور ''جاتے ہیں'' بولتا ہے۔ ردولی کی زبان میں ''میں'' واحد متکلم کا صیغہ مرد قطعاً نہیں بولتے البتہ عورتیں بڑے ٹھسے سے بولتی ہیں۔ اور وہ ان کو زیب بھی دیتا ہے۔ ردولی کی زبان کے کچھ اپنے روزمرہ اور ضرب المثال بھی ہیں یا جن سے اردو اور ہندی کی ادبی دنیا نا آشنا ہے۔ مثلاً ''وجا مناسب کرنا'' ''وجا مناسب پر پہنچنا'' ''وجا مناسب کا خیال رکھنا''۔ جس کا مفہوم وضعداری نبھانا ہے، موقع کے لحاظ سے مناسب اقدام کرنا، حسن سلوک کرنا، رواداری سے کام لینا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس موقع پر یہ استعمال کیا جاتا ہے، اس کیلئے اردو میں کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے۔ اس روزمرہ کا درست تلفظ ''وجہ مناسب'' غیر اہل زبان کرتے ہیں ''ضرب المثل'' ہے''[۱۴]۔

ردولی کی زبان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے لہجہ میں زور و اثر اور روانی بلا کی پائی جاتی ہے ہر طرح اور ہر

---

[۱۴] صرف و نحو اور رموز زبان ردولی، از تقی شبر، غیر مطبوعہ

انداز کی بات ادبی چاشنی کے ساتھ کہنے کا اسلوب اس زبان میں پایا جاتا ہے اس کے افعال کی ہیئت دراصل اودھی زبان کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ردولی پر دریا آباد' نردلی' بارہ بنکی وغیرہ کے بھی بہت اثرات ہیں' مگر خاص طور پر فیض آباد اور لکھنؤ کے بہت زیادہ اثرات ہیں۔لباس' زبان' رہن سہن' اور مختلف رسومات شادی بیاہ' خوشی' غمی' غرض زندگی گزارنے کے ہر انداز پر ان جگہوں کے اثرات ردولی میں پائے جاتے ہیں۔

۴۔ردولی کے قابل ذکر صوفیائے کرام' مذہبی اور سیاسی شخصیات:۔

ردولی کے صوفیاء کرام:

قصبہ ردولی میں بڑے پائے کے صوفیائے کرام گزرے ہیں' جن میں سے چند کا تذکرہ حسب ذیل ہے۔

شیخ صلاح الدین سہروردیؒ: پیدائش ۷۵۶ھ وفات ۸۲۵ھ' ردولی کے لوگ آپ کو شیخ سیاح کے نام سے پکارتے ہیں۔آپ کا مزار محلہ صوفیانہ کے آبادی کے آخری حصہ میں مغرب کی جانب منڈ ہا تالاب کے کنارے پر ہے۔مگر ابھی تک یہ نہ پتہ چل سکا کہ شیخ سیاح ردولی کب تشریف لائے۔مخدوم صاحب کے حالات کے سلسلے میں جو تحریر ہے وہ یہ کہ'' پانی پت شریف سے واپس آنے کے بعد شیخ سیاح درویش کے روضہ میں جا کر ان کی روح کو فاتحہ کا ثواب بخشا پھر حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیج کر وہاں بیٹھ کر عرض کیا اگر ایک مصلےٰ اور سبو چہ مل جائے تو سکونت اختیار کروں۔قبر سے آواز آئی شیخ احمد! حوض میں جا کر مصلےٰ اور سبو چہ لے لو۔آپ نے ہاتھ ڈالا تو پہلے سبو چہ ملا دوبارہ ہاتھ ڈالنے پر پرانی چارپائی کا جھلنگا ملا چنانچہ دونوں چیزیں لے کر اپنے آبائی مکان میں آئے۔واضح رہے کہ ردولی کے صاحب ولایت شیخ سیاح بابا تھے۔اس لئے اصول درویشی کے مطابق سکونت کی اجازت مانگی''[۱۵]۔اس عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جب مخدوم صاحب یہاں تشریف لائے تو شیخ سیاح کا مزار ردولی میں موجود تھا۔

شیخ احمد عبدالحقؒ: آپ کا نام شیخ احمد عبدالحق تھا اور صاحب توشہ کے نام سے لقب ملا۔عوام میں مخدوم صاحبؒ کے نام سے مشہور ہیں۔آپ کے والد کا نام شیخ عمر اور دادا کا نام شیخ داؤد تھا۔مخدوم صاحب کے دادا نے ردولی میں آ کر قیام کیا۔ان کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔جناب شیخ العالم کی ولادت ۷۷۶ھ میں بمقام ردولی ہوئی۔''شیخ احمد عبدالحق کی

۱۵۔شخصیت وسیرت' شاہ مبین احمد فاروقی منظر' صفحہ ۴۶۔

محفلیں ذکر الٰہی سے آراستہ اور فکر حق سے معمور ہوتی تھیں۔ اگر کوئی شخص اتفاق سے آپ کی مجلس میں دنیا اور اہل دنیا کا ذکر کرتا' آپ کانپنے لگتے۔ یہ دیکھ کر اس تذکرہ کرنے والے کو مجال نہ ہوتی کہ وہ اس بات کو آگے بڑھائے۔ مریدوں کی اصلاح اور تربیت کی طرف خاص طور پر توجہ دیتے تھے موقع اور مصلحت کے مطابق ان کو نصیحت کرتے اور اس دلکش انداز میں اس کو اس کی کمزوری کی طرف متوجہ کرتے کہ اس کی زندگی کا جو گوشہ اصلاح طلب ہوتا درست ہو جاتا اور وہ اس میں کسی قسم کی تلخی بھی محسوس نہ کرتا''[۱۶]۔ ''حضرت شیخ العالم احمد عبدالحق صاحب توشہ کا وصال مابین عصر و مغرب ۱۵ جمادی الثانی ۸۳۷ھ میں ردولی شریف میں ہوا اور آپ اپنی خانقاہ سے متصل دفن ہوئے''[۱۷]

شیخ صفی الدینؒ: آپ کا مزار اسٹیشن روڈ کے مشرق میں پورہ خان کی آبادی کے شمال کی جانب کچھ فاصلہ پر بنا ہوا ہے۔ قبر پر ایک خوبصورت عمارت بنی ہوئی ہے۔ آپ کا انتقال ۱۳ ذی قعدہ ۸۱۹ھ کو ہوا آپ کے مورث اعلیٰ شیخ نصر الدین غزنی سے دہلی آئے کچھ عرصہ بعد سلطان ابراہیم شرقی جونپور سے موضع پھکوئی عطا ہوا' جو ردولی سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس وجہ سے نصر الدین نے ردولی میں آکر سکونت اختیار کی۔ آپ حضرت سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے مرید و خلیفہ تھے۔ جب آپ کے پیر و مرشد ردولی تشریف لائے اور جامع مسجد صوفیانہ میں قیام کیا' آپ ان کی قدم بوسی کیلئے گئے تو پیر مرشد نے فرمایا کہ ملک ہند میں تمام علوم و فنون میں اگر کسی کو کامل دیکھنا ہو تو وہ شیخ صفی ہیں۔ آپ کی ملفوظات کا نام ''انوار الصفی'' ہے[۱۸]۔

شیخ محمد اسماعیل: آپ شیخ صفی کے بڑے بیٹے تھے۔ ۱۲ ربیع الثانی ۸۹۷ھ کو بمقام ردولی ولادت ہوئی' صاحب علم تھے۔ ۱۲ ربیع الثانی ۸۶۰ھ کو انتقال ہوا[۱۸]۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی: آپ شیخ محمد اسماعیل کے تیسرے بیٹے تھے' ۸۶۰ھ میں ردولی میں ولادت ہوئی۔ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ۸۹۷ھ میں جب کھلے بازار سورکا گوشت ردولی میں بکنے لگا تو آپ ترک سکونت کر کے شاد آباد ضلع کرنال چلے گئے اور ۳۷ سال وہاں قیام کیا۔ پھر ۹۳۴ھ میں شاد آباد سے ایک مرید کی خواہش پر گنگوہ' ضلع سہارنپور چلے گئے اور تا حیات وہیں مقیم رہے۔ ۲۳ جمادی الثانی ۹۴۴ھ میں انتقال ہوا اور گنگوہ میں ہی دفن ہوئے[۱۸]

---

۱۶ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات' اعجاز الحق قدوسی' صفحات ۱۲۹ تا ۱۳۳۔
۱۷ شخصیت و سیرت' صفحہ ۱۰۸۔
۱۸ تصوف' شاہ سفیر احمد' غیر مطبوعہ

شیخ سلیمان: آپ کا مزار شیخانہ وصوفیانہ محلّہ کے درمیان جوتالاب ہے اس کے شمال ومغربی کونے پر ایک بلند مقام پر واقع ہے۔نواب تصدق حسین کے مورث آپ ہی کی نسل سے ہیں[۱۸]۔

شیخ سماع الدین: آپ کی قبر محلّہ ٹیڑھی بازار میں ایک نیم کے درخت کے نیچے ہے آپ شیخ صفی الدین کے استاد بھائی تھے۔اور سید اشرف جہانگیر سمنانی سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔جب سید صاحب ردولی آتے تھے تو آپ ہی کے گھر پر قیام کرتے تھے۔حضرت فرید گنج شکرؒ بھی جب ردولی آتے تھے تو آپ ہی کو شرف مہمانی عطا ہوتا تھا۔آپ علوم صوری ومعنوی سے آراستہ تھے۔پیر ومرشد نے خرقہ وخلافت سے سرفراز کیا تھا[۱۸]۔

شیخ محمد صالح صوفی: آپ شاہان کرمان کی اولاد سے تھے۔شیخ محمد صالح صوفی محض شیخ صلاح الدین سہروردی وشیخ داؤد کی محبت میں ردولی تشریف لائے اور سکونت اختیار کی۔اور ردولی میں ہی انتقال ہوا اور آپ کا مزار بھی شیخ صلاح الدین سہروردی کے قریب اور جامع مسجد کے سامنے ہے[۱۸]۔

سید منگرے شاہ: آپ بانسہ سے ترک سکونت کرکے ردولی چلے آئے اور یہیں ۲ محرم ۱۱۶۶ھ کو ۴۵ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور محلّہ صوفیانہ میں دفن ہوئے[۱۸]۔

سیاسی شخصیات:

ضلع چونکہ ردولی ہر امر میں سرفہرست رہا ہے چنانچہ سیاسی دنیا میں بھی اس قصبہ کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ستیہ گرہ اور بھارت چھوڑو تحریک میں ردولی نے حصہ لیا اور یہاں کے لوگوں نے جیلوں کی سختیاں برداشت کیں۔اس تحریک میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

افضال حسین: ان کے والد کا نام محمد حسین تھا اور صوفیانہ محلّہ کے رہنے والے تھے۔انہوں نے ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت میں حصہ لیا اور چھ ماہ قید بامشقت کی سزا کاٹی[۱۹]۔

۱۸؎ تصوف' شاہ سفیر احمد' غیر مطبوعہ

۱۹؎ سوتنتر تا سنگرام کے سینک' حصہ بارہ بنکی' صفحہ ۲۱۔

کرشنا نند کھرے : ان کے والد کا نام کالی چرن تھا۔ یہ محلہ کائستھانہ کے اصل باشندے تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں نمک ستیہ گرہ اندولن میں حصہ لیا تھا' جس کی وجہ سے چھ ماہ قید کی سزا ہوئی تھی[۲۰]۔

اجودھیا پرشاد : ان کے والد کا نام شیو بخش تھا' یہ بھی ردولی کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں نان کوا پریشن میں حصہ لینے کی وجہ سے چھ ماہ کی قید کی سزا پائی[۲۱]۔

خوش حال ہراج : محلہ کاشی پور کے رہنے والے تھے۔ تحریک ستیہ گرہ میں حصہ لینے کی وجہ سے ۱۹۴۰ء میں چھ ماہ کی قید سخت کی سزا پائی[۲۲]۔

دھرم دیو دین دیال : یہ بھی ردولی کے رہنے والے تھے انہوں نے تحریک نان کوا پریشن ۱۹۳۲ء میں پندرہ ماہ کی سزا پائی۔ ۱۹۴۱ء میں ایک سال کی قید سخت اور پچاس روپیہ جرمانہ ہوا۔ ہندوستان چھوڑو تحریک کے سلسلے میں ۱۲ اگست ۱۹۴۲ء سے ۱۴/ اکتوبر ۱۹۴۳ء تک جیل میں نظر بند رہے[۲۳]۔

محمد یوسف : ان کے والد کا نام خدا بخش تھا' ردولی کے رہنے والے تھے۔ تحریک خلافت میں ۱۹۳۴ء میں چھ ماہ قید سخت کی سزا پائی[۲۴]۔

سمندر بخش : ان کے والد کا نام بجنا تھ تھا۔ یہ محلہ شیخانہ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ہندوستان چھوڑو تحریک کے سلسلہ میں ڈی۔ آئی۔ آر قانون کے تحت ۱۷/ اگست ۱۹۴۲ء سے ۲۹/ مارچ ۱۹۴۳ء تک نظر بند رہے[۲۵]۔

اسلام اختر : ان کے والد کا نام نظیر الدین تھا' پورہ خاں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ایک دن کی سزا کاٹی اور تین سو روپے جرمانہ ادا کرنا تھا جو یہ نہ دے سکے اس لئے دو ماہ اور آٹھ یوم کے بعد جیل سے رہا ہوئے[۲۶]۔

ماسٹر لطیف الرحمٰن : ان کے والد کا نام حبیب الرحمٰن تھا اور ردولی کے مقدومیہ ہندوستانی (موجودہ نیشنل) ہائی اسکول کے

---

۲۰ سوتنتر تا سنگرام کے سینک' حصہ بارہ بنکی' صفحات ۹ تا ۱۰۔
۲۱ ایضاً' صفحہ ۳۔ ۲۲ ایضاً صفحہ ۱۰۔ ۲۳ ایضاً صفحہ ۲۱۔ ۲۴ ایضاً صفحہ ۴۲۔ ۲۵ ایضاً صفحہ ۶۲۔ ۲۶ ایضاً صفحہ ۶۲۔

ہیڈ ماسٹر تھے۔ ستیہ گرہ تحریک میں ۱۱ر مئی سے ۲۴ر اگست ۱۹۴۱ء تک جیل کی سزا کاٹی۔ ہندوستان چھوڑو تحریک میں ۱۱ر اگست سے ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۲ء تک جیل کی سزا کاٹی اور ہندوستان چھوڑو تحریک میں ۲۴ر اگست ۱۹۴۲ء تک جیل کی سزا کاٹی۔ ضلع کانگریس کمیٹی کے ممبر رہے ۱۹۴۲ء سے تحریک آزادی میں حصہ لیتے رہے[۲۷]۔

اویس قرنی: آپ کے والد کا نام حسن احمد تھا۔ یہ سالار محلہ کے رہنے والے تھے۔ ۲۹ر اگست ۱۹۴۱ء کو مخدوم صاحب کے میلہ میں باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں نو ماہ قید سخت کی سزا ہوئی۔ بھارت چھوڑو تحریک میں ڈی۔ آئی۔ آر قانون کے تحت چودہ ماہ نظر بند رہے۔ بموجب سرٹیفکیٹ جیل ۱۱ر مئی ۱۹۴۲ء جیل کی سزا کاٹی[۲۸]۔

قاضی حبیب الحق: آپ کے والد کا نام قاضی بشیر الحق تھا اور محلہ قضیانہ کے رہنے والے تھے۔ تحریک ستیہ گرہ ۱۹۴۱ء میں ایک سال کی قید سخت اور پانچ سو روپیہ جرمانہ ہوا۔ تحریک بھارت چھوڑو ۱۹۴۲ء میں ۱۱ر اگست ۱۹۴۲ء سے ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۳ء تک نظر بند رہے[۲۹]۔

قصبہ ردولی کے لیڈران:

وہ لیڈران جنہوں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی: (الف) کانگریس کے لیڈران: (۱) وسیم انصاری۔ (۲) پنڈت بنواری لال۔ (۳) پنڈت چندر کمار تردیدی۔ (ب) یوتھ کانگریسی لیڈر: احترام علی تمو۔ (ج) سوشلسٹ لیڈر: قاضی حبیب الحق۔ (د) جن سنگھ لیڈر: لالہ مکٹ بہاری لال اگروال۔

۵۔ ردولی کا علمی و ادبی ماحول:

قصبہ ردولی میں شروع کے زمانے میں تعلیم کی سہولتیں بہت کم تھیں۔ صرف تین پرائمری اسکول، ایک مڈل اسکول اور ایک نسواں اسکول تھا، جس میں لڑکیوں کو صرف مڈل کلاس تک تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ سب اسکول ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے تھے۔ اس کے علاوہ ایک مخدومیہ اینگلو ورنا کیولر اسکول آٹھویں جماعت تک تھا۔ ایک اسکول رام باڑی کے نام سے تھا۔ ایک اور اسکول تھا جس میں سنسکرت پڑھائی جاتی تھی۔ مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کیلئے بھی مدرسے تھے۔ شاہان اودھ کے

۲۷۔ سوتنتر تا سنگرام کے سینک، حصہ بارہ بنکی، صفحہ ۵۳۔
۲۸۔ ایضاً، صفحہ ۵۶۔ ۲۹۔ ایضاً، صفحہ ۵۶۔

زمانے میں جن شہروں اور قصبوں میں تعلیم تھی ان میں ردولی کا نام بھی آتا ہے۔ ''اودھ کے بہت سے قصبات اور شہر مشرقی علوم کے مرکز ہونے کی حیثیت سے بہت مشہور تھے''[۳۰]۔ ''قصبات میں علم و دانش کے جو مراکز تھے ان میں دینی علوم یعنی تفسیر حدیث وفقہ وغیرہ کی تعلیم سنی نقطہ نظر سے دی جاتی تھی''[۳۱]۔

سفرنامہ مظہری کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۱ء میں ایک مدرسہ موسومہ رفاہ المسلمین قائم کیا گیا تھا جس کیلئے تحریر ہے کہ: ''جنوری ۱۹۱۱ء کو ردولی پہنچا وطن میں شیعہ سنی کی جنگ نے طوفان بے تمیزی بپا کر رکھی تھی۔ ''انجمن رفاہ المسلمین'' ردولی میں قائم ہوئی ہے۔ ابھی تازہ جوش ہے لیکن ڈر ہے کہ کہیں اس انجمن کو روز بد نہ دیکھنا پڑا تو ارباب برادری ہی کے ہاتھوں اس کا جنازہ نکلے گا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ادبا کی وباہر جگہ پہلے معزز طبقہ پر اثر ڈالتی ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس طبقہ سے زیادہ پس ماندہ کوئی نہیں رہ جاتا۔ بارالٰہی! ان کو اصلی شرافت اور اصلاح کی سمجھ روزی کر''[۳۲]۔

مارچ ۱۹۱۷ء کے درمیان محمد حلیم انصاری جب وطن پہنچے تو اس مدرسہ کیلئے لکھتے ہیں۔ ''نکبت نگر ہوتا ہوا اپنے وطن قصبہ ردولی میں پہنچ گیا۔ ''انجمن رفاہ المسلمین'' کے مدرسہ کا معائنہ کیا دو سال کے بعد آج اس مدرسہ کو دیکھ کر دل خون ہوگیا۔ مدرسہ کی حالت سخت ابتر ہے۔ محض گورنمنٹ کی امداد پر چل رہا ہے۔ افسوس کہ برادران وطن باوجود عالی نسبی و علو ہمت ایک ابتدائی مدرسہ کو بخوبی چلا سکنے سے بھی قاصر ہیں''[۳۳]۔ اب اس مدرسہ کا وجود قصبہ میں نہیں ہے ۱۹۴۵ء کے بعد ردولی میں دو ہائی اسکول اور ایک انٹر کالج اور ایک مڈل اسکول اور بچوں کی نرسریاں قائم ہوگئیں، جن کی وجہ سے تعلیم کا کافی چرچہ ہوگیا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کیلئے زیادہ اچھا انتظام نہیں ہے، مڈل پاس کرنے کے بعد ان کے لئے بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ چونکہ لڑکیوں کا اسکول صرف مڈل تک ہے آگے تعلیم حاصل کرنے کیلئے لڑکیوں کو دوسری جگہ جانا پڑتا ہے مثلاً لکھنؤ، بارہ بنکی، فیض آباد وغیرہ۔

ردولی کے تعلیمی اداروں کے نام یہ ہیں۔ (۱) رام باڑی اسکول (۲) مڈل اسکول (۳) نیشنل ہائی اسکول (۴) نسواں اسکول (۵) پرائمری اسکول محلہ کڑہ (۶) ہندو انٹر کالج (۷) پرائمری اسکول نیا گنج (۸) پرائمری اسکول پورہ خان (۹) پرائمری اسکول صوفیانہ (۱۰) مدرسہ تبلیغ القرآن، خواجہ حال (۱۱) مہارانی لکشمی بائی بالیکا ودیالیہ (۱۲) سردجنی نائیڈ گرلز اسکول (۱۳) نند کشور بال ودیالیہ مندر (۱۴) مدرسہ احیاء اسلام (۱۵) دارالعلوم مخدومیہ محلہ صوفیانہ (۱۶) کملا شکشا نکیتن (۱۷) اندرا موک بدھر ودیالیہ (۱۸) مکتب صوفیانہ۔

۳۰۔ لکھنؤ کی میراثی تہذیب، صفحہ ۱۰۶۔ ۳۱۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۵۔
۳۲۔ سفرنامہ مظہری، صفحہ ۲۸۔ ۳۳۔ ایضاً، صفحات ۶۳ تا ۶۴۔

ان اسکولوں کے علاوہ کئی نرسری اسکول قائم ہیں جو کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ردولی میں دو مدرسہ تھے جن میں عربی و فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی اور ڈسٹرکٹ گزیٹیر بارہ بنکی کے صفحہ ۳۵ پر تحریر ہے کہ مولوی ماجد جو ردولی کے رہنے والے تھے فارسی کے تین بڑے اہم علماء میں سے تھے۔اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ردولی کا دامن ادب وعلم سے ہمیشہ بھرا رہا اور کوئی بھی زمانہ ایسا نہیں رہا جب ردولی کی فضا پر ادبی جمود طاری ہوا ہو۔علم وادب کا ذوق وشوق لوگوں میں ہر دور میں موجود رہا۔اس وقت بھی ادبی ذوق لوگوں میں کافی ہے صرف تعلیم کا انداز بدل گیا ہے۔

چند مشہور ادیب:

قصبہ ردولی سے تعلق رکھنے والے چند مشہور ادیبوں' نقادوں اور افسانہ نگاروں کا ذکر حسب ذیل ہے۔

مولوی محمد حلیم انصاری: ۱۸۷۷ء میں ردولی کے ایک بہت ہی معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ادب کا بچپن سے شوق تھا اس لئے بہت جلد اس پر دسترس حاصل کر لی۔ان کا شمار برصغیر کے ممتاز عربی کے اسکالروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے علمی مضامین کثرت سے لکھے ہیں جن میں سے بیشتر عربی اخباروں اور مولانا آزاد کے ''الہلال'' اور پھر ''البلاغ'' میں شائع ہوئے ایک کتاب ''سفرنامہ مظہری'' کے نام سے آپ نے لکھی اور آپ نے عربی زبان کے ترجمے بڑی خوبی کے ساتھ کئے ہیں جن میں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت علامہ جلال الدین انصاری کی تصنیف ''الاتقان فی علوم القرآن'' کے ترجمہ کو ملی جو علم تفسیر کی تاریخ اور اصول دونوں کا خزانہ ہے۔۱۹۳۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

چودھری محمد علی ردولوی: آپ نے ادبی دنیا میں جو شہرت حاصل کی ہے اس کی وجہ سے ردولی کو آپ پر ہمیشہ فخر رہے گا۔کیونکہ آپ کی تصانیف آپ کے نام کو ادبی دنیا میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔مثلاً (۱) اتالیق بی بی' (۲) یادگار مولوی کرامت حسین' (۳) گناہ کا خوف' (۴) صلاح کار' (۵) کشکول محمد علی شاہ فقیر' (۶) پردے کی بات' (۷) میرا مذہب' (۸) نقادی کے نقطے' (۹) گویا دبستان کھل گیا' (۱۰) سیرۃ الاقطاب' (۱۱) خطبی' (۱۲) کشکول وغیرہ۔چودھری محمد علی ردولوی کی تصانیف پر ناقدین ادب نے جو تبصرہ کئے ہیں ان کو پڑھنے کے بعد چودھری صاحب کی زندگی اور ان کے مزاج پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

چودھری صاحب اپنی چھوٹی بیٹی ہما بیگم کو ۱۸/ جولائی ۱۹۵۲ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ: ''ہماری کتابوں پر ''نگار'' نے جو کچھ لکھا ہے وہ مجھ کو بہت پسند آیا تمہارے لئے نقل کر کے بھیجتا ہوں۔۔۔۔ ''میرا مذہب'' اس کتاب میں چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی نے اپنے مذہب نہیں بلکہ اپنے مشرب کو پیش کیا ہے۔اور مشرب وہی ہے جس کا بیدل نے اس طرح

ذکر کیا ہے۔

مشرب پروانہ از آتش نداند طور را

چودھری صاحب مذہباً اثنا عشری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ دنیا کے ہر تعلق کو انسانی و اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں' اس لئے ان کا مذہب بھی دراصل انسانیت پر مبنی ہے جس کا دوسرا نام میری اصلاح میں لا مذہب ہے۔ چودھری صاحب کا انداز تحریر سب سے انوکھا ہے وہ لکھتے نہیں بات کرتے ہیں۔ اور جس نے انہیں بات کرتے ہوئے سنا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ منہ سے پھول جھڑنا کسے کہتے ہیں۔ چودھری صاحب نے کتاب میں تبرا' تاسی' عزاداری' متعہ' سبھی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور اتنے حقیقت افروز انداز میں کہ سنی اسے پڑھ کر شیعہ ہو سکتا ہے اور شیعہ سنی۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد میں دیر تک سوچا کیا کہ اگر ہر شیعہ محمد علی ہو جائے اور ہر سنی نیاز فتح پوری تو کیا ہو؟ شاید کہ دنیا بے دین اور رہنے کے قابل۔۔۔۔۔

''کشکول'' یہ کتاب بھی چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی کی ۳۵ متخضرات کا مجموعہ ہے جس میں سے اکثر ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کا نام فاضل مصنف نے اپنے موجودہ رجحانات تصوف کی بنا پر کشکول رکھا ہے اور خوب ہے۔ لیکن غالباً ملفوظات محمد علی شاہ زیادہ موزوں نام ہوتا' کیونکہ وہ لکھتے نہیں بلکہ بات کرتے ہیں اور ان کی ہر بات پر غالب کا یہ شعر سامنے آ جاتا ہے۔

''بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
اشارت کیا' کنایت کیا' ادا کیا

چودھری صاحب بڑے وسیع المطالعہ انسان ہیں اور مشرق و مغرب کی شاید ہی کوئی قابل ذکر کتاب ہو جو ان کی نگاہ سے نہ گزری ہو۔ پھر لطف یہ کہ جو کچھ پڑھا ہے وہ آج ہی متحضر ہے۔ ان کی ہر بات' نفسیات' فلسفہ' ادب' معاشرت' لطف زبان اور لطیف مزاح کا ایسا مجموعہ ہوتی ہے کہ انسان اس سے مسحور ہو جاتا ہے چودھری صاحب شمالی ہند کے اس کلچر کا نمونہ ہیں جس کو دیکھنے کو آج آنکھیں ترستی ہیں۔ وہ نوجوان' بچوں' اور بوڑھوں میں ہر جگہ اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں۔ اور ہر شخص متمنی رہتا ہے کہ وہ کچھ کہیں اور ہم سنیں پھر ان کی گفتگو فضول وقت گزاری نہیں ہوتی بلکہ وہ اس میں ایسے ایسے نفسیاتی اور ادبی نکتے بیان کر جاتے کہ سن کر لطف آ جاتا ہے' یہ کتاب ایسے ہی نوادر سے لبریز ہے۔ ابتداء میں صلاح الدین صاحب نے اپنے مقدمہ میں نہایت قابلیت کے ساتھ چودھری صاحب کی ادبی خصوصیات پر نظر ڈالی ہے جو بجائے خود ایک بڑا اچھا انتقادی شاہکار ہے۔ نیاز فتح پوری نہایت بے پیرے ہیں یہ کسی کی رعایت مروت پاس آنے نہیں دیتے''[۳۴]۔

۳۴؎ کو یاد بستان عمل گیا' صفحات ۲۳۱ تا ۲۳۳۔

چودھری محمد علی ردولوی کی ادبی خصوصیات پر تفصیلی تبصرہ اگلے ابواب میں کیا پیش جائے گا۔

شاہ معین الدین احمد ندوی: ۱۹۰۳ء میں ردولی میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم ردولی میں ہوئی پھر مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ میں مزید تعلیم کی غرض سے داخل کئے گئے وہاں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کی پھر دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخل ہوئے۔ یہاں سے تحصیل علم کے بعد ۱۹۲۴ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ گئے اور وہاں مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین کا رفیق ایک معمولی تنخواہ پر مقرر کیا اور یہیں سے آپ ترقی کی راہوں پر گامزن ہوئے۔آپ کی تصانیف آپ کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی: (۱) تاریخ اسلام' (۲) سیرت صحابہ' (۳) علمی نقوش' (۴) خلفائے راشدین' (۵) اسلام اور عربی تمدن' (۶) دین رحمت' (۷) تابعین اور تبع تابعین' (۸) حیات سلیمان وغیرہ۔'' شاہ صاحب بہت سی علمی اور ادبی صفات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت منکسر المزاج اور خلوص کے انسان تھے۔ان کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی تحریر فرماتے ہیں کہ'' شاہ صاحب کی سب سے نمایاں صفت ان کی فطری شرافت' کریم النفسی اور عالی ظرفی تھی۔اس میں ان کی خاندانی روایات' اعلیٰ نسب اور اودھ کی قدیم تہذیب کا بھی دخل تھا اس شرافت کا تجربہ کم وبیش ان سب لوگوں کو ہوگا جن کا ان سے واسطہ پڑا یا کچھ دن ساتھ رہنے کا موقعہ ملا''[۳۵]۔

ڈاکٹر چودھری آفتاب احمد صدیقی: ۱۵/جولائی ۱۹۱۵ء کو ردولی کے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے والد چودھری سرفراز احمد عرف میاں بابو کی زیرنگرانی ردولی میں حاصل کی' پھر فیض آباد سے میٹرک اور انٹر پاس کیا۔ مزید تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ بی اے۔ایم اے اور اس کے بعد پی ایچ' ڈی کی ڈگری لی۔ان کی ڈاکٹریٹ کا عنوان تھا'' مولانا شبلی ایک دبستان''۔ یہ اپنے زمانے کے ردولی کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی۔شیراز' تہران' اور لاہور میں تقریر کے سلسلے میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی طرف سے گئے۔آپ انجمن ترقی اردو بورڈ کے بھی مجلس ادارت کے اعزازی ممبر مقرر ہوئے۔آپ کی مشہور تصانیف ہیں: (۱) شبلی ایک دبستان' (۲) گلہائے داغ' (۳) صہبائے مینائی' (۴) آتش کدہ وغیرہ۔ان کے علاوہ آپ کے مضامین بھی ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۲۳/مارچ ۱۹۹۸ء میں کراچی میں حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہوا اور گلستان جوہر میں واقع پہلوان گوٹھ کے قبرستان میں دفن ہوئے (بحوالہ احمد عظیم)۔

ڈاکٹر مسیتب عباس شارب ردولوی: یہ محلہ عباسی کے رہنے والے ہیں اور یکم ستمبر ۱۹۳۵ء کو ردولی میں پیدا ہوئے۔

۳۵؎ ''تعمیر حیات'' شاہ معین الدین احمد ندوی' اشاعت خاص' لکھنؤ' صفحہ ۸۔

اسکول کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ دادا کی توجہ قدیم طریقہ تعلیم کی طرف تھی جنہوں نے گلستان و بوستان پڑھائی۔ آٹھویں کلاس کا امتحان مخدومیہ اسکول ردولی سے پاس کیا اور میٹرک وانٹر کانپور کالج سے مکمل کیا پھر مزید تعلیم کے لئے لکھنؤ آ گئے۔ ۱۹۵۶ء میں بی اے آنرز اور ۱۹۵۷ء میں ایم اے پاس کیا۔ ۱۹۶۵ء میں ''جدید اردو تنقید کے اصول'' کے عنوان سے پی ایچ' ڈی کا مقالہ لکھا اور پی ایچ' ڈی کی ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کی مختلف ادبی سوسائیٹیوں کے رکن اور جنرل سیکریٹری بھی رہے۔ ۱۹۵۶ء میں روزنامہ اردو لکھنؤ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ان مشاغل کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۵۹ء میں آپ کی پہلی تصنیف ''مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر'' طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ شارب ردولوی کی دیگر تصانیف ہیں: (۱) ''گل صدرنگ'' (۲) ''جگر فن اور شخصیت'' (۳) ''افکار سودا'' (۴) ''جدید اردو تنقید اصول ونظریات'' (۵) ''مطالعہ ولی تنقید وانتخاب''۔ ان کے علاوہ سو کے قریب تحقیقی وتنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر شارب صاحب ردولی کے دوسرے شخص ہیں جنہوں نے پی ایچ' ڈی کی ڈگری لی اور ردولی کا نام روشن کیا۔ ان کی ادبی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان کی بیگم ڈاکٹر شمیم نکہت بھی ایک مشہور افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ''پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار'' کے عنوان سے اپنا مقالہ تحریر کیا ہے۔ جامعہ دہلی سے ریٹائر ہو کر لکھنؤ میں ''شعاع ادب'' کی بنیاد ڈالی اور اس کی سرپرستی کر رہے ہیں۔

مولوی کاظم رضا: انہوں نے ابتدائی تعلیم ردولی میں حاصل کی پھر لکھنؤ جا کر ۱۹۴۵ء میں صدر الفاضل کی سند حاصل کی اور ردولی کے لوگوں میں یہ پہلے اور ابھی تک غالباً آخری شخص ہیں جن کے پاس عربی کی اعلیٰ سند ہے آپ کے اکثر مضامین مذہبی رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔

محمد شعیب نعمانی: ۱۹۳۷ء میں ردولی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مخدومیہ اسکول سے حاصل کی پھر مختلف جگہوں سے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں افسانہ نگاری سے کافی شغف رہا۔ ''انیسویں صدی'' دہلی اور ''شمع'' دہلی میں آپ کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں کبھی کبھی تنقیدی مضامین بھی لکھ لیتے ہیں ردولی میں اس وقت ادبی مذاق جو شہرت رکھتا ہے اس میں آپ کی ذات کا بہت دخل ہے۔

ڈاکٹر خورشید مظہر الحق نعمانی: ۱۶/اکتوبر ۱۹۳۳ء میں ردولی میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مخدومیہ اسکول سے حاصل کی پھر انٹر مہاراجہ سنگھ کالج بہرائچ سے پاس کیا۔ بی اے اور بی ایڈ ۱۹۵۳ء میں شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ سے پاس کیا۔ انہوں نے اردو اور فارسی میں ۱۹۶۶ء میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور پھر بمبئی یونیورسٹی میں ملازم ہو گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ کے تحقیقی مقالہ کا موضوع ''اردو کی ترقی میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کا حصہ'' تھا۔

ردولی کے شعراء:

قصبہ ردولی سے تعلق رکھنے والے چند شعراء کا تذکرہ انتہائی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پرانے شعرائے کرام میں:

(۱) سید رشید الزماں امیدؔ ردولوی: آپ کے والد کا نام سید ناظر حسن قادری تھا' محلہ قضیانہ کے رہنے والے تھے' امیر مینائی اور داغ سے اصلاح لیتے رہے' جوانی میں اجودھیا چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ (۲) مولوی سید علی: ان کے والد کا نام سید محمد حسین تھا' محلہ کٹرہ کے رہنے والے تھے۔ (۳) نواب حسن نوقؔ: آپ کے والد کا نام سید علی حسن تھا' محلہ صوفیانہ کے رہنے والے تھے۔ (۴) محمد یوسف اثرؔ: یہ بھی امیر مینائی کے شاگردوں میں سے تھے' محلہ شیخانہ کے رہنے والے تھے۔ (۵) اسرار الحق مجازؔ: ان کے والد کا نام چودھری سراج الحق تھا' محلہ خواجہ حال کے رہنے والے تھے۔ (۶) یوسف علی چشمؔ: آپ کے والد کا نام حافظ محمد علی تھا' محلہ صوفیانہ کے رہنے والے تھے۔ (۷) محمد احمد مستؔ: ان کے والد کا نام شاہ افتخار احمد تھا' محلہ مخدوم زادہ کے رہنے والے تھے۔ (۸) محمد نصیر عزمؔ: محلہ پرانا کوٹ کے رہنے والے تھے۔ (۹) حامد علی حامدؔ: محلہ صوفیانہ کے رہنے والے تھے۔ (۱۰) قاضی التفات حسین التفاتؔ: یہ بھی محلہ صوفیانہ کے رہنے والے تھے۔

شعرائے حال میں (۱) مولوی شیخ جعفر مہدی رزمؔ: والد کا نام مصطفیٰ علی تھا۔ (۲) مسعود اختر جمالؔ: والد کا نام مولوی عبدالکریم تھا' محلہ سالار کے رہنے والے ہیں۔ (۳) معصوم علی بیدلؔ: والد کا نام سید محمد جعفر تھا' محلہ صوفیانہ کے رہنے والے ہیں۔ (۴) وسیم انصاری: ان کا شمار اپنے دور کے بہترین شعراء میں ہوتا تھا' آپ نے ردولی میں ''بزم امین الادب'' قائم کی جس میں بڑے بڑے شعرائے کرام شرکت کرتے تھے۔ (۵) ماسٹر محمد عمر اختر واصفی: محلہ سالار کے رہنے والے ہیں۔ (۶) شبیر حسین کاظمی: یہ بھی محلہ سالار کے رہنے والے ہیں۔ (۷) باقر مہدی باقرؔ: مولوی جعفر مہدی رزمؔ کے بیٹے ہیں' محلہ مخدوم زادہ کے رہنے والے ہیں۔ (۸) مسیب عباس شاربؔ: ان کا ذکر تفصیل سے ادیبوں کے بیان میں آ چکا ہے۔ (۹) ڈاکٹر محمد احمد قادری قمرؔ: والد کا نام محمد عالم قادری' محلہ قضیانہ کے رہنے والے ہیں۔ شاعری محض تفنن طبع کے لئے کرتے ہیں' پیشہ ور طبیب اور ہومیو پیتھ ڈاکٹر ہیں۔ نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں شاعری فرماتے ہیں۔ انتہائی خوش گلو شاعر ہیں اور تصنع و تکلف سے مبرا رزمرہ میں شاعری کرتے ہیں۔

دیگر شعراء میں ماسٹر ممتاز علی آحمرؔ' تقی شبر تقیؔ' شاہ مبین احمد منظرؔ' شاہ اقبال احمد احمدی قدوسی' اقبال رئیس احمد رئیس الشاکری' ڈاکٹر انصار حسین اسیرؔ' شاہ اشتیاق احمد منظرؔ' مشتاق حسین قمرؔ' عادل رضا عادلؔ' عامر نعیم صفوی نجمیؔ' رفعت نعیم صفوی عزمیؔ' محمد نسیم' نسیمؔ' محمد فہیم' فہیمؔ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ہندی زبان میں شاعری کرنے والے چند مشہور لوگوں میں کیلاش نرائن تیواری' دیوندر شرما ڈتلپؔ' گنگا رام' راکیش پانڈے' نرسنگھ نرائن پانڈے چنچلؔ' سید دیوگپت وغیرہ۔

ادبی ذوق:

قصبہ ردولی میں بڑے بڑے علماء' ادیب اور شاعر گزرے ہیں اور ان کی شہرت آج بھی ہے ان لوگوں نے اپنی لیاقت و قابلیت کی وجہ سے بہت نام پیدا کیا ہے۔ موجودہ دور میں نوجوان طبقہ کو مذہبی تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے مگر ادب اور شعر و شاعری کا ذوق بہت زیادہ ہے۔ اور اسی وجہ سے ادبی و تاریخی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں مشاعرے ہوتے ہیں اور علمی معلومات بڑھانے کے لئے جنرل نالج کے پرچے نکلتے رہتے ہیں۔ یہاں پر بڑے بڑے مشاعرے مختلف انجمنوں کی طرف سے ہوا کرتے ہیں۔ جو ادبی انجمنیں یہاں موجود ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

بزم ہمارا ادب: ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر شاربؔ ردولوی نے ایک ادبی انجمن قائم کی۔ اس میں چار بڑے شاندار کل ہند مشاعرے ہوئے۔ آخری مشاعرہ شاہ حیات احمد کے گھر پر ہوا جس میں نشور واحدی' خمارؔ بارہ بنکوی' زبیرؔ غوری' شارق ابرایانی' واقف رائے بریلوی' بہزادؔ لکھنوی وغیرہ نے شرکت کی۔ یہ اس بزم کا آخری مشاعرہ تھا اس کے بعد یہ بزم منتشر ہوگئی۔

شبینہ کلب: ردولی کی ادبی تاریخ میں یہاں کی شعری نشستوں اور ادبی محفلوں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ لیکن کچھ بزرگوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ردولی کی ادبی اور شعری ماحول پر کچھ سکوت سا طاری ہوگیا ہے۔ جس پر کبھی جگر اور شفیق کے دلنواز نغمے گونجتے ہوں اور جس نے ذوقؔ' رزمؔ' مجازؔ' مسعود اختر جمالؔ' وسیم انصاری اور باقر مہدی جیسے شعراء کو جنم دیا ہو اس جگہ پر ''اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی'' جیسی کیفیت طاری ہوگئی۔ لیکن ہمیشہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا قصبہ کے باہمت اور باذوق نوجوانوں نے جن میں کرشن چندر' عشرت' شفیعؔ' شاہ علی احمد' تقی شبر' انعام اور اشفاق حسین قابل ذکر ہیں' ان لوگوں نے اس سکوت کو توڑا اور ۱۹۶۲ء میں شبینہ کلب کے نام سے ایک ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کے قائم ہوتے ہی خوابیدہ ادبی اور شعری

ماحول میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اس کے قیام کا مقصد تھا کہ ردولی کی ترویج وترقی میں لوگ بھرپور حصہ لیں اور نئی نسل میں شعور ادب پیدا ہو اور انہیں اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے۔ شبینہ کلب کے زیر اہتمام یوم مجاز کے سالانہ کل ہند مشاعرے اور اس موقع پر شائع ہونے والے یادگاری مجلہ کو ملک گیر شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ آج بھی شبینہ کلب پوری ذمہ داری اور دلچسپی کے ساتھ اردو کی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔ اس کلب کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اسے صدر یوپی اردو اکیڈمی کی سرپرستی حاصل ہے۔

انجمن فردوس ادب: ۱۹۷۰ء میں یہ انجمن چند نوجوانوں نے قائم کی جس کے اغراض ومقاصد یہ تھے: ''اردو زبان کی بقا اور ترویج واشاعت کیلئے کوشش' ادبی نشستوں کا اہتمام' ایک سالانہ مشاعرہ' جشن عید میلاد النبی ﷺ کے سلسلے میں نعتیہ مشاعرہ اور لائبریری کا قیام اردو کی بقا کے لئے جدوجہد۔'' اس انجمن کی جانب سے ۱۹۷۴ء میں ''یوم مجاز'' کا کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا اور ایک رسالہ زیر ادارت رئیس شاکری ''آئینہ'' کے نام سے شائع ہوا جو بہت مشہور ہوا۔

مرکز ادب: ۱۹۵۲ء میں قائم ہونے والی اس انجمن کا دفتر خان عزمی کی تحریک ارشاد گنج میں قائم ہوا۔ یہاں پر پندرہ روزہ اور ماہواری طرحی نشستوں کا اہتمام ہوا اور اس کی زیر نگرانی برابر مشاعرے ہوتے رہے اور بہت کامیاب رہے۔ انجمن ابھی بھی قائم ہے اور کبھی کبھی نعتیہ اور ادبی محفلیں ہوتی رہتی ہیں۔ جعفر مہدی رزم صدر' فاروق احمد نائب صدر' اور مولانا تقی شبر جنرل سیکریٹری تھے۔

ترٹن ساہیت منڈل: یہ ہندی ادیبوں اور شاعروں کی ایک انجمن ہے جس کا مقصد ہندی زبان کی ترقی وتوسیع ہے۔ اس میں ہندی کی ادبی کتابوں کی اشاعت ہندی مشاعرے شامل ہیں۔ اور کسی خاص موضوع پر ادیب ایک جگہ جمع ہو کر اپنا مضمون پڑھتے اور کوی سملن ہوتا ہے۔ ہفتہ میں ایک ادبی نشست اور سال میں ایک بڑے مشاعرے کا انتظام یہ انجمن کرتی ہے۔ مقامی شعراء کے علاوہ باہر کے شاعر بھی کافی تعداد میں مدعو ہوتے ہیں۔

ہندی پرچارنی سبھا: یہ ایک رجسٹرڈ باڈی ہے اس کے زیر نگرانی دو لائبریریاں ہیں' جن کو صوبائی ومرکزی سرکاروں سے امداد ملتی ہے۔

ردولی شعراء کی نظر میں:

''نظم شہر آشوب'': اس نظم کے چند اشعار پیش خدمت ہیں یہ نظم مجاز ردولوی نے لکھی ہے ان اشعار کو پڑھ کر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے گویا گذشتہ ردولی کو نگاہ میں رکھ کر عالم وجود میں لائے گئے ہوں۔

سبزہ و برگ و لالہ و سمن کو کیا ہوا — سارا چمن اداس ہے ہائے چمن کو کیا ہوا
ایک سکوت ہر طرف ہوش ربا و ہولناک — خلدوطن کے پاسباں خلدوطن کو کیا ہوا
کوئی بتائے عظمت خاک وطن کہاں ہے اب — کوئی بتائے غیریت اہل وطن کو کیا ہوا
کوہ وہی دمن وہی، دشت وہی، چمن وہی — پھر یہ مجاز جذبہ حب وطن کو کیا ہوا

منظر ردولوی:

اس دورسیہ پوش میں بھی اہل ردولی — کھیلے ہیں رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی ہولی
طوفان حوادث سے کریں آنکھ مچولی

واللہ حقیقت نگری شیوہ ہے اس کا — واللہ یہ عالی نظری شیوہ ہے اس کا
دیکھو تو اسی خاک میں اختر نظر آئیں — ذروں میں چھپے مہر منور نظر آئیں
سمٹے ہوئے بازوں میں شہپر نظر آئیں

کوزے میں لئے بخت سکندر ہے ردولی — شیشے میں لئے زیست کا جوہر ہے ردولی
اے دوست یہاں جام کے پینے میں مزے ہیں — ہنسنے میں مزے ہیں یہاں جینے میں مزے ہیں
اور چاک گریباں کے بھی سینے میں مزے ہیں

تصویر صفت ہائے ردولی کی زمین ہے — دیکھو تو ذرا غور سے کیا چیز نہیں ہے

خان عزمیؔ ردولوی:

ردولی کا ہر اک بچہ ہے شاعر
اسے گھونٹی ملی ہے شاعری کی

یہ ردولی نہیں ہے اے عزمیؔ
میرؔ و غالبؔ کی راجدھانی ہے

واصفؔ ردولوی:

دامن میں لئے گوہر مقصود ہو میں
صاف آئینہ رحمت معبود ہوں میں

رہتا ہوں ردولی ہی میں لیکن واصفؔ
صد شکر کہ حاسد نہیں محسود ہوں میں

ردولی کی گلیاں سلامت رہیں
ابھی اور جینے کے ارمان ہیں

رئیسؔ الشاکری:

اے ردولی تری گلیوں کی سکوں ریز ہوا
کھینچ لائی ز ہے تقدیر کہاں سے مجھکو

یہ لگتا ہے مجھ کو بہشت بریں میں
ردولی کے ارمان باقی رہیں گے

کیفؔ بھوپالی:

ردولی سنتے ہیں تیرا بھی اک زمانہ تھا
تو ایک شہر نہیں تھا نگار خانہ تھا

تو آج اپنی غریبی پہ سوگوار ہے کیوں
بجھا بجھا سا چراغ سر مزار ہے کیوں

مکاں کا حسن مکیں سے ہے بام و در سے نہیں
بدن کا رنگ لہو سے ہے بال و پر سے نہیں

جمال شہر مکانات پر نہیں موقوف
سفید و سرخ عمارات پر نہیں موقوف

اسی زمین پر مہمان نواز رہتے ہیں
ہر اک مرض کے یہاں چارہ ساز رہتے ہیں

زمین ہو کے بھی اک آسمان ہے یہ دیار
یہاں سے گذرے ہیں مسعود غازی و سالار

ہے یہ مقام ابھی تک دل و نظر کا چراغ
ہے اس کی یاد میں موجود ایک صحبت باغ

ریاضؔ راہی:

خدا رکھے گلستان ردولی ریاض خلد سے کم تر نہیں ہے

نجمؔ آفندی:

رکھیں گے یاد تجھ کو اے خطہ ردولی ملتے نہیں جہاں میں مہمان نواز ایسے

نظمیؔ صدیقی:

یہ ردولی یہ مقام فکر یہ خانہ خراب سر برہنہ، چاک داماں، جیسے مفلس کا شباب
جیسے زیب طاق نسیاں کرم خوردہ اک کتاب انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب
یہ ردولی یہ ریاض حسن یہ جنت نشاں بن گئی اک عرصہ کرب و بلا آہ فغاں
جیسے بے عنوان صدیوں کی پرانی داستاں آگے آگے دیکھئے کیا گل کھلائے آسماں
آج بھی اس خانہ ویراں میں ہوتا ہے گذر ڈوبتے ہیں چاند تارے مسکراتی ہے سحر
قہقہوں کے جام و مینا بھی کھنکتے ہیں مگر جیسے بدروحوں کی آوازیں ہوا کے دوش پر
یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں تغیر ہے ضرور کون جانے کب شب ظلمات کو ملتا ہے نور

باب دوم

چودھری محمد علی ردولوی کے حالات زندگی

ا۔ شجرہ نسب اور خاندان:

نام : چودھری محمد علی ردولوی عرف چمرو

والد کا نام : چودھری احسان رسول

دادکا نام : چودھری اسد رسول

چودھری محمد علی صاحب کے آباؤ اجداد تبلیغ دین کے سلسلے میں عرب سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے ان کا تعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نسل یعنی محمد بن ابوبکر کی اولاد سے تھا اور اسی وجہ سے ان سے چلنے والی نسل شیخ صدیقی کہلائی چودھری محمد علی صاحب کے والد اور دادا اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔

چودھری محمد علی ردولوی صاحب کی والدہ کے خاندان کا تعلق بھی عرب سے ہی تھا۔ چودھری صاحب کے نانا کا نام میر محمد عابد تھا اور والدہ کا نام مرتضائی بیگم تھا۔ یہ لوگ اولادِ رسول اللہ اور حضرت علی کی اولاد سے عالی نسب شیعہ سید تھے۔ ان کا خاندان خوبصورتی کے لئے بہت مشہور تھا۔ چونکہ چودھری محمد علی کے والد صاحب رنگین مزاج واقع ہوئے تھے اور بہت حسن پرست تھے اس لئے انہوں نے اس خاندان میں شادی کرنے پر اصرار کیا اور ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے چودھری صاحب کے نانا یعنی میر محمد عابد صاحب نے یہ شرط لگائی کہ شادی اسی وقت ہوسکتی ہے کہ جب لڑکا شیعہ عقیدہ اختیار کر لے۔ چنانچہ چودھری صاحب کے والد احسان رسول صاحب نے شیعہ عقیدہ اختیار کرلیا اور اس طرح انکی شادی اس خاندان کی ایک بہت ہی خوبصورت دوشیزہ مرتضائی بیگم سے ہوگئی۔

دراصل حسن ہی ان دو مختلف خاندانوں کے ملاپ کا سبب بنا۔ چودھری محمد علی صاحب کے خاندان کے لوگ پڑھے لکھے تھے اس وجہ سے انگریزوں نے ''امیر پور'' نام کا ایک علاقہ انہیں عطا کیا تھا جب زمینداری ختم ہوگئی تو بعد میں کچھ باغات اور تھوڑی سی زمین وغیرہ باقی بچی تھیں جو اب بھی چودھری محمد علی صاحب کے چھوٹے بیٹے چودھری سعید کے پاس ہیں[1]۔

---

[1] بہ روایت سید علی کاظم (چودھری محمد علی ردولوی صاحب کے نواسے اور ہما بیگم کے چھوٹے صاحب زادے) اور ہما بیگم۔

چودھری محمد علی ردولوی کے اسلاف:

۱۰۳۰ء میں سید حسن رضا جو سید سالار مسعود غازی کے ساتھ ردولی آئے تھے' انکی نویں پشت میں عبدالمجید نامی ایک بزرگ گذرے ہیں۔ انہوں نے اپنے حصہ کے کچھ دیہاتوں کو ایک جامع علاقہ قرار دے کر حضرت امیر کے نام پر اس علاقے کا نام ''امیر پور'' رکھا۔ بعدازاں تعلقہ امیر پور میاں موتی نامی ایک شخص کے قبضہ میں تھا اور ان ہی میاں موتی کے خاندان سے علاقہ امیر پور کے آخری تعلقہ دار چودھری محمد علی ردولوی تھے۔ چودھری صاحب کے دادا اسد رسول کی شادی امیر پور کے تعلقہ دار لطف علی کی بیٹی سے ہوئی تھی اور ان کے بطن سے احسان رسول صاحب ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے جو کہ چودھری محمد علی صاحب کے والد بزرگ وار تھے۔ چودھری احسان رسول صاحب کی شادی پورا رائے کے تعلقہ دار میر محمد عابد کی صاحب زادی مرتضائی بیگم سے ہوئی تھی جو شیعہ فرقے سے تعلق رکھتی تھیں[۲] (بحوالہ عابد سلمان : چودھری احسان رسول صاحب کی پیدائش ۱۸۵۵ء میں ہوئی)۔

محترمہ ہما بیگم چودھری محمد علی صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں انہوں نے چودھری صاحب کی زندگی پر ایک خاکہ تحریر کیا تھا جو کہ چودھری صاحب کی زندگی میں ہی ماہ نامہ ''ادبی دنیا'' کے خاص نمبر میں صلاح الدین صاحب کی زیر ادارت شائع ہوا تھا۔ اس خاکہ میں ہما بیگم نے اپنے دادا کے متعلق کچھ یوں تحریر کیا ہے۔

''چودھری محمد علی کے والد چودھری احسان رسول صاحب جو ردولی میں تعلقہ دار تھے' طبیعتاً بڑے رنگین مزاج تھے۔ صورت شکل کے بڑے حسین اور وجیہہ تھے۔ پھولوں کا گہنا فیض آباد سے آتا تھا اور دن رات طبلے ٹھنکا کرتے تھے۔ چودھری احسان رسول صاحب جہاں ناچ درنگ میں خاص شغف رکھتے تھے وہاں انہیں اپنے مذہب سے بھی عقیدت تھی۔''[۳]

''چودھری احسان رسول جوانی ہی میں یعنی ۲۸ سال کی عمر میں ۲۵ اکتوبر ۱۸۸۵ء بروز یکشنبہ انتقال کر گئے ردولی کے محلہ صوفیانہ کے آصفی امام باڑے میں مدفون ہوئے۔''[۴] (بحوالہ عابد سلمان : انتقال ۲۹ سال کی عمر میں کالرا میں مبتلا ہونے سے ۱۸۸۴ء میں ہوا)۔

چودھری محمد علی کی والدہ محترمہ مرتضائی بیگم کے متعلق محترمہ انیس قدوائی نے چند شخصیات کے تذکروں پر مشتمل ''اب جنکے دیکھنے کو'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں مرتضائی بیگم کے بارے میں کچھ یوں تحریر فرماتی ہیں۔

''سنتی ہوں ردولی کی دو حسین ترین بیگمات میں سے ایک انکی والدہ تھیں۔ حالانکہ میں نے جب دیکھا ضعیف ہو چکی تھیں اور حلیہ بدل چکا تھا بس آثار کہہ رہے تھے کہ عمارت عظیم رہی ہوگی بڑے کلے ٹھلے کی بیوی تھیں۔ انیسویں صدی

---

۲ اپنی یادیں ردولی کی باتیں صفحہ ۲۵۸ اور بہ روایت سید علی کاظم
۳ ماہ نامہ ''ادبی دنیا'' ۱۹۵۰ء خاص نمبر صفحہ ۱۳۸
۴ اپنی یادیں ردولی کی باتیں صفحہ ۲۶۰

کے دل پھینک تعلقدار کی ان گنت محبوباؤں کے ہوتے ہوئے بھی بیگم کا رعب و دبدبہ اور عزت و احترام مثالی تھا۔۔۔۔۔۔

ایسے ہی ایک موقع پر چودھری احسان رسول صاحب سے ارباب نشاط میں سے کسی نے خواہش کی کہ میرا آپ کی طرح اچکن پہننے کو جی چاہ رہا ہے۔ فوراً لکھنؤ کے کاریگروں سے زردوزی سے مرصع اچکن سلوائی مگر ایک نہیں دو عدد۔ ایک فرمائش کرنے والی کو عنایت ہوئی دوسری خود لے کر خوش خوش بیوی کے پاس پہنچے۔ بیگم نے کھولی' دیکھا اور اپنا سر پیٹ لیا۔ ''میں کہتی ہوں' تمہاری غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔ اللہ کی شان اب مجھے موئی نکاہیوں اور ناچنے والیوں کا سا لباس پہناؤ گے۔ ایسا دیدہ ہوائی ہے کہ شریف زادیوں اور کمینوں کا فرق بھی مٹ گیا۔ ایسے پہننے والیوں پر اللہ کی مار بس اور کیا کہوں لو دیکھو' اور یہ کہہ کر جھٹ کپڑوں کو دیا سلائی دکھا دی۔ اچکن جل کر خاک ہوئی اور میاں بے چارے ایک لفظ بھی نہ بول سکے۔'' [۵] (بحوالہ عابد سلمان : مرتضائی بیگم کی ولادت ۱۸۵۲ء میں اور وفات ۹۰ سال کی عمر میں ۱۹۴۲ء میں ہوئی)۔

۲۔ ولادت اور تعلیم و تربیت :

چودھری صاحب کی تاریخ پیدائش کے بارے میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ مثلاً سید علی محمد زیدی نے اپنی کتاب ''اپنی یادیں ردولی کی باتیں'' میں لکھا ہے کہ محمد علی صاحب ۹/جون ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ [۶] چودھری صاحب کے پوتے عابد سلمان نے اپنی خاندانی تاریخ میں سن پیدائش ۱۸۸۲ء تحریر کیا ہے (سلمانز۔ فیملی ہسٹری)۔

مرزا حامد بیگ نے ''سوغات'' کے شمارہ نمبر ۹ میں چودھری صاحب پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں انکی تاریخ پیدائش ۱۸/مئی ۱۸۸۲ء بہ مقام ردولی' ضلع بارہ بنکی' صوبہ اودھ (بھارت) تحریر کیا ہے۔ [۷]

قرۃ العین حیدر نے بھی ''سوغات'' کے شمارہ نمبر ۹ میں ایک مضمون چودھری صاحب پر لکھا ہے جس میں ان کی تاریخ پیدائش اور چودھری صاحب کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتی ہیں کہ

''چودھری محمد علی ضلع بارہ بنکی (اودھ) کے مشہور قصبہ ردولی کے رہنے والے ہیں۔ انکی ولادت ۳۰/جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۵/مئی ۱۸۸۲ء بروز جمعہ سالار محلہ قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی میں ہوئی۔'' [۸]

''چودھری صاحب کے والد نے ان کا نام محمد علی رکھا اور انکی عرفیت ''چمرو'' تھی۔ اس نام کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ چودھری صاحب کی پیدائش سے پہلے ان کے یہاں جتنے بیٹے پیدا ہوئے تھے وہ سب بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اس وجہ سے ٹوٹکے کے طور پر جب محمد علی صاحب پیدا ہوئے تو انہیں ایک چمار ان کے ہاتھ دو پیسوں میں فروخت کر دیا گیا انہیں

---

۵ ''اب جنگے دیکھنے کو'' از بیگم انیس قدوائی' صفحات ۵۴ تا ۵۵

۶ ''اپنی یادیں ردولی کی باتیں'' صفحہ ۲۶۰

۷ ''سوغات شمارہ نمبر ۹'' صفحہ ۳۱۲ ۸ ایضاً صفحہ ۳۱۷

چمارن کی کود میں ڈال دیا گیا اس طرح انکی عرفیت ''چمرو'' ہوگئی اور آخری عمر تک وہ اپنے آپ کو ''چمرو'' بڑے فخر سے لکھتے تھے۔ لوگ انہیں چودھری چمرو یا میاں چمرو کہہ کر پکارتے تھے۔ اودھ پنچ میں انہوں نے اپنے مضامین ''چمرو'' کے نام سے ہی شائع کرائے ہیں۔ ۹

ماہ نامہ فروغ اردو لکھنو کے رجسٹرڈ نمبر ۱۰۷۴ جنوری ۱۹۵۵ء کے شمارے میں سید احتشام حسین رضوی' چودھری محمد علی کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں۔

''چودھری محمد علی صاحب ۱۸۸۲ء میں اودھ کے مشہور قصبہ ردولی (ضلع بارہ بنکی) میں پیدا ہوئے۔'' ۹ (الف)

منزلیں گرد کے مانند مصنف خلیق ابراہیم خلیق چودھری محمد علی کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

''وہ ۹ رجون ۱۸۸۰ء کو ردولی میں پیدا ہوئے۔'' ۹ (ب)

ماہنامہ ''نگار پاکستان'' کے فروری ۲۰۰۲ء کے شمارے میں مسعود الحق نے چودھری صاحب کا سن پیدائش ۱۸۸۲ء تحریر کیا ہے۔ چودھری صاحب نے خود اپنی تاریخ پیدائش سن عیسوی اور مقام کے بارے میں ''نقوش'' کے ''آپ بیتی نمبر'' جو کہ جون ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا کچھ اس انداز سے لکھا ہے۔

میرے حالات:

''محمد علی' قوم شیخ صدیقی' ساکن ردولی' پیشہ آبائی تعلقہ داری' نام تعلقہ امیر پور ضلع بارہ بنکی صوبہ اودھ۔ تاریخ پیدائش ۱۸ رمئی ۱۸۸۲ء سے اس وقت ۱۹۴۲ء تک بقید حیات ہے۔'' ۱۰

چودھری محمد علی کی خود لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے اس لئے اب مزید تفتیش کی ضرورت نہیں۔

برادران و ہمشیرگانِ محمد علی:

چودھری صاحب کی صرف ایک ہمشیرہ تھیں' جن کا نام سکینہ بیگم تھا۔ یہ محمد علی صاحب سے عمر میں چار سال بڑی تھیں۔ چودھری صاحب کے کئی بھائی پیدا ہوئے مگر بچپن میں ہی فوت ہو گئے اس لئے یہ دو بھائی بہن پر مشتمل مختصر سا خاندان تھا۔ ۱۱

---

۹ بہ روایت سید علی کاظم اور ردولی کے دیگر حضرات و ہما بیگم

۹ (الف) ماہ نامہ فروغ اردو لکھنو۔ (بہ عنوان چودھری محمد علی ردولوی) صفحہ ۶۵

۹ (ب) ''منزلیں گرد کے مانند'' از خلیق ابراہم خلیق صفحہ ۱۲۷

۱۰ نقوش آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء صفحات ۹۹۴ تا ۹۹۵

۱۱ بہ روایت سید علی کاظم اور ردولی کے دیگر حضرات و ہما بیگم

محمد علی کی تعلیم و تربیت :

''چودھری صاحب جب ڈھائی یا تین سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ نابالغ ہونے کی وجہ سے انکا علاقہ کورٹ آف وارڈز کے حوالے کر دیا گیا تھا اور انکی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ایک حد تک ایک انگریز منیجر کے سپرد ہوئی۔[۱۲]

ابتدائی تعلیم :

چودھری صاحب کی بڑی بہن سکینہ بیگم کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک مولوی صاحب رکھے گئے تھے ان کا نام واجد علی تھا۔ محمد علی صاحب اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں ''میرا مذہب'' میں کچھ انداز سے لکھتے ہیں کہ

''جب میری بسم اللہ ہوئی تو میں بھی ان کے پاس بٹھا دیا گیا۔ ان مولوی صاحب کا تھوڑا سا حال بیان کر دوں تو شاید میری تربیت کا پتہ چل جائے۔ انُ کا سن تقریباً چالیس اور پچاس سال کے درمیان رہا ہوگا۔۔۔۔ دو روپیہ مہینہ اور کھانا پاتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا علاقہ کورٹ میں تھا۔۔۔۔۔ جو لڑکے میرے ساتھ کھیلتے تھے وہ اپنے انداز سے مجھ پر ظاہر کرتے تھے کہ تم امیر آدمی کے بچے ہو۔ ہمارے یہاں سے مولوی صاحب کو تین جوڑے روٹی اور دال دونوں وقت ملتی تھی۔ یہ روٹیاں بہت پتلی اور چھوٹی ہوتی تھیں۔ دو روٹیاں انُ میں سے مولوی صاحب کبوتروں کے لئے توڑتے تھے۔ باقی دس روٹیوں میں جو بیٹھا ہو اس کو بہ اصرار شریک کر لیتے تھے پیٹ نہ بھرنے کی شکایت جہاں تک یاد ہے کبھی نہ کی۔۔۔۔ تین مہینے کے روزے رکھتے تھے اور ہر وقت خوش رہتے تھے اس سن میں ہم پڑھتے کیا رہے ہونگے مگر یہ مجھ کو یاد ہے کہ اکثر کاندھے سے لگا کر مجھکو سلا دیتے تھے۔۔۔۔۔ میری عمر کے ساتویں سال دوسرے مولوی مقرر کئے گئے اس لئے یہ واقعات میری عمر کے چھٹے سال تک کے ہیں۔۔۔۔ میری والدہ مرحومہ بڑے کٹر شیعہ گھر کی تھیں۔ آٹھویں محرم کو حاضری بھی ہوتی تھی چنانچہ مجھ سے بھی تبرا کہنے کو کہا جاتا تھا۔۔۔۔ میں نے ایک بار انکار کیا تو میرے یہاں کی عورتوں نے کہا کہ یہ اثر سنّی مولوی کا ہے۔ وہ نکال دیئے جائیں اس میں میری سزا کی بھی غرض تھی کیونکہ میں مولوی صاحب سے بہت زیادہ مانوس تھا۔۔۔۔ مولوی صاحب مجھے گود میں لیتے تھے اور پیار کرتے تھے اور کہتے تھے جاؤ بیٹا جو کچھ تمہاری ماں کہتی ہیں کہہ دو۔۔۔۔ یہ مجھ کو آج تک خوب یاد ہے لیکن اس امر کا پورا یقین ہے کہ انہوں نے تشیع کے خلاف کسی موقعہ پر کچھ نہیں کہا۔ گو اور لوگ اکثر کہا کرتے تھے۔''[۱۳]

۱۲؎ ماہ نامہ ''ادبی دنیا خاص نمبر'' صفحہ ۱۳۸

۱۳؎ ''میرا مذہب'' صفحات ۹ تا ۱۱

۲۔ چودھری محمد علی ردولوی عہدِ شباب میں۔

ثانوی تعلیم :

دس سال کی عمر میں چودھری صاحب کو لکھنؤ کی ایک مشہور تعلیمی درسگاہ کالون تعلقہ دار کالج میں داخل کیا گیا وہاں سے انہوں نے میٹرک تک تعلیم صاحب کی ۔ چودھری صاحب نے اپنی تعلیم کے بارے میں ''نقوش آپ بیتی نمبر'' میں کچھ اس انداز سے تحریر کیا ہے ۔

'' پہلے مکتب میں تعلیم پائی پھر کالون تعلقہ دار اسکول (اب کالج) میں پڑھتا رہا مگر کوئی امتحان پاس نہیں کیا پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور آج تک جاری ہے ۔ انگریزی فارسی کا شوق تھا ۔ عربی سے نابلد مگر پیش ملا حکیم دپیش حکیم ملا ۔ غیر عربی دانوں کی صحبت میں اکثر عربی جملے اور آیاتِ قرآنی بول جاتا ہے ۔ انگریزی میں کوئی مستقل کتاب نہیں ہے ۔ اردو میں تصانیف ہیں'' ۔ ۱۴

محمد علی صاحب اپنی تصنیف ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' میں اپنے بچپن کے ایک دوست راجہ پرتھی پال سنگھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

'' میرا ان کا ساتھ کالون تعلقہ دار کالج جو اس زمانے میں اسکول کہلاتا تھا ۱۸۹۲ء سے ہوا ۔ وہ کوئی گیارہ برس کے ہونگے اور میں دس برس کا تھا'' ۔ ۱۵

چودھری صاحب کی باقاعدہ تعلیم محض انٹرنس تک ہوئی اور اسی دوران سترہ سال کی عمر میں ایک روز خاموشی سے انکی شادی ہوگئی منیجر کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بہت چراغ پا ہوا مگر کر کیا سکتا تھا شادی کے بعد باقاعدہ تدریسی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا ۔ حالانکہ کتابوں کا مطالعہ آخری عمر تک جاری رہا ۔ ۱۶

۳ ۔ ازدواج اور اولاد :

چودھری صاحب نے دو نکاح کئے ۔ پہلا نکاح ۱۸۹۹ء میں عابدہ بیگم نامی خاتون سے ہوا ۔ شادی کے وقت چودھری صاحب کی عمر ۱۷ سال تھی ۔ عابدہ بیگم محمد علی کے دادا اسد رسول کے حقیقی بھائی فضل رسول صاحب کے بیٹے ہدایت رسول صاحب کی بیٹی تھیں ۔ ۲۱ر جولائی ۱۹۲۹ء بروز یکشنبہ بہ مطابق ۱۳ر صفر ۱۳۴۸ھ میں عابدہ بیگم کا انتقال ہوگیا ۔ ۱۷

چودھری صاحب کے پوتے عابد سلمان نے اپنی خاندانی تاریخ میں تحریر کیا ہے کہ عابدہ بیگم ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئیں اور نظام انہضام کی خرابی سے ۴۵ سال کی عمر میں ۱۹۳۰ء میں وفات پاگئیں (سلمانز ۔ فیملی ہسٹری) ۔

---

۱۴ ''نقوش آپ بیتی نمبر'' جون ۱۹۶۴ء صفحہ ۹۹۵
۱۵ ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' صفحہ ۱۳۷ (پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۰۱)
۱۶ کشکول (حرف اول از سید علی کاظم) صفحہ ی ۔
۱۷ بہ روایت سید علی کاظم اور رودلی کے دیگر حضرات و ہمابیگم

ثانوی تعلیم :

دس سال کی عمر میں چودھری صاحب کو لکھنؤ کی ایک مشہور تعلیمی درسگاہ کالون تعلقہ دار کالج میں داخل کیا گیا وہاں سے انہوں نے میٹرک تک تعلیم صاحب کی ۔ چودھری صاحب نے اپنی تعلیم کے بارے میں ''نقوش آپ بیتی نمبر'' میں کچھ اس انداز سے تحریر کیا ہے ۔

''پہلے مکتب میں تعلیم پائی پھر کالون تعلقہ دار اسکول (اب کالج) میں پڑھتا رہا مگر کوئی امتحان پاس نہیں کیا پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور آج تک جاری ہے ۔ انگریزی' فارسی کا شوق تھا ۔ عربی سے نابلد مگر پیش ملا حکیم و پیش حکیم ملا ۔ غیر عربی دانوں کی صحبت میں اکثر عربی جملے اور آیاتِ قرآنی بول جاتا ہے ۔ انگریزی میں کوئی مستقل کتاب نہیں ہے ۔ اردو میں تصانیف ہیں'' ۔ ۱۴

محمد علی صاحب اپنی تصنیف ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' میں اپنے بچپن کے ایک دوست راجہ پرتھی پال سنگھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''میرا ان کا ساتھ کالون تعلقہ دار کالج جو اس زمانے میں اسکول کہلاتا تھا ۱۸۹۲ء سے ہوا ۔ وہ کوئی گیارہ برس کے ہونگے اور میں دس برس کا تھا ۔'' ۱۵

چودھری صاحب کی باقاعدہ تعلیم محض انٹرنس تک ہوئی اور اسی دوران سترہ سال کی عمر میں ایک روز خاموشی سے انکی شادی ہوگئی منیجر کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بہت چراغ پا ہوا مگر کر کیا سکتا تھا شادی کے بعد باقاعدہ تدریسی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا ۔ حالانکہ کتابوں کا مطالعہ آخری عمر تک جاری رہا ۔ ۱۶

۳ ۔ ازدواج اور اولاد :

چودھری صاحب نے دو نکاح کئے ۔ پہلا نکاح ۱۸۹۹ء میں عابدہ بیگم نامی خاتون سے ہوا ۔ شادی کے وقت چودھری صاحب کی عمر ۱۷ سال تھی ۔ عابدہ بیگم محمد علی کے دادا اسد رسول کے حقیقی بھائی فضل رسول صاحب کے بیٹے ہدایت رسول صاحب کی بیٹی تھیں ۔ ۲۱ر جولائی ۱۹۲۹ء بروز یکشنبہ بہ مطابق ۱۳ر صفر ۱۳۴۸ھ میں عابدہ بیگم کا انتقال ہوگیا ۔ ۱۷

چودھری صاحب کے پوتے عابد سلمان نے اپنی خاندانی تاریخ میں تحریر کیا ہے کہ عابدہ بیگم ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئیں اور نظامِ انہضام کی خرابی سے ۴۵ سال کی عمر میں ۱۹۳۰ء میں وفات پاگئیں (سلمانز ۔ فیملی ہسٹری) ۔

---

۱۴ ''نقوش آپ بیتی نمبر'' جون ۱۹۶۴ء صفحہ ۹۹۵
۱۵ ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' صفحہ ۱۳۷ (پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۰۱)
۱۶ کشکول (حرف اول از سید علی کاظم) صفحہ ی ۔
۱۷ بہ روایت سید علی کاظم اور رودلی کے دیگر حضرات و ہما بیگم

۳۔ چودھری محمد علی ردولوی کی زوجہ، اولیٰ، عابدہ بیگم۔

چودھری صاحب نے عابدہ بیگم کی وفات کے بعد چند سال تک دوسری شادی نہیں کی' چونکہ اپنی بیگم کو بہت چاہتے تھے اس لئے لوگوں کا خیال تھا کہ اب شاید دوسری شادی نہ کریں۔ مگر کچھ ہی سال بعد ۱۹۳۶ء میں بارہ بنکی کی قیصر بیگم نامی خاتون سے عقد ثانی کر لیا۔ ہما بیگم اس سلسلے میں لکھتی ہیں۔

''چودھری صاحب اکیلے کیسے رہ سکتے تھے تھوڑے دنوں میں مرحومہ بیوی کا ذکر کر کے دن گزارے ارادہ بھی بظاہر تھا کہ اب دوسری شادی نہیں کریں گے۔۔۔۔ مگر جی نہیں مانا اور نکاح کر ہی لیا۔'' [۱۸]

ریڈیو پاکستان کراچی کے پروگرام منیجر عرفان علی دعویٰ کرتے تھے کہ ان کی والدہ تعریف النساء کا نکاح بھی چودھری محمد علی سے ان کی پہلی بیگم کے انتقال کے بعد ہوا تھا اور یہ ان دونوں کی اولاد ہیں اور ان کے پاس نکاح نامہ بھی ہے۔ اس بات کی جب لاہور میں مقیم ہما بیگم سے تصدیق کی گئی تو انہوں نے نفی کرتے ہوئے بتایا کہ چودھری صاحب چونکہ رنگین مزاج آدمی تھے لہذا عین ممکن ہے کہ عرفان علی ان کے بیٹے ہوں لیکن نکاح انہوں نے صرف دو ہی کئے تھے۔

چودھری صاحب کی دوسری بیگم (قیصر بیگم) ابھی بقید حیات ہیں اور ردولی ہی میں چودھری صاحب کے آبائی مکان میں اپنے بیٹے چودھری سعید مصطفیٰ علی کے ساتھ مقیم ہیں۔

چودھری محمد علی کی اولاد:

مذکورہ دو ازدواج سے جو اولادیں ہوئیں انکے اسمائے گرامی اور تعداد حسب ذیل ہیں۔

محمد علی کی پہلی زوجہ عابدہ بیگم کے بطن سے سات بیٹیاں اور چار بیٹے پیدا ہوئے بیٹیوں کے نام یہ ہیں۔ کنیز فاطمہ عرف کجن (زوجہ سید کاظم رضا) ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ یہ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئیں اور ۷۰ سال کی عمر میں جگر کی ناکامی کے باعث ان کا انتقال ۱۹۷۲ء میں کراچی میں ہوا۔ صفیہ عرف چھن (زوجہ سید سبط احمد) ان کے چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ یہ ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئیں اور ۷۷ سال کی عمر ان کا انتقال ۱۹۸۱ء میں کراچی میں ہوا۔ عالیہ زہرا عرف الن (زوجہ سید غضنفر علی نقوی)' ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئیں اور ۹۱ سال کی عمر میں خبط الحواسی کے عالم میں ۱۹۹۶ء میں کراچی میں انتقال کر گئیں۔ ہما بیگم عرف رقیہ (زوجہ سید اخلاق حسین)' یہ ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئیں اور ۹۵ سال کی عمر میں دماغی اسٹروک کے باعث ۲۰۰۲ء میں لاہور میں انتقال کر گئیں۔ قرۃ العین' نواب اور حمیدہ' ان تین بیٹیوں کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔

---

۱۸ ماہنامہ ''ادبی دنیا خاص نمبر'' صفحہ ۱۴۲

محمد علی کی سب سے بڑی بیٹی کنیز فاطمہ کی شادی سید کاظم رضا صاحب سے ہوئی تھی جو کہ پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر انٹیلیجنس بیورو تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ کاظم رضا صاحب اردو کے مشہور شاعر اور دانشور آل رضا اور قیام پاکستان کے فوراً بعد قائداعظم کو کراچی کے ہوائی مستقر پر خوش آمدید کہنے والے ہاشم رضا کے بڑے بھائی تھے۔ ان کے نام سے کراچی میں محمد علی جناح روڈ پر واقع ''کاظم رضا مارکیٹ'' خاصی مشہور ہے۔ دوسری بیٹی صفیہ کی شادی چودھری صاحب کی بہن سکینہ بیگم کے بیٹے سبط احمد سے ہوئی تھی۔ صفیہ کے چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹے کا نام ابوالفضل العباس ہے جو کہ پاکستان کی فارن سروس میں تھے کئی ملکوں میں سفیر رہ چکے ہیں۔ اب اسلام آباد میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ تیسری بیٹی عالیہ زہرہ کی شادی پولیس کے ذمہ دار آفیسر سید غضنفر علی نقوی سے ہوئی تھی۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے سید مہیب نقوی مشہور تعمیراتی کمپنی ایسوسی ایٹڈ کنسٹرکٹرز لمیٹڈ کے مالک ہیں۔ منجھلے بیٹے ڈاکٹر مظفر علی نقوی کئی سال پہلے ماسکو (روس) کے قریب دریائے وولگا میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ ۱۹

چودھری صاحب کی حیات پانے والی چاروں بیٹیاں زیور تعلیم سے آراستہ تھیں۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی کی تعلیم گھر پر ہی مختلف استادوں سے حاصل کی۔ چودھری صاحب اپنی تصنیف ''یادگار مولانا کرامت حسین'' میں اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''جب۔ میری لڑکیاں ۱۱۔۱۹۱۰ء میں الہ آباد کے گرلز اسکول میں تعلیم پاتی تھیں اور میں ایک ضرورت سے الہ آباد گیا تھا۔ ایک عزیز دوست کی ہمراہی میں اسکول بھی گیا۔۔۔۔ میرے دوست اس مدرسہ نسواں کو بر بنائے روایات بنظرِ استحسان نہیں دیکھتے تھے۔ جب ہم لوگ بیرونی احاطہ کے اندر پہنچے تو چھوٹی لڑکیاں جن میں کوئی مسلمان چھ سات برس سے زیادہ کی نہ ہوگی ڈرل کر رہی تھیں میرے دوست باوجود اپنے خیالات کے لڑکیوں کی تہذیب وغیرہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مولانا کے سامنے دس روپیہ اس غرض سے پیش کئے کہ لڑکیوں کو مٹھائی تقسیم کر دی جائے۔۔۔۔ اس کے بعد مولانا نے میری اخلاقی جرات (لڑکیوں کو اسکول میں بھیجنے) کی تعریف کی'' ۲۰

عالیہ زہرہ اور ہما بیگم کو عربی و فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا ہما بیگم نے قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ ہما بیگم نے علی گڑھ کالج سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور لندن جا کر مونٹیسوری کی تعلیم بھی حاصل کی۔ لندن سے واپس آ کر بچوں کا اسکول کھولا اور ۵۳۔۱۹۵۲ء میں Vienna Peace Congress میں آسٹریا جا کر پاکستان کی نمائندگی بھی

---

۱۹ بہ روایت سید علی کاظم و ہما بیگم

۲۰ ''یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم''، صفحات ۲ تا ۳

کی اور دنیا میں امن کی اہمیت اور ضرورت پر انگریزی زبان میں تقریر کی۔ ہما بیگم نے چار کتابیں مختلف موضوعات پر لکھیں ہیں۔ عالیہ زہرہ اور ہما بیگم دونوں بہنوں کو انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ چونکہ اس زمانے میں لڑکیوں کو انگریزی کی تعلیم برائے نام دی جاتی تھی اس لئے انگریزی بولنا یا تقریر کرنا یا اچھی انگریزی لکھنا بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی تھی اور انہیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ۲۱

ہما بیگم نے چودھری صاحب کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا اور اسی موضوع پر ایک بار ریڈیو پاکستان پر تقریر بھی کر چکی ہیں۔ ہما بیگم پر Friday Times لاہور کی جلد ۱۳' شمارہ ۳' ۱۶ تا ۲۲ / مارچ ۲۰۰۱ء کی اشاعت (صفحات ۲۰ تا ۲۳) میں ایک مضمون بھی چھپ چکا ہے۔ لندن سے ڈپلومہ لینے کے بعد جب وطنِ عزیز واپس لوٹیں تو لاہور میں ایک اسکول کی پرنسپل ہوگئیں تھیں مگر کچھ ہی عرصہ بعد لاہور ہی میں اپنا ذاتی اسکول کھول لیا۔ ہما بیگم نے کراچی میں بھی ایک اسکول قائم کیا تھا مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ زیادہ عرصہ کام نہ کر سکیں۔ یہ چودھری صاحب کی سب سے لاڈلی بیٹی تھیں اور یہ بات ان کے خطوط پڑھ کر واضح ہوتی ہے۔ ان کا اصلی نام تو رقیہ بیگم تھا مگر چونکہ ان کی ولادت ہمالیہ کے ایک پہاڑی مقام پر ہوئی لہذا چودھری صاحب نے اس نسبت سے ان کا عرفیت نام ہما رکھا لیکن یہ بعد ازاں اسی نام سے مشہور ہوئیں۔ چودھری صاحب کے بارے میں ساری مفید معلومات انہیں سے حاصل ہوئیں۔ گو کہ ضعیف العمری کے باعث سماعت بھی کمزور تھی اور حافظہ بھی' مگر معلومات کا ایک ذخیرہ ان کے پاس محفوظ تھا۔ بدھ اور جمعرات یعنی ۱۳ اور ۱۴ نومبر ۲۰۰۲ء بمطابق ۷ اور ۸ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ کی درمیانی شب ۳ اور ۴ بجے کے دوران ۹۵ سال کی عمر میں دماغی امٹروک کے باعث انتقال کر گئیں اور دوپہر کے دو بجے مومن پورہ' لاہور میں واقع شیعہ قبرستان میں اپنے شوہر کے پہلو میں مدفون ہوئیں۔ اس طرح چودھری صاحب کے بارے میں قیمتی معلومات کا ایک جیتا جاگتا خزانہ دفن ہوگیا (بہ روایت رضی حیدر برنی' صفیہ کی دوسری صاحبزادی)۔

ہما بیگم کی شادی جسٹس سید اخلاق حسین سے ہوئی انہوں نے لندن سے بیرسٹری کی سند حاصل کی تھی۔ یہ اپنے وقت کے بہت مشہور وکیل تھے بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج ہوگئے تھے۔ ہما بیگم کے بطن سے آٹھ اولادیں پیدا ہوئیں۔ جن میں سے چار کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی بقید حیات ہیں۔ ان کی بیٹی رتی بیگم نے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں M.A. کیا اور پھر جرنلزم میں وہیں سے ڈپلومہ بھی کیا۔ رتی بیگم کے نو بیٹے اور ایک بیٹی ہے' وہ لاہور میں مقیم ہیں۔

ہما بیگم کے سب سے بڑے بیٹے کا نام رضا کاظم ہے۔ انکے پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ ان کا شمار پاکستان کے مشہور وکیلوں میں ہوتا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں ہما بیگم اپنے انہیں بیٹے کے ساتھ لاہور میں مقیم تھیں۔ دوسرے بیٹے کا نام

---

۲۱ بہ روایت سید علی کاظم و ہما بیگم۔

۴۔ چودھری صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہما بیگم عمر کے آخری دور میں۔

۵۔ ہما بیگم اپنے صاحبزادگان رضا کاظم اور سید علی کاظم (دائیں) کے درمیان ہیں۔

۶۔ ہما بیگم اپنی اولادوں رتی بیگم، رضا کاظم اور مدحت کاظم (دائیں سے بائیں) کے ہمراہ۔

۷۔ ہما بیگم اپنی ۹۳ ویں سالگرہ کا کیک کاٹتے ہوئے اپنی اولادوں اور ان کے بچوں کے درمیان ہیں۔

مدحت کاظم ہے۔انہوں نے پنجاب گورنمنٹ کالج سے B. A. کی سند لی ہے اور بعد میں لندن اسکول آف اکنامکس سے گریجویشن کیا یہ لاہور اور پشاور میں اپنا N.G.O. ادارہ چلا رہے ہیں۔پشاور اور لاہور میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں یہ ادارہ بہت کامیابی سے چل رہا ہے۔ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

ہما بیگم کے سب سے چھوٹے صاحبزادے جنکا نام سید علی کاظم ہے یہ وکالت کے پیشے سے منسلک ہیں اور ۲۰۰۱ء تک کراچی میں مقیم تھے۔ان ہی سے چودھری صاحب کی اولادوں کی تفصیل معلوم ہوسکی ہے۔ان کی دو اولادیں ہیں۔ان کا بیٹا کینیڈا میں مقیم ہے اور بینک میں ملازم ہے۔انکی بیٹی نے جامعہ کراچی سے جینیات میں M.Sc. کیا ہے۔یہ ۲۰۰۱ء کے اواخر میں اپنے بیٹے کے پاس کینیڈا ہجرت کر گئے۔۲۲

عابدہ بیگم کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹوں کے نام یہ ہیں : سلمان احمد علی۔نواب علی۔لطف علی عرف جابر۔ چوتھا بیٹا پیدا ہوتے ہی مرگیا تھا اس لئے اس کا نام معلوم نہ ہوسکا۔نواب علی بھی پیدائش کے کچھ عرصے بعد انتقال کر گئے تھے باقی دو کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سب سے بڑے بیٹے سلمانِ محمدی احمد علی ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔انہوں نے آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں لکچرر مقرر ہوئے۔بعد میں حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات میں ملازمت کرلی۔پھر ملک کی تقسیم کے وقت پاکستان منتقل ہوگئے اور یہاں کے امور خارجہ سے وابستہ ہوکر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور پاکستان کے سفیر بھی رہے۔وہ ایک آئیڈیل شخصیت کے مالک تھے۔۸۵ سال کی عمر میں انکا انتقال مئی ۱۹۹۸ء میں خیط الحواسی کی کیفیت میں طویل علالت کے بعد کینیڈا میں ہوا (بہ روایت عابد سلمان)۔انِ کی شادی عطرت فاطمہ بلگرامی سے ہوئی جو ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئیں اور ۸۴ سال کی عمر میں ۲۰۰۲ء میں کینیڈا میں وفات پاگئیں۔انِ کے دو بیٹے ہیں : اسد سلمان جو کہ لندن کے کسی اسپتال میں کینسر اسپیشلسٹ ہیں اور عابد سلمان یہ کینیڈا میں مقیم ہیں اور چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہیں۔انِ سے ہی چودھری صاحب کے خاندان کے بارے میں سنوں پیدائش اور انتقال کا علم ہوا۔

لطف علی عرف جابر یہ چودھری صاحب کے دوسرے زندہ رہ جانے والے صاحب زادے تھے۔یہ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے اور پیدائش سے ہی ذہنی طور پر کمزور تھے لہذا تعلیم وغیرہ حاصل نہ کرسکے۔انہوں نے اپنی عمر کا سارا وقت ردولی میں ہی گزارا۔ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ان کا انتقال ۵۵ سال کی عمر میں گردوں کا کام چھوڑ دینے کے باعث ۱۹۷۲ء میں ردولی میں ہی ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔۲۳

---

۲۲ بہ روایت سہیب نقوی اور عابد سلمان۔

۲۳ بہ روایت عابد سلمان۔

تعریف النساء کے بطن سے ردولی کے محلہ نبی خانے میں پیدا ہونے والے چودھری عرفان علی نے جامعہ کراچی سے بی اے کیا تھا اور ریڈیو پاکستان کراچی اسٹیشن سے وابستہ رہے۔ چند سال پیشتر پروگرام منیجر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے اور ۲۷ رجنوری ۱۹۹۹ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

قیصر بیگم کے بطن سے پیدا ہونے والے چودھری سعید مصطفیٰ علی ردولی کے آبائی مکان میں مقیم ہیں اور اس وقت چودھری صاحب کی تمام جائیداد کے مالک ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد انہوں نے ردولی کے محلہ کٹرہ میں اعلیٰ پیمانے پر ایک میڈیکل اسٹور قائم کرلیا ہے۔ لاکھ کوشش کے باوجود نہ انہوں نے چودھری صاحب کے بارے میں کوئی اطلاع بہم پہنچائی اور نہ چودھری صاحب کی کوئی تحریر یا مطبوعہ شے عنایت کی۔ انہوں نے فرمایا کہ چودھری صاحب کی تمام کتابیں یا تو ردی والے کو دیدیں یا جلادیں اب یہاں کچھ نہیں ہے۔ حد یہ کہ انہوں نے ان جگہوں کی تصویر کشی کی بھی اجازت نہ دی جہاں چودھری صاحب بیٹھ کر لکھا کرتے تھے یا مطب کیا کرتے تھے یا احباب سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ ان کی بیٹی کی شادی ہوچکی ہے۔ ان کا بڑا بیٹا قیصر محمد علی دہلی میں انگریزی کے ایک موقر روزنامے ''ایشین ایج'' میں اسپورٹس ڈیسک کا سربراہ ہے، باقی دو بیٹے زیر تعلیم ہیں (بحوالہ مسعود الحق۔ نگار پاکستان، فروری ۲۰۰۲ء)۔

۴۔ مزاج، وضع قطع اور افتادِ طبع:

چودھری صاحب بڑے نفیس مزاج، بہت باذاق، خوش دل، خوش گفتار انسان تھے۔ جوانی کا تو ذکر کیا بڑھاپے میں بھی بہت باذوق، خوش لباس اور خوش وضع تھے اور بہت ہی خوبصورت آدمی سمجھے جاتے تھے۔ ان کے عہدِ شباب کی بہت ہی بہترین تصویر بیگم انیس قدوائی نے اپنی تصنیف ''اب جنکے دیکھنے کو'' میں کھینچی ہے لکھتی ہیں کہ

''سرخ سفید رنگ، خوب گھنی سیاہ بڑی بڑی مونچھیں، ململ کا کرتا اس پر انگرکھا زیب تن کرتے تھے۔''[۲۴] اور اسی قسم کا نقشہ میرے شوہر ڈاکٹر مصطفیٰ شمیل بھی چودھری صاحب کے بارے میں کھینچتے ہیں جن کا بچپن ردولی میں گزرا۔ انہوں نے چودھری صاحب کو ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۲ء کے دوران بہت قریب سے دیکھا ہے۔ چودھری صاحب کی پوشاک اور دیگر شوق کے بارے میں ہما بیگم اس طرح سے رقم طراز ہیں کہ

''چودھری محمد علی صاحب کو جوانی میں عمدہ پھولوں، عمدہ کپڑوں اور بہترین عطر کا بڑا شوق تھا۔ جامہ دار، جامدانی کی شیروانی اور انگرکھے پہنتے تھے، مشک اور اگر وغیرہ کا سب سے قیمتی عطر استعمال کرتے تھے۔ بیلے چنبیلی کے پھولوں کا پورا بستر لگتا تھا جس پر آرام فرماتے تھے۔۔۔۔ حقہ کا بھی بہت شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل میں بڑا اہتمام کرتے تھے۔ خود ردولی میں ''نیچے بند'' کو سمجھا کر تیلی (نرکل) کے بڑے سبک اور خوبصورت نیچے بنواتے تھے۔ چاندی کا چنبر نیچے چاندی کی تھالی جس میں رنگ برنگے پھول

---

[۲۴] ''اب جنکے دیکھنے کو'' از بیگم انیس قدوائی صفحہ ۵۳

۸۔ چودھری صاحب کی زوجہ ثانی قیصر بیگم اپنے بیٹے چودھری سعید مصطفیٰ علی کے ساتھ۔

نفاست سے رکھے ہوتے اور چاندی ہی کا حقہ جس پر بیلے کے پھولوں کا ہار لپٹا ہوتا۔ لکھنؤ کا عمدہ خمیرہ جس کی خوشبو دور دور تک پھیلتی' استعمال کرتے تھے۔'' ۲۵

چودھری صاحب کی سماجی زندگی کے سلسلے میں ہما بیگم فرماتی ہیں کہ

''چودھری صاحب اتنے سوشل تھے کہ یو۔ پی کا شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو ان کو نہ جانتا ہو۔ دوستوں سے دوستی نبھانا اور ان کی پیٹھ پیچھے بھی دل سے چاہنا ان کا خاصہ ہے۔ جو دوست ان کے اس دنیا میں نہیں ہیں ان کے لئے اس طرح سے روتے ہیں جیسے کوئی اپنے قریبی عزیز کے لئے روتا ہو''۔

چودھری محمد علی کو گھوڑے کی سواری' شکار کھیلنے اور برج کھیلنے کا بھی شوق تھا۔ خوش دلی سے ہر ایک سے مذاق کرنے کی عادت تھی۔ مذاق کرنے کی یہ کیفیت تھی کہ ماں۔ بہن۔ بیوی۔ لڑکیاں۔ سالی۔ سرنج سب سے ایک ساتھ مذاق کرتے تھے۔ مزاج کے خلاف باتوں پر انہیں غصہ بھی آجاتا تھا۔ ان کے مخاطب نے اگر باتوں میں بے وقوفی کا اظہار کیا یا کوئی بہت بڑی غلطی کی تو بقول ہما بیگم ''چودھری صاحب کا Sense of Humour غصہ کا عکس لئے ہوئے اس شامت کے مارے مخاطب کو ایسی ایسی چوکس بھکائیاں (چھبتیاں) دیتا تھا کہ دور سے جو سنے اس کے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں اور جن پر گزرے' غریب سے اٹھاتے دھرتے نہ بنے۔ اور اگر کبھی نوکروں پر غصہ آتا تو ان کو مارا بھی مگر بعد کو جب غصہ اتر گیا تو اس سے معافی مانگتے اور انعام بھی دیتے تھے۔ نوکروں سے انکا ایک خاص قسم کا برتاؤ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نوکر ان کو دل سے چاہتے''۔ ۲۶

زمینداری چلی جانے کے باوجود انکے وفادار نوکروں نے انکا ساتھ نہیں چھوڑا ان کے پرانے سلوک کو نہیں بھولے۔ اسی وجہ سے چودھری صاحب نے ہومیو پیتھک دوا بانٹنے کا مشغلہ اختیار کیا۔ مفت دوا دیتے تھے اور صبح و شام مطب کرتے تھے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت نے یہاں پر بھی نمایاں کارنامے دکھائے۔ یعنی ان کی دوا سے چالیس پچاس سال پرانے امراض کے مریض پورے طور سے اچھے ہوئے۔ ہما بیگم فرماتی ہیں کہ ''میری آنکھوں دیکھا ہوا پچاس سال پرانا گٹھیا کا مریض چودھری صاحب کی دوا سے بالکل صحت یاب ہوگیا''۔ ۲۷ اپنے بارے میں بتاتی ہیں کہ ''خود میرے دس سال تک دمہ رہا سردیوں میں پوری پوری رات میں تکیہ پر سر رکھے بیٹھی رہا کرتی تھی۔ دنیا کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا علاج کر ڈالا' ڈاکٹر' حکیم' وید' اناڑی کوئی باقی نہیں رہا جس کا علاج ہوا نہ ہو مگر فائدہ نہ ہوا۔ آخر میں ایک روز تکلیف میں مجھے بہت زیادہ مایوس دیکھ کر انہوں نے کہا گھبراؤ نہیں اب میں تمہیں دوا دونگا یہ کہہ کر کتاب باہر سے منگوالی اور صرف اس علامت پر کہ بائیں کروٹ اور صبح ہوتے سانس کی تکلیف زیادہ ہوتی ہے' انہوں نے مجھے صرف ایک خوراک دوا ایک لاکھ قوت کی کھلا دی۔

---

۲۵ ادبی دنیا خاص نمبر صفحہ ۱۳۹

۲۶ نقوش' شخصیات نمبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۱ ۲۷ ادبی دنیا خاص نمبر صفحہ ۱۴۰

۹۔ چودھری محمد علی ردولوی اپنی عام وضع قطع کے ساتھ۔

اس وقت سے آج تک جس کو کوئی بتیس سال ہو گئے ہونگے میرے کبھی سانس پھولنے کی کیفیت تک نہیں ہوئی۔ خود انکی صحت بہت عمدہ رہی کبھی بیمار نہیں ہوئے۔ کھانا تمام زندگی مقوی اور ہلکا کھاتے تھے اور پورا پیٹ بھر کر کبھی نہیں کھاتے تھے' گاؤں کے اسامیوں کے لئے مطب ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ چاہے کوئی دوپہر کو ان کے آرام کے وقت آئے تب بھی اسے فوراً بلا کر دوا دیتے تسلی اور تشفی سے بھی مطمئن کرتے''۔ ۲۸

''منزلیں گرد کے مانند'' کے مصنف خلیق ابرہیم خلیق نے اپنی تصنیف میں چودھری محمد علی ردولوی کی افتادِ طبع اور سماجی خدمات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا ہے۔

''چودھری محمد علی ردولوی (۱۸۸۰۔۱۹۵۹) اودھ کے اوسط درجے کے تعلقہ داروں میں سے تھے۔۔۔۔ چودھری محمد علی ردولوی بالکل مختلف قسم کے جاگیردار تھے ان کا برتاؤ اپنے اسامیوں کے ساتھ ہم دردانہ بلکہ مشفقانہ تھا۔ جاگیرداری کا غرور اور طنطنہ انہیں چھو بھی نہیں گیا تھا۔۔۔۔ ردولی میں چودھری محمد علی سے کم لوگ واقف تھے مگر چمرومیاں کو بچہ بچہ جانتا تھا۔ چودھری محمد علی نے رسمی تعلیم کالون تعلقہ دار اسکول لکھنؤ میں حاصل کی جہاں وہ مرزا محمد عسکری کے چہیتے شاگرد تھے۔ علمی استعداد اپنے ذاتی شوق سے بڑھائی۔ اردو' فارسی ادبیات کے علاوہ انگریزی زبان وادب پر بھی عبور حاصل تھا۔۔۔۔ اور مشاہدے کے تیز تھے۔ الٰہیات سے کوک شاستر تک ہر موضوع پر بے تکان گفتگو کر سکتے تھے۔ یوں تو یونانی فلسفہ سے قرونِ وسطیٰ کے مسلم بالغوں' یورپی نشاۃ ثانیہ کے عظیم دماغوں اور شوپن ہار' نیٹشے' ہیگل' مارکس سے جارج سنتانیا اور برٹرینڈ رسل تک سبھی پر ان کی عالمانہ نظر تھی۔ لیکن فرائیڈ' ژونگ' ہیولک' ایلس وغیرہ پر سند تھے۔ شعروادب کے علاوہ موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اودھ کی لوک شاعری اور لوک سنگیت کے دل دادہ تھے۔ باغ بانی سے بھی شغف تھا اور سماجی کاموں سے بھی دلچسپی تھی۔ آج کل ویکیشنل تعلیم پر خاصا زور دیا جا رہا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ انہیں آج سے ستر برس پہلے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے ردولی میں ایک لیدر اسکول قائم کیا تھا جس میں چمڑے کی اشیاء مثلاً جوتے' بیلٹ' جیکٹ' سوٹ کیس وغیرہ بنانا سکھایا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا یہ غالباً پہلا اسکول تھا۔ چھ سال تک وہ یو پی لیجسلیٹو کاؤنسل کے ممبر بھی رہے۔

چودھری محمد علی ردولوی بلا کے حسن پرست واقع ہوئے تھے خوب رو لڑکیوں اور خوش ادا خواتین کی موجودگی میں کھل اٹھتے تھے اس وقت ان کی گل افشانی گفتار دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی بقول سجاد ظہیر خواتین کے جھرمٹ میں وہ بہت جلد ان سے کھل مل کر ایسی رازدارانہ باتیں کرنے لگتے تھے جیسی راجہ اندر اپنی پریوں سے کرتے ہونگے۔ ان کی حسن پرستی میں اس ہوس

---

۲۸ ادبی دنیا خاص نمبر صفحہ ۱۴۱

کا مطلق دخل نہیں تھا جس کی غالبؔ نے شکایت کی تھی۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

ان کی حسن پرستی ان کے اہل نظر ہونے کا ثبوت تھی۔۔۔۔حسن پرستی کو عبادت سمجھتے تھے اور اس کے اغماض کو کفرانِ نعمت گردانتے تھے''۔ ۲۸ (الف)

۵۔ علمی و ادبی سرگرمیاں:

بقول ہما بیگم ''علمی شوق اور مشاغل میں بھی اس حد تک تھے کہ گھر پر سوائے پڑھنے لکھنے کے اور کام ہی کیا تھا کتابیں ہزاروں روپیوں کی منگوا کر پڑھ ڈالیں۔عربی' فارسی' انگریزی' ہندی کوئی زبان اور مضمون ایسا نہیں ہے جس میں چودھری صاحب نے خاص قابلیت نہ پیدا کی ہو۔علمی مباحث بڑے بڑے انگریزی داں علماء سے برابر کے ہوتے تھے اور اکثر چودھری صاحب صحیح ہوتے تھے۔کتابیں جتنی پڑھتے تھے زیادہ تر ان کو یاد رہ جاتی تھیں۔ذہانت اور یادداشت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک مرتبہ کہیں مشاعرے میں گئے وہاں جتنے شعران کو اچھے لگے وہ سنتے گئے اور رومال اور کمر بند میں گرہ لگاتے گئے گھر واپس آئے تو گرہ کھولتے گئے اور اشعار لکھتے گئے۔گانے کا' اشعار کا اور دوسرے ادبی مضامین کا مذاق اتنا عمدہ تھا کہ لوگوں کو اشتیاق رہتا تھا کہ چودھری صاحب سے ایک بار مل لیں۔ ۲۹

چودھری صاحب کی شخصیت اور انکی ادبی خدمات کی اہمیت کے بارے میں خلیق ابراہیم خلیق کچھ اس طرح رقم طراز ہیں کہ

''چودھری محمد علی سے ناواقفیت یا کم واقفیت کا سبب ہمارے ادیبوں اور محققوں کی افسوسناک سہل نگاری اور غفلت ہے۔۔۔۔۔محمد علی ردولوی شروع میں مختلف موضوعات خصوصاً جنسیات پر مضامین اور کتابچے لکھتے رہے۔افسانے کی طرف بعد میں آئے۔۔۔۔نیاز فتح پوری کے علاوہ چونکا دینے والے بلکہ جھنجوڑ دینے والی تحریریں انہیں کی ہوتی تھیں۔ان کے مضامین اور افسانوں سے روشن خیالی اور آزاد خیالی پھوٹ پڑتی تھی۔ان کی نہایت دل کش اور منفرد اسالیب نگارش میں سلاستِ زبان کے ساتھ شوخی بذلہ سنجی کا وفور تھا۔۔۔۔چودھری محمد علی کے بیشتر مضامین اور افسانے جنسی تقاضوں اور

---

۲۸ (الف) ''منزلیں گرد کے مانند'' خلیق ابراہیم خلیق' صفحات ۱۲۷ تا ۱۲۸

۲۹ ماہنامہ ادبی دنیا خاص نمبر صفحہ ۱۳۹

موضوعات سے متعلق ہوتے تھے۔ ان کا مقصد محض تلذذ نہیں تھا بلکہ اس امر کی نشاندہی کرنا تھا کہ انسان کے فطری میلانات غیر فطری طور پر دبائے نہیں جا سکتے اور اگر دبائے جائیں تو قیامت خیز قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جنسیات کے بارے میں محمد علی سائنسی نقطہ نظر رکھتے تھے۔ جنسی جذبہ محض خواہشاتِ نفسی کو پورا کرنے کے لئے نہیں بلکہ تسلسل حیات کو قائم رکھنے کی غرض سے ضروری اور ناگزیر ہے اور جنسی تقاضوں کو اس طرح پورا ہونا چاہئے کہ زندگی پھلے پھولے اور سرسبز و شاداب رہے۔۔۔۔ چودھری محمد علی نے اردو ادب کے شجر ممنوعہ کا پھل چکھا اور اپنے قاریوں کو چکھایا۔ اپنے ادبی سفر میں وہ رومان کی پگ ڈنڈیوں سے نکل کر حقیقیت کی شاہراہ پر آ گئے اور اس ادب کی زرخیزی کے لئے زمین تیار کی جو سماجی حقیقت نگاری کی مضبوط اور توانا جڑوں سے پھوٹا'' ۲۹ (الف)

چودھری صاحب کی بظاہر تعلیم زیادہ نہ ہو سکی تھی یعنی ڈگری کے لحاظ سے۔ مگر وہ جس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اس زمانے میں تعلیم کا معیار بہت بلند تھا اور کم درجے تک پڑھے لکھے لوگ بھی بہترین صلاحیت کے مالک ہوتے تھے۔ چودھری صاحب کے علمی ذوق اور خداداد صلاحیت نے اکتسابِ علم کے جو بھی ذرائع ہو سکتے تھے انہیں اختیار کیا اور وہ ارتقا کی اس منزل تک پہنچ گئے جہاں اہلِ علم و ادب شہرت عام اور بقائے دوام کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ چودھری صاحب نے اربابِ علم و ادب کی صحبتیں حاصل کیں۔ وہ مولانا کرامت حسین مرحوم سے بہت متاثر تھے اور ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ چودھری صاحب نے ''مولانا کرامت حسین'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے اور اس کتاب میں ایک جگہ پر وہ لکھتے ہیں۔

''مجھے کام کرنے کی تمنا ہے مگر یہ چاہتا ہوں کہ کسی بڑی ذات سے اپنے کو وابستہ کر کے کام کا طریقہ سیکھوں (اس پر) مولانا نے فرمایا کہ بسم اللہ آپ تشریف لائیے اور میرے ساتھ رہیئے۔ مجھکو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا اور دوسرے روز میں پھر حاضر ہوا۔ ۳۰

پھر آگے لکھتے ہیں کہ

''جب مولانا نے شاہ نجف (لکھنؤ) کے پاس ایک پھوس کا بنگلہ لیا میں ۱۹۱۴ء میں مولانا کے پاس حسب وعدہ بہ ارادہ قیام آ گیا۔ مولانا نے سب سے پہلے اپنی اردو تصنیف جو میرے پڑھنے کے قابل تھیں' عنایت کیں اور دو تین انگریزی کتابیں بھی پڑھنے کو بتائیں۔۔۔۔

ہربرٹ اسپنسر و نیز دوسرے حکماء کی شروع کی کتابیں مولانا چاہتے تھے کہ ہر شخص پڑھ لے' اور مجھکو بھی مشورہ دیا تھا

---

۲۹ (الف) منزلیں گرد کے مانند' صفحات ۱۲۶ تا ۱۲۷

۳۰ ''یادگار مولانا کرامت حسین'' صفحہ ۶

ان کتابوں کے پڑھنے میں وجود باری تعلیٰ کا مسئلہ اکثر چھڑ جاتا تھا اور مولانا فرماتے تھے کہ عقلی دلیل کوئی نہیں ہے مگر وجودِ باری کی وجدانی دلیلیں بہت ہیں۔ ۳۱

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ایک موقع پر کچھ یوں لکھا ہے کہ

''چودھری محمد علی پڑھے ہوئے مشہور تعلقہ داروں کے اسکول کالون اسکول کے تھے' انگریزی انگریزوں سے پڑھی اور سیکھی انہی کے لب ولہجہ میں خوب فراٹے سے بولتے تھے' مطالعہ اپنی مشرقی چیزوں کا خوب کیا اور انگریزی میں ولدادہ برناڈ شا' سمرسیٹ مام' ٹیگور اور خلیل جبران کے رہے۔'' ۳۲

محمد علی نے اپنے علم' مشاہدات' تجربات اور ذوقِ تجسس سے حقیقتوں تک رسائی کی کامیاب کوشش کی۔ فکر وخیالات کو روایات کا قیدی بنانا گوارا نہ کیا اور جس بات کو صحیح سمجھا اس کا انتہائی بے باکی سے اظہار کیا اور اس بات کی پرواہ نہ کی کہ اس سے کون خوش ہوگا اور کون ناخوش۔ انہوں نے اپنی بیٹی ہما بیگم کو ایک خط لکھتے ہوئے اس امر کا انکشاف کیا ہے۔ اس خط میں انہوں نے خدا کو مخاطب کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''جب جوانی آئی تو تو نے ہی خیالات میں آزادی دی' خودرائے قائم کرنے کی قوت بخشی' ہربرٹ اسپنسر ل کے خیالات دل میں جمنے لگے کفر والحاد کی بنا پڑ گئی''۔ ۳۳

خلیق ابراہیم خلیق چودھری محمد علی کی ادبی سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چودھری محمد علی کی مطبوعہ تصانیف میں بارہ کتابیں اور کتابچے شامل ہیں۔۔۔۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے ایک کتاب صلاح کار لکھی جو اردو میں سائنسی نقطہ نظر سے جنسیات پر لکھی جانے والی پہلی کتاب تھی ان کی دیگر تصانیف میں اتالیق بی بی (مزاحیہ)' خطبی (مزاحیہ)' نقادی کے نقطہ (قلمی تصاویر کی پرکھ کے بارے میں کتابچہ) یادگار مولانا کرامت حسین (سوانحی کتابچہ) سیرۃ الاقطاب (سوانح) گناہ کا خوف (افسانوں کا مجموعہ) پردے کی بات (ضبط تولد کے موضوع پر ایک معلوماتی کتابچہ) کشکول محمد علی شاہ فقیر (مضامین' افسانوں اور خاکوں کا مجموعہ) گویا دبستاں کھل گیا (خطوط کا مجموعہ) سیرا مذہب اور کشکول شامل ہیں۔۔۔۔ ان کے وہ مضامین اور افسانے جو حکیم عبدالوالی کے رسالے ''معلومات'' اور اودھ پنچ میں شائع ہوئے تھے کتابی صورت میں مرتب نہیں ہوئے۔ معلومات میں ان کے ایک ایکٹ کے تین ڈرامے بھی شائع ہوئے تھے۔ انہوں نے آسکر وائلڈ اور جارج برناڈ شاہ کی بعض نگارشات کا ترجمہ بھی کیا تھا'' ۳۴ (الف)

---

۳۱ ''یادگار مولانا کرامت حسین'' صفحات ۶ اور ۹

۳۲ ''چودھری محمد علی ردولوی'' از انور حسین خان' صفحات ۳۹ تا ۴۰

۳۳ گویا دبستاں کھل گیا' صفحہ ۱۶۱ ۳۴ (الف) منزلیں گرد کے مانند۔۔۔۔ صفحہ ۱۲۹

محمد علی کی ادبی زندگی کا آغاز:

چودھری صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں کیا اور یہ سلسلہ بیسویں صدی کے نصف تک جاری رہا۔ صلاح الدین صاحب نے ان کی زندگی پر ایک مضمون لکھا ہے جو کہ ''ادبی دنیا'' کے خاص نمبر میں چھپا ہے۔ انہوں نے چودھری صاحب کا ذکر عبدالقادر صاحب کے ساتھ کچھ اس انداز سے کیا ہے۔

''انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے سنگم پر ہماری زبان میں دو ایسے لکھنے والے نمودار ہوئے جنہوں نے اپنے بیان کی شستگی اور اظہار کی سلاست اور ادائے مطلب کی بے مثال صلاحیتوں سے اردو کے حدود کو حدِ نظر تک پھیلا دیا ان میں ایک نام عبدالقادر کا اور دوسرا محمد علی صاحب کا ہے۔'' ۳۴

صلاح الدین صاحب نے اسی مضمون میں ایک اور جگہ پر محمد علی اور عبدالقادر کے اندازِ تحریر کی کچھ اس انداز سے تعریف کی ہے جبکہ وہ دونوں قلم کاروں کو ساتھ ساتھ لے کر چل رہے ہیں' لکھتے ہیں کہ

''اردو ادب کا کوئی سنجیدہ طالب علم عبدالقادر کی ساحرانہ سلاست سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ سہل ممتنع لکھتے ہیں اور اپنی آسان نگاری میں بڑی بڑی نازک باتیں نہایت صحت اور صفائی کے ساتھ سامنے لے آتے ہیں۔ اسی طرح محمد علی جب اپنے عروج پر پہنچتے ہیں تو بوالفضین یا امامن مہری کی زبان میں نفسیات انسانی کی وہ وہ گتھیاں سلجھا کے رکھ دیتے ہیں کہ ناظر ششدر رہ جاتا ہے۔ مطالب کے لحاظ سے دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عبدالقادر کا موضوع بیشتر خارجی ہوتا ہے اور وہ خارج سے داخل کی طرف بالعموم رجوع نہیں کرتے بلکہ اپنی بیرونی دنیا کے مسائل و مناظر ہی میں کھو جاتے ہیں۔ اس کے خلاف محمد علی اگرچہ اپنے افسانوں اور خاکوں کی بنیاد بیشتر محسوساتِ خارجی ہی پر رکھتے ہیں اور جو کچھ اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہی کچھ عین مین ہمیں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اپنے موضوع کی طرف انکی پیش قدمی خالصتاً داخلی اور نفسیاتی ہوتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ناظر کا ہاتھ پکڑے ایک نامحسوس انداز میں اسے اس دنیا کے سنگ و خشت سے نکال کر اس عالم خیال میں لے کر اتر جاتے ہیں' جس کی رنگینی حقیقت کی عریاں سادگی سے آنکھیں ملاتی ہے اور مجذوب نہیں ہوتی۔ محمد علی حقیقت پرستی اور خیال آفرینی کا ایک بے رحمانہ امتزاج پیش کرتا ہے اور از بسکہ وہ اپنے مشاہدے میں صداقت سے کبھی آنکھیں نہیں چراتا اور اپنے بیان میں تخیل کی باگیں کبھی ڈھیلی نہیں چھوڑتا اس لئے اس کا پیش کردہ امتزاج فنی ادب میں ایک نہایت صحت مند معیار کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اس معیار پر بہت کم فنکاروں کی تخلیقات پوری اترتی ہیں''۔ ۳۵

---

۳۴ ادبی دنیا خاص نمبر صفحہ ۱۴۳

۳۵ ادبی دنیا خاص نمبر صفحات ۱۴۳ تا ۱۴۴

۱۰۔ چودھری صاحب اپنے تصنیفی دور میں اپنے منشی کے ساتھ۔

چودھری صاحب نے مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھیں ہیں لیکن انکی پہلی کتاب ''اتالیق بی بی'' ہے جو کہ بقول عبدالماجد دریا آبادی کے یہ کتاب شرر صاحب کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔اس کے بعد محمد علی صاحب نے افسانہ نگار اور صاحب طرز انشا پرواز کی حیثیت سے اردو زبان و ادب میں اپنا مقام پیدا کیا۔ اور اس حد تک مشہور ہو گئے کہ بقول سرور صاحب

''جو لوگ ادب کا کچھ بھی ذوق رکھتے ہیں ان کی نظر میں چودھری صاحب ایک بے مثال ادیب تھے''۔ ۳۶

۶۔ معاصرین کے ساتھ رابطہ:

گذشتہ صدی کے آغاز میں مغلوں کا قائم کردہ اور فرنگیوں کا اپنایا ہوا تعلقہ داری نظام رائج تھا۔اس دور میں ایک تعلقہ دار نہ صرف ایک ممتاز مقام کا مالک ہوتا تھا بلکہ سماجی اور ادبی حلقوں میں بہت ہی معزز سمجھا جاتا تھا۔ گو کہ چودھری صاحب کا تعلق ایک تعلقہ دار گھرانے سے تھا لیکن ان میں کچھ ایسی صلاحیتیں اور خصوصیات موجود تھیں جنہوں نے ان کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا کیا۔ وہ ایک زندہ دل طبعیت کے انسان ہونے کے ساتھ ہی ایک صاحب طرز ادیب اور افسانہ نگار تھے۔ان کا ادب میں جو مقام تھا اس کی وجہ سے ان کے دور کے اکثر لوگ جو ادبی ذوق رکھتے تھے ان سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ بھارت کے صوبہ اودھ میں بسنے والے تقریباً تمام امیر کبیر لوگ اور ادیب حضرات ان سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔انکی بیٹی ہما بیگم لکھتی ہیں کہ

''سوشل اتنے تھے کہ یو۔پی کا شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو چودھری صاحب کو نہ جانتا ہو' دوستوں سے دوستی نبھانا اور ان کو ان کے پیٹھ پیچھے دل سے چاہنا انکا خاص حصہ ہے۔ جو دوست ان کے مر گئے ہیں ان کے لئے اس طرح روتے ہیں جیسے کوئی اپنے عزیز قریب کے لئے روتا ہے۔'' ۳۷

چند قد آور اور اہم ادبی شخصیات جنہوں نے چودھری محمد علی کی ادبی خدمات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی:

محمد علی صاحب کے معاصرین میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اردو زبان

---

۳۶ ''ہماری زبان'' ہفتہ وار نئی دہلی

۳۷ ماہنامہ ادبی دنیا خاص نمبر صفحہ ۱۳۹

کے صاحبِ طرز ادیب' نامور مصنف' عظیم دانشور' مانے ہوئے مفسر اور ماہرِ فلسفہ ونفسیات تھے۔ چودھری محمد علی اور عبدالماجد دریا آبادی صاحب ایک ہی ضلع یعنی بارہ بنکی سے تعلق رکھتے تھے اور معاشرتی اعتبار سے ایک ہی طبقہ سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں میں علمی اور ادبی ذوق بھی تقریباً مطابقت رکھتا تھا۔ افکار وخیالات خصوصاً مذہبی مکتبہ فکر میں تھوڑا سا فرق تھا۔ لیکن خلوص ومحبت' رواداری کی بنا پر آپس میں خاصی اچھی دوستی تھی۔ اور مولانا صاحب ۱۹۲۹ء میں ان کے ساتھ حج میں بھی شریک تھے جس کا ذکر مولانا نے چودھری صاحب کی وفات پر ''صدق جدید'' لکھنؤ کے ایک شمارہ میں کیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''ایک ہی جہاز سے ہم لوگ گئے ایک ہی سے واپس آئے بمبئی میں' مدینہ میں' مکہ میں ساتھ رہا' یہاں تک کہ واپسی میں ریل پر بھی'' ۳۸

مولانا اور چودھری صاحب زندگی کے آخری وقت تک اپنی دوستی نبھاتے رہے۔ لیکن چودھری صاحب کے انتقال کے وقت وہ تدفین میں شریک نہ ہو سکے شاید مولانا کو بروقت خبر نہ مل سکی تھی بعد میں تعزیت کی غرض سے ردولی تشریف لائے اور اپنے اخبار ''صدق جدید'' میں بڑے موثر انداز میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ادیب ہوں کہ طبیب' شاعر کہ اہلِ حرفہ' مولوی یا مشائخ' جس کسی بھی مجلس میں گذر جائے' میر مجلس ان کے لئے رکھی تھی۔'' ۳۹

اسی طرح ایک اور موقع پر مولانا صاحب نے محمد علی کے بارے میں کچھ اس انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ ''کمال اور شہرت لازم وملزوم نہیں' شہرت کے اسباب ہی کچھ اور ہوتے ہیں' کچھ داخلی اور اختیاری' کچھ خارجی اور غیر اختیاری' کتنے باکمال ایسے ہیں جو شہرت سے یکسر محروم رہ جاتے ہیں۔ شعر وادب کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ انہیں میں ایک مثال چودھری محمد علی کی ہے۔ ۴۰ ان تمام حوالہ جات کو پڑھ کر یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کی نظر میں چودھری محمد علی کی کیا حیثیت تھی' کتنا اونچا مقام تھا اور کتنے گہرے تعلقات تھے۔

صلاح الدین احمد:

محترم صلاح الدین احمد ماہ نامہ ''ادبی دنیا'' کے مدیر اور اپنے زمانے کے مشہور صحافی تھے۔ ادبی دنیا میں انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے ادبی مراسم چودھری محمد علی سے بہت گہرے تھے اور اس گہرائی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے چودھری صاحب کی ادبی خدمات کو اپنی بساط کے مطابق اجاگر کرنے کی کوشش کی اور ادبی حلقوں

---

۳۸ صدق جدید (ہفتہ وار) لکھنؤ۔ ۳۹ ایضاً

۴۰ مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور ان کے ادبی معاصرین' بہ حوالہ ''قومی آواز'' لکھنؤ ۶ رجنوری ۱۹۸۲ء

میں ان کو متعارف کرایا۔ ان کے متعدد مضامین کو اپنے رسالے میں چھاپا اور چودھری صاحب کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ صلاح الدین صاحب نے نہ صرف یہ کہ انکی تحریروں کو اپنے رسالے میں جگہ دی بلکہ انکی مختلف کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بھی مدد کی۔ صلاح الدین صاحب نے چودھری محمد علی پر ''کویہ دبستاں کھل گیا'' میں جو مقدمہ لکھا ہے اور جس انداز سے ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور خود ان پر ایک ناقد کی حیثیت سے طائرانہ نظر ڈالی ہے اس سے انکی تنقیدی خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود کتنے بڑے نقاد ہیں۔ صلاح الدین صاحب نے چودھری صاحب کے افسانوی مجموعوں اور خاکوں پر جو دیباچہ لکھا ہے اس کے بارے میں نیاز فتح پوری نے جو اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کچھ یوں ہے۔

''صلاح الدین نے اپنے مقدمے میں نہایت قابلیت کے ساتھ چودھری صاحب کی ادبی خصوصیات پر نظر ڈالی ہے جو بجائے خود ایک بڑا انتقادی شاہکار ہے''۔

نیاز فتح پوری:

اردو کے افسانوی ادب میں نیاز فتح پوری کا نام ایک درخشاں ستارے کے مانند چمک رہا ہے۔ یہ رومانوی افسانوں کے معمار ہیں۔ انکی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ماہ نامہ ''نگار'' کے مدیر تھے اور ادبی دنیا میں ایک اچھے نقاد کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ چودھری محمد علی کے نیاز فتح پوری سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ محمد علی کے خطوط کو پڑھنے کے بعد یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان دونوں کے مراسم کی نوعیت بڑی بے تکلفانہ تھی اور یہ بہت قریبی دوست تھے۔

نیاز صاحب ایک بہت ہی خاص زاویہ نظر کے نقاد تھے۔ انہوں نے چودھری صاحب کی علمی و ادبی حیثیت کو کافی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور چودھری محمد علی کی تصانیف پر اس خوبصورت انداز سے تبصرے کئے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا کہ ان کی نظر میں چودھری صاحب کی کیا حیثیت تھی اور کیا مقام تھا۔ نیاز صاحب نے چودھری صاحب کی تصنیف ''میرا مذہب'' پر جو تبصرہ کیا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے لکھتے ہیں کہ

''اس کتاب میں چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی نے اپنے مذہب نہیں بلکہ اپنے مشرب کو پیش کیا جس کا بیدل نے اس طرح ذکر کیا''۔ [۱]

''مشرب پروانہ از آتش نداند طور را''

---

[۱] ''کویہ دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۲۳۱

''چودھری صاحب مذہباً اثناء عشری جماعت سے تعلق رکھتے تھے' لیکن چونکہ وہ دنیا کے ہر تعلق کو انسانی و اخلاق نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اس لئے انکا مذہب بھی دراصل انسانیت پر مبنی ہے جس کا دوسرا نام میری نظر میں لا مذہبیت ہے۔۔۔۔ چودھری صاحب کا انداز تحریر سب سے انوکھا ہے وہ لکھتے نہیں بات کرتے ہیں۔ اور جس نے انہیں بات کرتے سنا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ منہ سے پھول جھڑنا کسے کہتے ہیں۔ چودھری صاحب نے اس کتاب میں تبرا۔ تاسی۔ عزاداری۔ متعہ سب ہی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور اتنے حقیقت افروز انداز میں کہ سنی اسے پڑھ کر شیعہ ہوسکتا ہے اور شیعہ سنی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد' میں دیر تک سوچا کیا کہ اگر ہر شیعہ محمد علی ہو جائے اور ہر سنی نیاز فتح پوری تو کیا ہو؟ شاید کہ دنیا بے دین اور رہنے کے قابل'' ۔۴۲

آل احمد سرور:

آل احمد سرور کا شمار اردو ادب کے مشہور نقادوں میں ہوتا ہے ان کا تعلق رومانی تنقید سے ہے۔ ان کا مزاج جمال پسند اور خوش رنگ ہے۔ کشادہ دلی' عالی نظری اور ہمدردی ان کی تنقید کے داخلی عناصر ہیں۔ انہوں نے چودھری محمد علی کی وفات پر انجمن ارباب معنیٰ' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعزیتی جلسہ میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سرور صاحب کی نظر میں چودھری محمد علی کی کیا حیثیت تھی اور وہ کس پائے کے ادیب تھے۔ ان کے ادبی کارنامے اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تعزیتی جلسہ میں جو سرور صاحب نے تقریر کی تھی اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی ملاقات چودھری محمد علی صاحب سے علمی اور ادبی حیثیت سے سب سے پہلے لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اس وقت جب چودھری صاحب اپنی کتاب ''میرا مذہب'' کا مسودہ لے کر ان کے پاس گئے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرور صاحب چودھری صاحب کے تقریباً ہر پہلو سے واقفیت رکھتے تھے۔ سرور صاحب نے چودھری صاحب کی ادبی کاوشوں پر جس طرح سے تبصرہ کیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے چودھری صاحب کی نگارشات پر گہری تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ ۴۲ (الف)

محمد طفیل:

محمد طفیل صاحب جریدہ ''نقوش'' کے مدیر تھے۔ یہ چودھری محمد علی صاحب کے قلمی دوست تھے۔ ان سے اور چودھری صاحب سے کبھی باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور ان دونوں کا رابطہ بھی علمی اور ادبی حدوں تک ہی محدود تھا۔ طفیل صاحب نے محمد علی صاحب کی بیٹی ہما بیگم سے فرمائش کی تھی کہ وہ اپنے والد پر خاکہ لکھیں اور اس خاکے کو انہوں نے اپنے ماہ

---

۴۲ گویا دبستاں کھل گیا۔ صفحہ ۲۳۲ ۴۲ (الف) ڈاکٹر انور حسین خاں' صفحہ ۴۷

نامے کے شخصیات نمبر میں شائع کیا اور اس کے مکاتیب نمبر میں چودھری صاحب کی خطوط نگاری پر ایک مضمون چھاپا ہے۔ ''نقوش'' کے ''آپ بیتی'' نمبر کیلئے چودھری صاحب نے خود طفیل صاحب کی فرمائش پر اپنے ذاتی حالات اور تصانیف کے بارے میں ایک مضمون لکھ کر بھیجا تھا جو ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''نقوش'' کے مکاتیب نمبر میں ان کا ایک خط بھی شائع ہوا ہے جو کہ انہوں نے تمکین کاظمی صاحب کو ۲۳ رمئی ۱۹۲۸ء میں لکھا تھا۔ علاوہ ازیں چودھری صاحب کا ایک افسانہ جو کہ ''تیسری جنس'' کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا' طفیل صاحب نے اپنے اس ماہنامے کے افسانہ نمبر (انتخاب ۱۸۰۱ء سے ۱۹۵۵ء تک) میں دوبارہ شائع کیا۔ اور ''نقوش کے ہی مکاتیب نمبر میں ''غلام رسول مہر'' ''ڈاکٹر سید عبداللہ'' اور ''مالک رام'' جیسی قد آور شخصیات نے چودھری صاحب کی مکتوب نگاری پر بڑے خوبصورت انداز سے خراج تحسین پیش کیا ہے اور ان لوگوں کے خیالات کو طفیل صاحب نے ہم تک پہنچایا۔

محمد علی صاحب کن اہم شخصیات سے متاثر ہوئے:

چودھری صاحب نے ارباب علم و کمال کی صحبتوں سے فیض اور رہنمائی حاصل کی۔ وہ مولانا کرامت حسین صاحب سے بہت زیادہ متاثر تھے' جس کا واضح ثبوت چودھری محمد علی کی تصنیف ''یادگار مولانا کرامت حسین'' ہے۔ وہ کرامت حسین صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے جن کی صحبت میں رہ کر انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اپنی اس کتاب میں ایک جگہ چودھری صاحب لکھتے ہیں کہ

''مجھے کام کرنے کی تمنا ہے مگر یہ چاہتا ہوں کہ کسی بڑی ذات سے اپنے کو وابستہ کر کے کام کرنے کا طریقہ سیکھوں۔ مولانا نے فوراً فرمایا کہ بسم اللہ آپ تشریف لائیے اور میرے ساتھ رہیے۔۔۔۔ جب مولانا نے شاہ نجف (لکھنؤ) کے پاس پھوس کا بنگلہ لیا میں ۱۹۱۴ء میں مولانا کے پاس حسب وعدہ بہ ارادہ قیام آ گیا۔ مولانا نے سب سے پہلے مجھے اپنی اردو تصانیف جو میرے پڑھنے کے قابل تھیں' عنایت کیں اور دو تین انگریزی کتابیں بھی پڑھنے کو بتائیں''۔[۴۳]

چودھری محمد علی صاحب اپنی اسی کتاب میں ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں کہ ''ہربرٹ اسپنسر و نیز دوسرے حکماء کی شروع کی کتابیں مولانا چاہتے تھے کہ ہر شخص پڑھ لے اور مجھ کو بھی مشورہ دیا تھا''۔[۴۴]

محمد علی عبدالماجد دریا آبادی مرحوم سے بھی بہت زیادہ متاثر تھے۔ مولانا کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں وہ

---

۴۳ ''مولانا کرامت حسین مرحوم'' صفحہ ۶

۴۴ ایضاً' صفحہ ۹

اردو زبان کے ایک صاحب طرز ادیب' نامور مصنف' عظیم دانشور اور مانے ہوئے مفسر تھے۔ ولایت حسین صاحب سے بھی متاثر تھے جن کو وہ اپنے خط مورخہ ۴/مارچ ۱۹۵۲ء میں اپنے گھر آنے کی بڑی شدومد سے دعوت دیتے اور ان کی آمد پر اصرار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''مجھ کو آپ سے ملنے کا واقعی اشتیاق ہے۔ کیونکہ باوجود احتیاطوں کے آپ آدمی مجھ کو اچھے معلوم ہوتے ہیں'' ۴۵۔ علاوہ ازیں اپنے استاد مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی سے بھی بہت متاثر تھے جن کے بارے میں انہوں نے ''ادبی دنیا'' کے مدیر صلاح الدین احمد کے نام اپنے خط مورخہ ۱۲/دسمبر ۱۹۵۱ء میں اپنے خیالات کا کچھ اس طرح اظہار کیا ہے:

''میرے استاد مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی بڑے ادیب اور مصنف تھے۔۔۔۔ میرے بچپن میں ان کی خوش بیانی' نغز گوئی' بدلہ سنجی کے ڈنکے بجے ہوئے تھے۔ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے'' ۴۵ (الف)

شاہ آفاق احمد سجادہ نشیں:

چودھری محمد علی کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے اور ردولی کے دیگر حضرات جو محمد علی صاحب سے اچھی طرح سے واقف ہیں یہ بخوبی پتہ چلتا ہے کہ شاہ آفاق احمد جو کہ چودھری صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے مگر ان کے عزیز ترین اور ہم مذاق دوست تھے جن سے چودھری صاحب کو دلی لگاؤ تھا اپنے خطوں میں محمد علی نے جہاں کہیں پر بھی شاہ آفاق صاحب کا ذکر کیا ہے اسے پڑھ کر انکی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

''آفاق بیٹا! آج کیا پروگرام ہے؟ اگر گاؤں جاتے ہو تو بہ سلامت روی و باز آئی۔ اگر گھر پر کوئی مشغلہ ہو تو چشم ما روشن دل ما شاد' اگر بیکار بیٹھے ہو تو کرم نما' وفرود آ کہ خانہ خانۂ تست''۔ ۴۶

چودھری صاحب شاہ آفاق احمد سے اپنے بیٹوں کی طرح پیار کرتے تھے' شاہ صاحب کو اگر کبھی بھی کسی کام سے ردولی سے باہر جانا پڑتا تھا تو ان کی جدائی چودھری صاحب کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتی تھی۔ ایک بار شاہ صاحب بنارس گئے چودھری صاحب نے ان کے خط کا جو جواب دیا وہ کچھ یوں تھا۔

''میری آنکھ کا نور' میرے دل کا سرور آفاق بیٹا سلمہٗ دعائیں دلی۔ تمہارا خط آیا جتنی باتیں تم نے لکھیں ہیں وہ سب میرے دل میں سما گئیں اور میرے دل کے تار انہیں باتوں سے مل گئے ہر تار انہیں سروں میں ساز دینے لگا' محبت بھی عجیب نعمت ہے کہ سینکڑوں کوس پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور ظاہر میں دیکھو تو چپ ہیں۔ میں باوجود تمہاری مفارقت کے اچھا ہوں

---

۴۵ گویا دبستان کھل گیا' صفحہ ۱۴۶۔ ۴۵ (الف) ایضاً' صفحہ ۷۱ ۴۶ ایضاً' صفحہ ۱۳۳

وجہ یہ ہے کہ از دیدہ دور از دل قریب محسوس کر رہا ہوں''۔ ۴۷ؔ

راجہ پرتھی پال سنگھ:

راجہ پرتھی پال سنگھ چودھری صاحب کے بچپن کے دوست تھے یہ سورج پور، پرگنہ دریا آباد ضلع بارہ بنکی کے تعلقہ دار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پرتھی پال سنگھ اور چودھری محمد علی نے ایک ہی اسکول یعنی'' کالون تعلقہ دار اسکول'' سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ راجہ صاحب طبیعتاً نہایت شریف النفس، سادہ لوح اور نیک انسان تھے عیش وعشرت اور آرام آسائش سے پلنے کے باوجود انکا رجحان مذہب اور روحانیت کی طرف زیادہ تھا۔ اپنی بیگم کے انتقال کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی اور تمام زندگی ایسے ہی گزار دی۔ چودھری صاحب کو راجہ پرتھی پال سنگھ سے بڑی محبت تھی۔ جب محمد علی صاحب نے اپنے بچپن کے دوست کے انتقال کی خبر سنی تو انہوں نے اپنے عزیز دوست کو خراجِ عقیدت ایک خاکے کی شکل میں پیش کیا۔ اور یہ خاکہ جس کا عنوان'' راجہ پرتھی پال سنگھ'' ہے ان کے افسانوں کے مجموعے'' کشکول محمد علی شاہ فقیر'' میں چھپا ہے، جو پڑھنے کے لائق ہے۔

شیخ ولایت علی قدوائی بمبوق:

شیخ ولایت علی قدوائی سے چودھری صاحب کے بہت اچھے مراسم تھے۔ چودھری صاحب انکے بارے میں اپنی تصنیف'' میرا مذہب'' میں کچھ اس انداز سے لکھتے ہیں جس کو پڑھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیخ ولایت علی قدوائی بمبوق بڑے ذی علم اور صاحبِ فکر انسان تھے۔

'' میرے ایک دوست یک رنگ اور بڑے قابل آدمی شیخ ولایت علی قدوائی مرحوم تھے۔ ان کی صحبت میں یہ باتیں اور چمک اٹھیں اور دوسرے پہلو سے بھی میرے اوپر ان مرحوم کا بہت اثر ہوا''۔ ۴۸ؔ

'' میرا مذہب'' میں ہی چودھری صاحب نے ولایت علی کے بارے میں مزید لکھا ہے کہ

'' ولایت علی مرحوم کی صحبت میں مجھ کو ڈیموکریسی کی خوبیاں معلوم ہونے لگیں۔ خیالات جو بچپن سے انگریزی کی طرف راغب تھے اس میں فرق آنے لگا''۔ ۴۹ؔ

مذکورہ بالا شخصیات کے علاوہ بھی محمد علی صاحب کے اور بہت سے دوست احباب تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی

۴۷ؔ '' تنقیدی مطالعے'' از شارب ردولوی، صفحہ ۲۱۳

۴۸ؔ میرا مذہب، صفحہ ۱۸ ۴۹ؔ ایضاً، صفحہ ۱۹

شخصیت ہی سحر کن تھی۔ ہر کوئی ان کا دوست بن جاتا تھا۔ وہ زندہ دل' بذلہ سنج اور نہایت وسیع معلومات رکھنے والے شخص تھے اور اسی وجہ سے ہر محفل میں میر محفل بن جاتے تھے۔ انکے خطوط کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو اپنے دوست احباب کی بڑی فکر رہتی تھی اور دوستوں سے ملاقات کرنے کا بے حد شوق رہتا تھا لوگوں سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ان کے خطوں سے نیز انکے قریبی عزیز و اقارب سے چودھری صاحب کے مذکورۂ بالا دوست و احباب کے علاوہ بھی جن لوگوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

ڈاکٹر حسین ظہیر' محبوب عالم' مولانا حمایت الحسن' ڈپٹی بدرالحسن' چودھری نہال سنگھ' چودھری نعمت اللہ' خواجہ غلام السیدین' مرزا محمد وصی' عزیز صاحب وکیل' ہمایوں مرزا' محسن علی' میجر سید ابوجعفر' راجہ صاحب سلیم پور' خورشید صاحب' عسکر یار جنگ' مولانا عابد شبر' مولانا ابوالحسن ہاشمی' ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی' ہاشم صاحب وغیرہ۔

ترقی پسند مصنفین کی منتخب شخصیت:

دور جدید میں اردو ادب کی ایک نام ور شخصیت' سید سجاد ظہیر نے اپنی تصنیف ''روشنائی'' میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس جو کہ ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی زیر صدارت رفاہ عام کلب لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی اس کے متعلق تحریر کرتے ہوئے چودھری محمد علی کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

''یوں تو چودھری صاحب تعلقہ دار ہیں اور اودھ کے رؤسا میں سے ہیں۔ اور وہ ہم سے ایک نسل پہلے کے فرد ہیں لیکن ان کی ذات میں کچھ عجیب خصلتیں جمع ہو گئیں ہیں۔ جنکی وجہ سے انکی شخصیت سرزمین اودھ کی دلچسپ ترین شخصیتوں میں سے ایک ہے۔ ان کے اخلاق و آداب اودھ کے قدیم رئیسوں کی طرح ہیں۔ لیکن ان کی صورت' ڈاڑھی' مونچھ صاف' گورا چٹا رنگ' جدید انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سی ہے۔ وہ اردو لکھتے ہیں تو اس میں وہ لوچ اور لطافت' طنز و تفنن ہوتا ہے جس سے پرانے لکھنؤ کی مہک آتی ہے لیکن باتیں کرنے پر آجاتے ہیں تو نٹشے اور مارکس' ٹیگور اور اقبال ایک طرف' تو جنسیات اور نفسیات کے ماہرین فرائڈ اور ہیولاک دوسری طرف ان کی زد میں ہوتے ہیں۔ بزرگوں اور بڑوں کے درمیان ہوتے ہیں تو ان سے آخرت' جائداد اور ان کی اولاد کا تذکرہ کریں گے اور نوجوانوں میں ہونگے تو جنسیات کے مسائل پر ایسی محققانہ باتیں کرینگے کہ بڑے بڑے رنگین مزاجوں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ اگر کسی محفل میں خوبصورت عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کا مجمع ہو تو وہ ان کے جھنڈ میں یوں پہنچ جاتے ہیں جیسے لوہا مقناطیس سے کھینچتا ہے اور پل بھر میں اپنی اجنبیت کو کھو کر ان سے ایسی رازدارانہ باتیں کرنے لگتے ہیں' جو صرف راجہ اندر اپنی پریوں سے کرتے ہونگے۔ نوجوان ترقی پسندوں کو وہ ہمیشہ

شفقت اور ہمدردی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ اردو ادب کی بہترین روایات سے واقف اور ایک لطیف طرز تحریر کے مالک تھے اور جدید ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے''۔ ۵۰

چودھری صاحب سے متعلق سجاد ظہیر کی لکھی ہوئی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی صدارت کے لئے محمد علی ردولوی کو ترقی پسند مصنفین کے باہمی مشورہ کے بعد سب سے موزوں شخصیت سمجھا گیا۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاسیسی کانفرنس لکھنؤ کے رفاہِ عام کلب میں منعقد ہوئی استقبالیہ کمیٹی کے صدر چودھری محمد علی ردولی تھے۔ جب چودھری صاحب نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا تو انہوں نے اس طرح کہا ''ترقی پسند تحریک نے ہم جیسے لوگوں کے لئے جو بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں کایا کلپ کا کام کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کو پر بہار بنانے کے لئے ہم بھی ابھی بہت کچھ کر سکتے ہیں''۔ ۵۰ (الف) انہوں نے نوجوان ترقی پسندوں کی حقائق شناسی اور ان کے جوش جذبہ کی بہت تعریف کی۔

۷۔ سماجی خدمات، ملازمت اور مذہبی رجحانات:

چودھری صاحب جاگیردارانہ نظام کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اس نظام میں سماج کے دو طبقے ہوتے تھے ایک وہ طبقہ جو حاکم تھا اور دوسرا وہ طبقہ جو محکوم کہلاتا تھا۔ حاکم طبقے میں اشراف و رؤسا کا شمار ہوتا تھا اور محکوم طبقے میں کسان، مزدور اور دوسرے نوکر پیشہ لوگ شامل تھے۔ حاکم طبقہ مساوات کا بالکل قائل نہ تھا۔ تعلقہ داران اعلیٰ طبقے میں نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک ہوتے تھے۔ احساسِ عظمت کے پیشِ نظر ایک تعلقہ دار عوام سے زیادہ ربط وضبط اور بے تکلفی کو کسرِ شان سمجھتا تھا۔ چودھری محمد علی تعلقہ دار تو ضرور تھے مگر دوسرے تعلقہ داروں کی طرح صرف اپنی تعلقہ داری تک محدود نہ تھے بلکہ حد درجہ علمی اور ادبی صلاحیتوں، وسیع تجربہ اور بلند پروازی افکار نے انہیں انسانیت کا صالح وصحت مند تصور اور زندگی کے بارے میں ایک مثبت زاویہ نظر بخشا تھا۔

محمد علی نے جہاں علم وادب کی شاندار اور قابلِ قدر خدمات انجام دیں وہیں انہیں سماجی معاملات سے بھی بہت دلچسپی تھی وہ سماجی خدمات کے مواقع تلاش کرتے رہتے تھے۔ اپنے آسامیوں اور مزارعوں کی مدد بھی کرتے تھے۔ میرے شوہر ڈاکٹر مصطفیٰ شمیل اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتے ہیں کہ ۱۹۵۰ء میں وہ چھٹی جماعت کے طالب علم تھے۔ ایک روز اپنی والدہ کے ہمراہ چودھری صاحب کے گھر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا ایک ہم جماعت چودھری صاحب کے گھر کے صحن میں

---

۵۰ ''روشنائی''، از سجاد ظہیر، صفحات ۸۳ تا ۸۴

۵۰ (الف) منزلیں گرد کے مانند، صفحہ ۱۵۶

بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ وہ چودھری صاحب کے ایک مزارعہ کا بیٹا ہے۔ چونکہ اس کا گھر دور دراز گاؤں میں واقع تھا لہذا چودھری صاحب نے اسے اپنے گھر میں رکھ لیا تھا جہاں وہ گھر کے ایک فرد کی طرح مقیم تھا۔

چودھری محمد علی نے جو سماجی خدمات کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اس کے بارے میں چودھری سید علی محمد زیدی نے اپنی تصنیف ''اپنی یادیں رودولی کی باتیں'' میں کچھ اس انداز سے لکھا ہے۔

''سوشل امور سے بے حد دلچسپی تھی۔ چنانچہ زوجہ اولیٰ کے انتقال کے بعد مرحومہ کے نام سے سرکاری اسپتال میں ''عابدہ وارڈ'' بنوادیا تاکہ مریضوں کے رہنے میں آسانی ہو۔ ۱۹۲۷ء میں ایک لیدر اسکول قائم کیا۔۔۔۔ جس میں لڑکوں کو جوتا' سوٹ کیس وغیرہ بنانے کی تربیت دی جاتی تھی۔۔۔۔ کافی عرصہ تک آنریری اسسٹنٹ کلکٹر' آنریری مجسٹریٹ رہے۔ تعلقہ داروں کی انجمن کی سیٹ سے دوبار کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ دوران ممبری ملک کی کافی خدمت کی۔ بہترین مقرر ہونے کی وجہ سے کونسل کی ہر پارٹی میں آپ کا رسوخ تھا''۔ ۵۱

محمد علی نے خدمتِ خلق کے سلسلے میں جو ہومیو پیتھک طریقہ علاج کا سلسلہ قائم کیا تھا اس کے بارے میں ہما بیگم کچھ اس انداز سے لکھتی ہیں۔

''گاؤں کے اسامیوں کے لئے مطب ہر وقت کھلا رہتا تھا' چاہے کوئی دوپہر کو ان کے آرام کے وقت آئے جب بھی فوراً اس کو بلا کر دوا دیتے اور تسلی و تشفی سے بھی مطمئن کرتے۔ وہ اپنے اسامیوں کا بڑا خیال رکھتے تھے ہر ایک کی دلجوئی کرتے ان کے لڑائی جھگڑوں کے معاملات بڑے انصاف اور سمجھداری سے سلجھاتے تھے۔ چودھری صاحب میں دوسروں کے چھوٹے سے چھوٹے جذبات بھی پورے طور سے سمجھ لینے کی پوری اہلیت تھی''۔ ۵۲

ملازمت:

چودھری محمد علی آزاد طبعیت کے انسان تھے ملازمت کی پابندی انکے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ مگر ان میں وقت کے تقاضوں اور خیالات کی تبدیلیوں کو سمجھنے کی صلاحیت تھی۔ اسکے علاوہ طرح طرح کے تجربات حاصل کرنے کا بھی شوق تھا۔ انہوں نے اپنی طبعیت کے برخلاف ایک مرتبہ بینک کی ملازمت کی تھی۔ اس کا حال ہما بیگم نے کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے۔ ''ایک مرتبہ جوانی میں شوقیہ بینک میں نوکری کی تھی مگر وہ گاڑی چلی نہیں۔ طبعیت کے خلاف حساب کتاب کا کام اور کسی کی پابندی یہ ان کے ضمیر میں ہی نہ تھا بیمار ہو گئے چھوڑ کر گھر چلے گئے''۔ ۵۳

---

۵۱ اپنی یادیں رودولی کی باتیں' صفحات ۲۶۰ تا ۲۶۱

۵۲ ''ادبی دنیا'' خاص نمبر صفحہ ۱۴۱

۵۳ ''ادبی دنیا'' خاص نمبر صفحہ ۱۳۹

مذہب:

چودھری صاحب اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ انہوں نے اسلام کو سمجھا ہے اور تاریخی واقعات کی روشنی میں حقیقت کا ادراک کیا ہے اور نہایت غور وفکر کے بعد یہ نتیجہ اخز کیا ہے انہوں نے اپنی تحریر کردہ کتاب ''میرا مذہب'' میں یہ آرزو کی کہ

''کاش اس رسالہ سے واعتصوا بحبل اللہ جمیعاً ولاتفرقوا'' کی صورت بندھ جاتی مگر افسوس یہ سعادت میری تقدیر میں نہ تھی۔ اس چیز کا خواب میں نے ہمیشہ دیکھا''۔ ۴؎

میرا مذہب نامی کتاب کی اشاعت کے بعد محمد علی صاحب کے مذہبی خیالات وافکار پر شیعہ سنی دونوں فرقوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں اور ان پر ایسے ایسے الزامات عائد ہوئے جن سے وہ بچنا چاہتے تھے انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے جو کہ منیجر صاحب کے نام ہے۔

''میرے دل کو شیعہ یا سنی کہے جانے سے تسکین نہیں ہوتی۔ اور جس جذبے سے تسکین ہوتی ہے وہ نصیب نہیں۔ یعنی مجھ کو ارباب فہم بےقوف کہیں، جاہل کہیں، گنہ گار کہیں مگر مسلمان سمجھیں۔ غضب تو یہ ہے کہ کوئی متعصب شیعہ کہتا ہے، کوئی سنیوں کا خوشامدی کہتا ہے، کوئی ڈھل مل یقین کہتا ہے، کوئی دہریہ کہتا؟ مگر مسلمان کوئی نہیں کہتا''۔ ۵؎

چودھری صاحب ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ

''ذری یار دخدا لگتی کہو اگر میں آئمہ علیہم السلام کی جگہ دل میں رکھتا ہوں تو شیعہ کب ہوگیا۔ اگر میں حضرت ابوبکرؓ کا معتریف ہوں تو سنی کیسے ہوگیا''۔ ٦؎

چودھری صاحب کو اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کے مذہبی خیالات کا عام لوگوں پر کیا اثر ہے اور لوگ انکے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ مذکورہء بالا جو خط انہوں نے منیجر صاحب کو لکھا ہے اسی میں آگے چل کر عبدالماجد دریا آبادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''اکثر لوگوں نے اسی طرح کا شک اس گہنہ گار پر کیا ہے جیسے جناب نے فرمایا۔ اس کی شکایت اگر مجھ کو اپنے عنایت فرماؤں سے ہوتی تو میں اپنے کو حق بجانب جانتا۔ مولوی عبدالماجد دریا آبادی نے تو غضب کیا، انہوں نے لکھا ہے کہ محمد علی کہتا ہے کہ میں سنی یا شیعہ نہیں ہوں۔ اس میں پچاس سیکڑہ وہ کامیاب ہوا، یعنی شیعہ تو اس کو اپنے گروہ سے الگ سمجھیں گے مگر سنی اس کو شیعہ ہی جانیں گے۔ اور اس کی ذمہ داری خود محمد علی ہی پر ہے کیونکہ اس نے خلافت کا مسئلہ چھیڑ دیا، یعنی ان کا

۴؎ میرا مذہب، صفحہ ۲

۵؎ گویا دبستان کھل گیا۔ صفحہ ۱۰۳ ٦؎ ایضاً، صفحہ ۱۰۵

مطلب یہ نکلا کہ اخلاقی باتیں اگر میں نہ چھیڑتا تو سنی مجھ سے زیادہ خوش ہوتے۔ گویا میں نے یہ کتاب صرف سنیوں کو خوش کرنے کے لئے لکھی تھی۔ اکثر حضرات اہلِ سنت کا یہی خیال ہے کہ خلافت کا ذکر فضول ہے۔ میرے خیال میں اس وجہ سے کہ اس معاملہ میں ان کی کور دبتی ہے۔ فقہی مسائل میں میرا رجحان شیعوں کی طرف زیادہ ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ شیعوں کا مسلک ہے بلکہ اس وجہ سے کہ میرے خیال میں قرآن کا مسلک ہے' مگر اس کے بعد بھی میں اپنے کو شیعہ نہیں کہتا مگر جس گروہ میں پیدا ہوا جس گروہ میں پروان چڑھا اس کی محبت دل سے نہیں جاتی''۔ ۵۷

محمد علی نے اپنے مذہبی خیالات کا اظہار بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی تصنیف ''میرا مذہب'' میں کیا ہے۔ اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے ہی محمد علی صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کا اثر دونوں فرقوں پر کیا پڑے گا انہوں نے اپنے ایک خط میں اس طرح سے اظہار کیا ہے۔

''میرا مذہب اگر یہ چھپ گیا تو شیعہ سنی دونوں مجھ کو گالیاں دیں گے اور ایک نیا فرقہ پیدا ہو جائے گا''۔ ۵۸

ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا انتہائی مناسب ہوگا کہ محمد علی صاحب اپنے مخصوص نظریہ کے ساتھ اثنا عشری جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔

ان کے مذہب کے بارے میں انکے نواسے یعنی ہما بیگم کے چھوٹے صاحب زادے' سید علی کاظم اس طرح سے رقمطراز ہیں۔

''مذہبی تنازعات سے ہمیشہ دور رہے۔ ان کے مذہب کے بارے میں اکثر چہ میگوئیاں ہوتی رہتیں۔ اس کے پیش نظر انہوں نے ایک کتاب لکھی ''میرا مذہب'' جس میں دونوں فرقوں پر تنقید کی گئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو صرف مسلمان کہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی شیعہ نے آپ سے دریافت کیا سنا ہے آپ سنی ہو گئے۔ انہوں نے برجستہ جواب دیا۔ ''اگر مجھے سنی ہونا ہوتا تو میں شیعہ ہی کیوں نہ رہتا۔ اس سے ان کے مذہبی خیالات کا قدرے اندازہ ہوتا ہے''۔ ۵۹

خلیق ابراہیم خلیق چودھری محمد علی ردولوی کے مذہبی عقائد کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''میرا مذہب'' کے نام سے انہوں نے ایک کتاب بھی تحریر کی تھی جو مذہبی مسائل میں ان کی آزادانہ فکر کی غماز ہے۔ مذہبی عقائد کے اختلاف کی بنیاد پر انسانوں میں کسی تفریق اور امتیاز کے قطعاً قائل نہیں تھے۔ ۵۹ (الف)

---

۵۷ کو یاد بستاں کہل گیا' صفحات ۱۰۵ تا ۱۰۶
۵۸ ایضاً صفحہ ۱۳۶
۵۹ ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' صفحہ س
۵۹ (الف) ''منزلیں گرد کے مانند'' صفحات ۱۲۸ تا ۱۲۹

سفرِ حج :

محمد علی صاحب نے اپنی پہلی بیگم کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس سفر کے بارے میں انہوں نے اپنی کتاب ''میرا مذہب'' میں تفصیل سے لکھا ہے۔ مگر انکی بیٹی ہما بیگم نے چودھری صاحب پر جو خاکہ لکھا ہے اس میں وہ کچھ اس انداز سے رقمطراز ہیں۔

''۱۹۳۰ء میں میری والدہ مرحومہ حج کو جانے والی تھیں چودھری صاحب کو کبھی سوتے جاگتے اس کا خیال نہیں آتا تھا کہ وہ بھی حج کو جائیں خود میری والدہ کے جانے کے خلاف تھے۔ کہا کرتے تھے کہ حج کے سفر کی صعوبات تم برداشت نہ کر سکو گی' مر جاؤ گی۔ لیکن میری والدہ کو حج اور مدینہ منورہ کی ایسی لو لگی تھی کہ انہوں نے چودھری صاحب کی بات نہ مانی اور حج کو روانہ ہو گئیں۔ ادھر والدہ کا حج کے لئے جانا ادھر چودھری صاحب کی بے چینی نا قابل برداشت ہو گئی۔ آخر کار بمبئی سے حاجیوں کا جہاز روانہ ہونے سے دو دن پہلے تار دیا کہ میں بھی آ رہا ہوں جہاز میں سیٹ بک کروالو اور صرف دو جوڑے کپڑے لے کر وہ بھی بے جوڑ بیوی کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ وہاں جہاز میں سیٹیں بک ہو چکی تھیں ایک بھی خالی نہ تھی۔ لیکن آخر وقت کوئی اور محمد علی تھے جنہوں نے اپنے لئے سیٹ ریزرو کروائی تھی اور وہ کسی وجہ سے نہ پہنچ سکتے تھے' وہ ان کو مل گئی۔ گئے حج کیا اور بڑے دل سے کیا۔ آج تک مدینہ منورہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر زار و قطار روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''بیوی کے طفیل میں حج نصیب ہو گیا''۔ [۶۰]

ہما بیگم نے چودھری صاحب کا سفرِ حج ۱۹۳۰ء بتایا ہے جبکہ چودھری صاحب نے ۱۹۲۹ء میں حج کیا تھا۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ عابدہ بیگم کا انتقال ۲۱ر جولائی ۱۹۲۹ء میں ہوا تھا (صدقِ جدید ہفتہ وار لکھنؤ)۔

چودھری صاحب نے حج کے سفر کے بارے میں ''میرا مذہب'' میں کچھ اس طرح سے لکھا ہے'

''لوگوں نے مجھ سے پوچھا ''تم بھی حج کو جاتے ہو'' میں نے کہا میں کہاں جاؤں گا'' مرحومہ کے جانے کے بعد رات کو خیال ہوا ''محمد علی اچھا موقع ہے''۔ دل میں بی بی کے دیکھنے کا بھی خیال تھا مگر اس کے ساتھ یہ خیال کہ ایسا مبارک موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔۔۔ دل نے کہا اگر آج نکل چلو تو خوب ہو۔ نہیں تو پھر مدینہ کی زیارت نصیب نہ ہو گی۔۔۔۔ مدینہ طیبہ کا کیا کہنا مگر بیان کی کوئی حد بھی ہونی چاہئے۔۔۔۔ بہر حال کچھ غیر مکمل کپڑے اور کچھ غیر مکمل زادِ سفر لیکر نکل تو کھڑا ہوا مگر دل میں کہتا تھا کہ محمد علی تم ملحد' بے ایمان تم کو اس دربار میں باریابی کیسے مل سکتی ہے۔ پہلی ٹھوکر تو یہ لگی کہ لکھنؤ پہنچ کر یہ

۶۰۔ ادبی دنیا خاص نمبر' صفحات ۱۴۱ تا ۱۴۲

پتہ چلا کہ بجائے نئے کپڑوں کے پرانے کپڑوں کی گٹھری اٹھالایا ہوں اور بجائے نئے پائجاموں کے بیاہ شادی کے دسترخوان کی پوٹ باندھ لایا ہوں۔ مگر میں ریل پر سوار ہو ہی گیا جھانسی میں ریل چھوٹ گئی۔ میرے ہم وطن اور بچپن کے یار مولوی بدرالحسن صاحب وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے' ان کے یہاں ٹک گیا۔ دل نے کہا اس روک ٹوک کا مقابلہ تم کب تک کر سکتے ہو۔ مگر میں دوسرے دن بمبئی چل ہی دیا۔ وہاں بی بی سے ملاقات ہوئی مسکرا کر کہنے لگیں ''ہم کو رخصت کرنے چلے آئے'' میں نے کہا ہم بھی چلیں گے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں ''تم اور حج'' ۔۔۔ سب لوگ ٹکٹ خرید چکے تھے اب ہم ٹکٹ لینے چلے۔ دفتر میں معلوم ہوا کہ فرسٹ اور سیکنڈ کسی میں بھی جگہ باقی نہیں ۔۔۔ اگلے جہاز کا انتظار کرنے میں ''بڑھیا کے نکاح میں سو سو دھوکے'' ۔۔۔ اتنے میں اسی جہاز کے وسیع دفتر میں ایک طرف سے آواز آئی۔ ''محمد علی کے تار کا جواب آیا؟'' میں نے کان کھڑے کئے۔ معلوم ہوا کہ کوئی محمد علی ہیں ردولی کے انہوں نے اپنی بی بی کے لئے ایک فرسٹ کلاس رزرو کروایا تھا ان کو تار دیا گیا تھا کہ تمہارا رزرو اس وقت تک موجود ہے اطلاع دو کہ تمہاری بی بی جائیں گی کہ نہیں۔

ہوا یہ تھا کہ میں نے رزرویشن کے لئے لکھا تھا اور جواب بھی آیا تھا کہ روپیہ بھیج دو۔ مگر جو لوگ حج کر آئے تھے انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ تاریخ روانگی بدل جائے یا اور کوئی آفت آ جائے پہلے سے روپیہ کیوں بھیجو۔ جگہ وافر ہوتی ہے اور ہر وقت مل جاتی ہے۔ چنانچہ میری بی بی نے وہاں پہنچ کر اپنا ٹکٹ خرید لیا تھا اور میری تحریر پر جو جگہ مقرر کر دی تھی وہ الگ باقی رہی ۔۔۔ مگر مجھ کو اپنے اعمال کی بناء پر اب بھی دھڑکا رہا کہ تم چلے بھی گئے تو راستہ میں مرتے کتنی دیر لگتی ہے۔ میری منطق یہ تھی کہ اللہ میاں کسی میرے ایسے آدمی کے لئے اگر مجھ سے مشورہ لیتے تو ایمانداری سے مجھ کو کہنا پڑتا۔ بارالہا۔ اس مردود کو اس پاک سرزمین پر قدم نہ رکھنے دے۔ ارے میں نے کوئی گلا نہیں کاٹا تھا لیکن اپنی حرکتوں سے ڈرا ہوا تھا۔ مگر اللہ میاں اور بندے میں جو فرق ہے آپ جانتے ہی ہیں۔ ہم بھی پہنچ گئے ۔۔۔ ہم معلم صاحب کی دھوکہ بازی میں آ کر مکہ معظمہ چلے آئے اور عمرہ کیا۔ اس کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور پھر واپس آ کر حج کیا''۔[۲۱] ان کی دوسری بیوی قیصر بیگم نے اکیلے حج ۱۹۵۱ء میں ادا کیا اور چودھری صاحب اپنی علالت کے سبب ان کے ہمراہ نہ جا سکے۔ اس بات کا تذکرہ چودھری صاحب نے ولایت حسین صاحب کے نام اپنے خط مورخہ ۴ مارچ ۱۹۵۲ء میں کیا ہے۔ ۲۱ (الف)

۸۔ خامیاں' تقریری صلاحیت اور وفات:

ہر انسان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی عام انسان ہونے کی وجہ سے چودھری محمد علی میں خامیاں بھی

---

۲۱ میرا مذہب' صفحات ۲۲ تا ۲۹ ۲۱ (الف) گویا دبستان کھل گیا۔ صفحہ ۱۴۶

تھیں انکے نواسے سید علی کاظم نے انکے مصائب و محاسن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

''ایک عام انسان ہونے کی حیثیت سے چودھری محمد علی میں خامیاں بھی تھیں۔۔۔۔ عورت ان کی خاص کمزوری تھی جس کا انہوں نے اپنی تحریروں میں جابجا اعتراف کیا ہے۔ ان کے مزاج میں غصہ بھی کافی تھا۔ ذرا سی کوئی بات خلاف طبع ہوئی اور وہ فوراً طیش میں آ جاتے۔ بنیادی طور پر ان کے مزاج میں تعلقدارانہ ذہنیت کارفرما تھی۔ چودھری صاحب کو اپنی خامیوں کا احساس تھا لیکن اپنے مصائب کی پردہ پوشی انہیں گوارہ نہ تھی' اپنے اوپر وہ ہنسنا بھی جانتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی خامیوں کے باوجود لوگوں نے انہیں قبول کیا۔ بالخصوص غریب طبقے نے جن کے علاج و معالجے کے لئے انہوں نے ہومیو پیتھک کلینک قائم کیا تھا' جس میں مریضوں کا علاج مفت کیا جاتا''۔٦٢

ہما بیگم لکھتی ہیں کہ

''اگر کبھی نوکروں پر غصہ آیا تو ان کو مارا بھی مگر بعد کو جب غصہ اتر جاتا تو اس سے معافی مانگتے اور انعام دیتے''۔٦٣

''خلاف مزاج بات پر غصہ بھی ایسا آتا تھا کہ الامان الحفیظ' پکی پکائی ہانڈیاں سب ایک ایک کر کے نالیوں میں اوندھا دیتے تھے کہ نہ خود کھانا کھاؤں گا اور نہ کسی کو گھر بھر میں کھانے دونگا۔۔۔۔ علاوہ اس کے ان کے مخاطب نے اگر باتوں میں بیوقوفی کو دخل دیا' یا کسی بھلے چنگے مریض نے ان کے سوال کا حماقت آمیز جواب دیا اور بہت فاش نا سمجھی کی تو چودھری صاحب کا Sense of humour غصے کا عکس لئے اس شامت کے مارے مخاطب کو ایسی ایسی چوکس جھکائیاں دیتا تھا کہ دور سے جو سنے اس کے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں اور جس پر گزرے اس غریب سے دھرے اٹھائے نہ بنے''۔٦٤

اور اس ضمن میں میرے شوہر ڈاکٹر مصطفیٰ شمیل اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتے ہیں جو کہ ۱۹۵۱ء سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے موتی بخار میں مبتلا ہونے کے باعث چودھری صاحب کو دکھایا۔ انہوں نے دوا تجویز کی۔ چند روز دوا کھانے کے بعد دوبارہ دکھانے گئے مگر نسخہ لیجانا بھول گئے جس پر چودھری صاحب نے ناراض ہو کر واپس بھیج دیا۔ ان کا گھر وہاں سے دور تھا' راستے میں کوئی بزرگ ملے جنہوں نے دلاسہ دلایا کہ میرے ساتھ چلو چودھری صاحب میری وجہ سے تم کو بغیر نسخے کے دیکھ لینگے۔ مگر چودھری صاحب غصہ سے آگ بگولا ہو گئے' چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ ان بزرگ نے سمجھانے کی کوشش کی کہ بچہ ہے نسخہ بھول گیا ہے تو چودھری صاحب نے ڈانٹ کر دونوں کو بھگا دیا۔ بیگم انیس قدوائی نے بھی چند شخصیات پر مشتمل کتاب ''اب جنکے دیکھنے کو'' میں چودھری محمد علی صاحب کی رنگین مزاجی اور مے نوشی کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے ''سرخ و سفید رنگ' خوب گھنی سیاہ بڑی

---

٦٢ کشکول' صفحہ ع

٦٣ ادبی دنیا خاص نمبر' صفحہ ۱۴۱

٦٤ ایضاً' صفحہ ۱۴۰

بڑی مونچھیں۔ململ کا کرتا' اس پر انگرکھا۔ بڑی مہری کا لٹھے کا پاجامہ' کبھی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ۔ ایک شاندار ملازم ساتھ' لڈوؤں کی ہانڈی' شراب کی بوتلیں اور سوڈے کا کیس تھامے ہوئے' بڑے بے تکلفانہ انداز میں پھاٹک سے داخل ہوتے''۔ ۶۵

چودھری سید علی محمد زیدی انکے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''چودھری محمد علی صاحب آخر عمر میں ان تمام آلودگیوں سے پاک ہو گئے تھے' مذہب کی طرف عملاً مائل ہو کر نماز شروع کر دی تھی۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص جس کا نام تفضل تھا' اس خدمت پر مامور کیا تھا کہ وہ چودھری صاحب کی نماز وغیرہ کی نگرانی کرتا رہے' جس سے کسی قسم کی غلطی یا بھول کا اندیشہ نہ رہے''۔ ۶۶

بہترین مقرر:

سید شاہ سفیر احمد اشرفی صاحب نے اپنی کتاب ''اشرف التواریخ'' میں چودھری محمد علی کی تقریری صلاحیتوں کا ذکر اس طرح سے کیا ہے۔

''چودھری صاحب عرصہ تک انجمن تعلقدارانِ اودھ کی نمائندگی میں ایم' ایل' سی بھی رہے اس سلسلے میں ایک پر لطف قصہ بھی یاد آیا جو حکایت در حکایت ہے۔ ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء میں میونسپل بورڈ لکھنؤ نے یہ طے کیا کہ طبقہ ارباب نشاط بہ لحاظ پیشہ مذموم ہے لہذا شہر بدر کیا جائے' بہ اتفاق طے ہو گیا۔ یہ مسودہ کونسل میں بھی گیا اس وقت صرف کونسل ہی تھی' اسمبلی نہ تھی وہاں مباحثہ کے لئے پیش ہوا اس وقت یو۔ پی کے ہر ضلع سے چیدہ و خاص لوگ منتخب ہو کر آتے تھے جس میں مغربی اخلاع سے نوابین چھتاری' بھیگم پور و باغپت وغیرہ جن کی آرائش و زیبائش بھی خوب ہوئی تھی اور حسنِ کلام' انداز بیان' طرز تخاطب' طوطی خوش بیان و بلبل ہزار داستان جیسا موثر و دلکش مگر بات ایسی کہ لب کشائی مشکل' کوئی کیا کہے اور کیسے بولے' رنڈیوں کی حمایت اور بھری محفل میں جو واقعی ادبستان تھا' کیوں کر کوئی کرتا مگر چودھری محمد علی اٹھے اور بڑی جامعیت و خاص انداز سے بل کی مخالفت میں تقریر کی' جس سے سبھی متاثر ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ صنف نازک ہے اس پر اس قسم کا حملہ کرنا شیشے کو چور کرنا ہے اس کی زیبائش بھی ٹوٹنے سے ختم ہو اور چور ہونے سے اثرات مکلف و مہلک رونما ہوں' یہ وہی طبقہ ہے جو ادب و سلیقہ میں ایسا ممتاز تھا' کبھی امراء اور رؤساء کے بچے ان کی تربیت میں دیئے جاتے تھے تاکہ ان کو عمدہ تہذیب' نفیس سلیقہ اور بہترین ادب سکھلایا جائے۔۔۔۔ رنڈیوں کی اس آزاد حمایت کا اثر ہوا' محفل بھڑک اٹھی اور بہ اتفاق تجویز مسترد

---

۶۵ ''اب جنکے دیکھنے کو'' صفحہ ۵۳

۶۶ بہ روایت چودھری علی محمد زیدی

ہوگئی''۔ ۶۷

چودھری سید علی محمد زیدی اپنی تصنیف ''اپنی یادیں رودولی کی باتیں'' میں چودھری صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''بہترین مقرر ہونے کی وجہ سے کونسل کی ہر پارٹی میں آپ کا رسوخ تھا''۔ ۶۸

بقول خلیق ابراہیم خلیق' چودھری محمد علی ردولوی ''تحریر کے علاوہ وہ گفتگو کے فن میں بھی اپنی نظیر آپ تھے۔ صحبتوں اور نشستوں میں بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں کے ایسے ایسے دریا بہاتے تھے جن کی گہرائی اور پاٹ سمندر کو آنکھیں دکھاتا تھا''۔ ۶۹

وفات:

محمد علی صاحب کی وفات سے کچھ پہلے انکی بیٹی ہما بیگم نے ادبی دنیا کے خاص نمبر میں اپنے تاثرات کچھ اس انداز سے بیان کئے ہیں۔

''بلڈ پریشر ان کے تھا ہی۔ حقہ چھوٹا' تفکرات بڑھے' تکلیفیں بڑھیں۔ جنوری ۱۹۵۴ء کے قریب فالج گرا۔ اب پہلے سے بہتر ہیں مگر وہ کہاں۔ باتیں البتہ وہی ہیں۔ بشرطیکہ پرانے احباب یا ہم لوگوں میں سے کوئی موجود ہو۔ ع پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار!''۔ ۷۰

چودھری صاحب کی وفات کے سلسلے میں مختلف لوگوں نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں انکے قریبی دوست اور ہم وطن سید علی محمد زیدی نے اپنی کتاب ''اپنی یادیں رودولی کی باتیں'' میں کچھ انداز سے لکھا ہے۔

''مرنے سے کچھ ماہ قبل مجھ کو بلوایا۔ جب میں گیا اس وقت والدہ سعید بھی موجود تھیں' مجھ سے کہا کہ جب تم میرے مرنے کی خبر سننا تو فوراً آکر میری تجہیز و تکفین کا انتظام شیعہ اصول کے بموجب دلوانا' میں خاموش ہوگیا۔ مگر چودھری صاحب کا چہرہ سرخ ہوگیا اور آبدیدہ ہوگئے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۹ء یوم پنجشنبہ کو انتقال فرمایا۔ وصیت کے بموجب تمام امور انجام دیئے گئے۔ مولوی ابن حسن پیشنماز مسجد ارشاد حسین نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبرستان عیدی میراں میں دفن ہوئے''۔ ۷۱

---

۶۷ ''اشرف التواریخ'' (غیر مطبوعہ) سید سفیر احمد اشرفی

۶۸ ''اپنی یادیں رودولی کی باتیں'' صفحہ ۲۶۱

۶۹ ''منزلیں گرد کے مانند'' صفحہ ۱۲۹

۷۰ ادبی دنیا خاص نمبر۔ صفحہ ۱۴۲

۷۱ اپنی یادیں رودولی کی باتیں' صفحات ۲۶۱، ۲۶۲

۱۱۔ چودھری محمد علی ردولوی عہدِ پیری میں۔

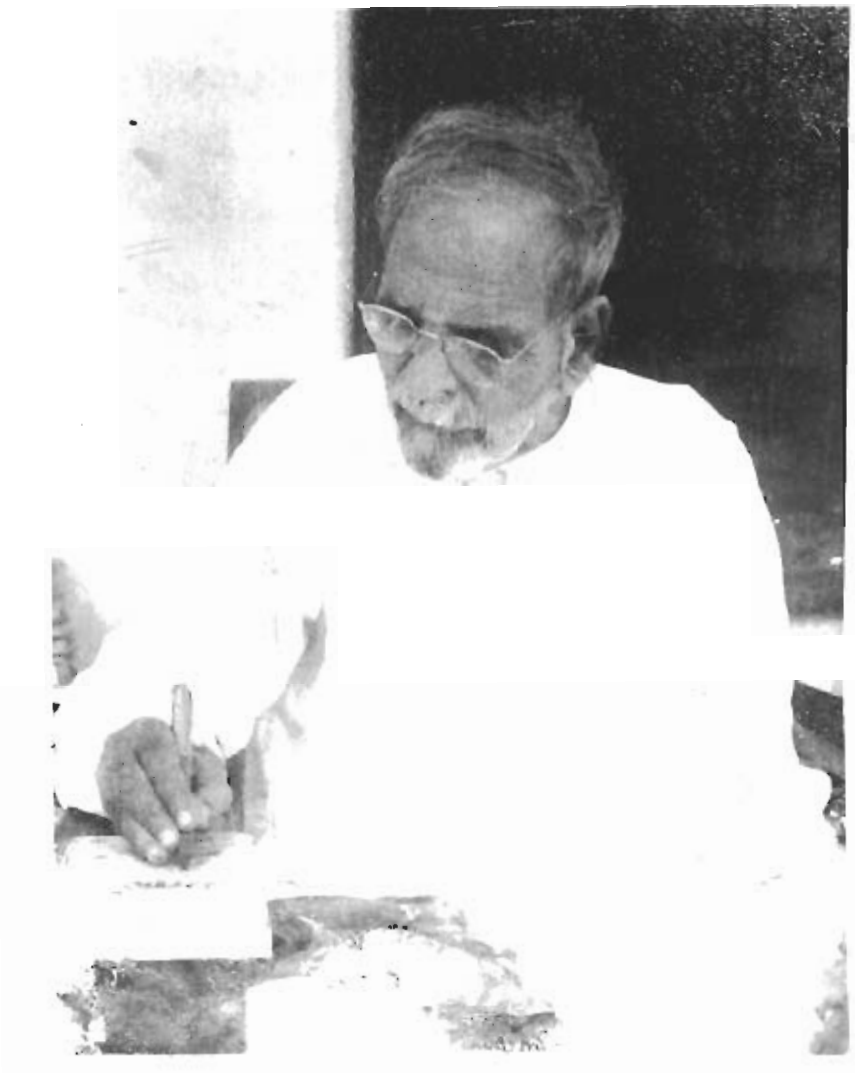

۱۲۔ اپنی عمر کے آخری زمانے میں چودھری صاحب تصنیف و تالیف میں مصروف۔

۱۳۔ رودولی کے محلہ سالار میں واقع چودھری محمد علی کی کوٹھی، جہاں انہوں نے ساری عمر گزاری۔ پھاٹک کے اندر عمارت کا وہ حصہ جہاں وہ ہومیوپیتھی کا مطب چلایا کرتے تھے۔ عمارت کے سامنے چودھری سعید مصطفیٰ علی، رضی حیدر برنی اور اپنے دوسرے بیٹے (بائیں سے دائیں) کے ساتھ کھڑے ہیں۔

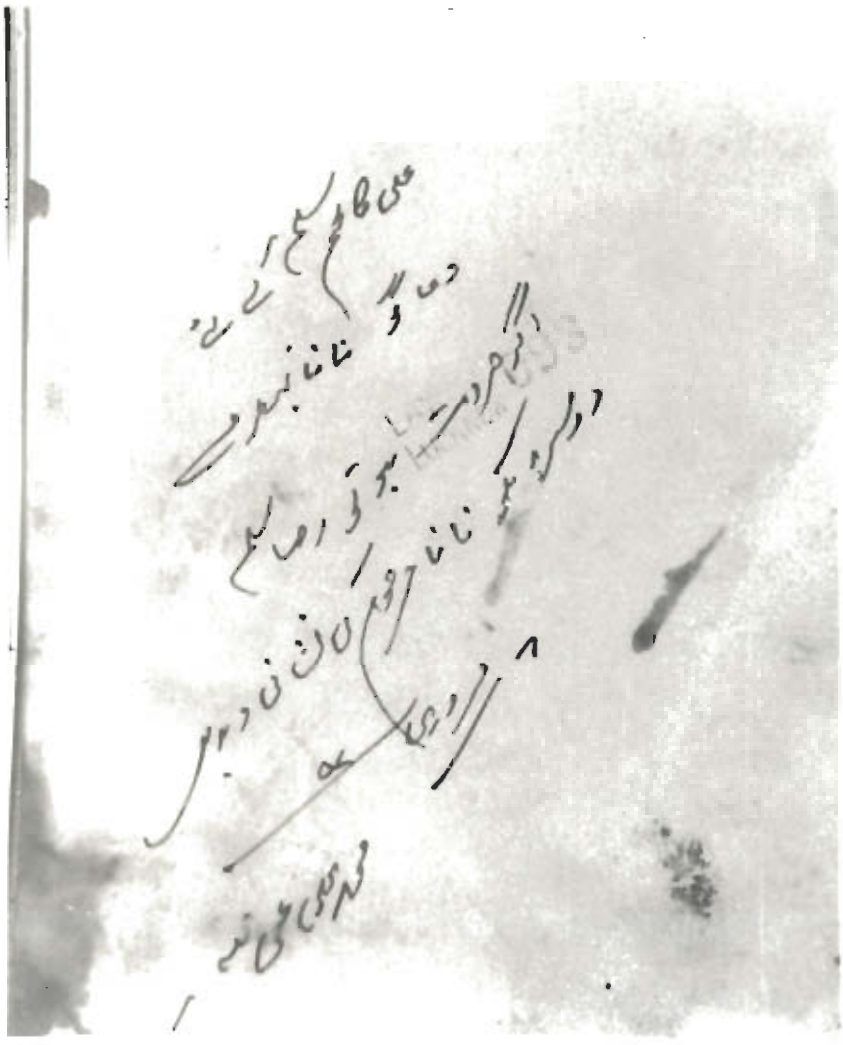

۱۴۔ عمر کے آخری زمانے میں چودھری صاحب کی ایک تحریر کا عکس۔

چودھری محمد علی کی زندگی کے آخری لمحات اور وفات کے بارے میں ان کے دوست اور ہم عصر عبدالماجد دریا آبادی نے اپنے اخبار ''صدقِ جدید'' لکھنؤ میں کچھ اس طرح لکھا ہے۔

''ہنسی کی عمر آخر ختم ہوئی اور فالج میں مبتلا ہونے کے بعد ہنسوڑ نے اب مستقلاً رونا شروع کیا اور یہ گریہ وزاری خوفِ آخرت سے تھی۔ فرنگی محلی' ندوی کسی قسم کی مذہبی شخصیت کو جب پاجاتے تو رو رو کر اس سے دعائے مغفرت کا وعدہ لیتے۔ اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے اور یہ مبارک کیفیت ایک دو دن نہیں' مدتوں رہی۔

اے خنک چشمے کہ آن گریان اوست
اے خنک قلبے کہ آن بریان اوست

یہاں تک کہ ۱۰ر ستمبر ۱۹۵۹ء کو جمعرات کا دن آگیا' گیارہ بجے دن میں طبیعت اچانک بگڑ گئی' نماز ظہر لیٹے لیٹے ادا کی' پھر کبھی درود شریف پڑھتے' کبھی اللہ اللہ کہا اور اسی عالم میں روح پرواز کر گئی۔ ۲؎

چودھری محمد علی صاحب کے آخری لمحات کے سلسلے میں انکے مختار نوشاد علی نے سید شاد سفیر احمد صاحب سے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ چودھری محمد علی کی حالت دفعتاً متغیر ہوئی تو ڈاکٹر بلائے گئے' ڈاکٹر نے انجکشن لگانا چاہا تو چودھری صاحب نے کہا کہ انجکشن سے میری زندگی نہ بڑھے گی یہ پسینہ موت کا ہے اور بالآخر کلمہ و استغفار اور آیات پڑھتے پڑھتے رخصت ہو گئے۔

''تدفین شب جمعہ ہوئی' نماز دو بار حسبِ وصیت پڑھی گئی' ایک بار شیعوں نے' ایک بار سنیوں نے۔ ان نمازوں میں شرکت بہت بڑی جماعت نے کی اللہ بال بال مغفرت فرمائے''۔ ۲؎

شیعہ حضرات کی امامت مسجد ارشاد حسین' رودولی کے پیش امام مولوی ابنِ حسن نانپاردی نے کی جبکہ سنی حضرات کی جماعت کے پیش امام چودھری صاحب کے برادر نسبتی حاجی عظمت رسول تھے۔ تدفین رودولی کے قبرستان ''عیدی میراں'' میں ہوئی۔ ۳؎ مسعود الحق صاحب نے ہما بیگم کے حوالے سے لکھا ہے: ''میاں جان کا انتقال ۹ر ستمبر ۱۹۵۹ء کو ہوا'' ۴؎

چودھری صاحب کی بیٹی ہما بیگم نے ادبی دنیا کے خاص نمبر میں اپنے والد کی وفات کی خبر اس انداز سے دی ہے کہ

۲؎ ''صدق جدید لکھنؤ'' ستمبر ۱۹۵۹ء
۳؎ بہ روایت اپنی یادیں رودولی کی باتیں۔ صفحہ ۲۶۲
۴؎ نگار پاکستان شمارہ فروری ۲۰۰۲ء' صفحہ ۲۷

۱۵۔ ردولی کے قبرستان ''عیدی میراں'' میں چودھری محمد علی ردولوی کی آخری آرامگاہ۔

''چودھری صاحب کے آخری لمحے''

''۱۰ر ستمبر بروز پنجشنبہ ایک بجے دن کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ آخر وقت تک ہوش وحواس بالکل درست رہے۔ سب کو اپنے گرد جمع کرلیا۔ پورے وقت کلمہ پڑھتے اور لبیک لبیک کہتے رہے۔ یہاں تک کہ اطمینان سے آنکھیں بند ہوگئیں جس طرح اطمینان سے مرنے کے لئے وہ بہت دنوں سے دعا مانگا کرتے تھے اسی طرح خودداری اور رضاً بقضائہ و تسلیماً لامرہ کا انداز لیتے ہوئے موت کو لبیک کہا۔ وہ ہمیشہ شیعہ سنی افتراق کے خلاف تھے۔ اس وقت بھی وصیت یہی کی کہ میری نماز جنازہ شیعہ سنی دونوں کی ہو اور اس قبرستان میں دفن کرنے کی وصیت کی جس میں عوام زیادہ اور خواص کم تھے۔ نیز ردولی میں شیعہ سنی اور غرباء کا قبرستان بنام ''عیدی میراں'' ہے' اسی میں شام کے ۷ بجے دفن ہوئے''۔ ۵ے

۵ے ادبی دنیا خاص نمبر صفحہ ۱۴۲

باب سوم

چودھری محمد علی ردولوی کی مکتوب نگاری

۱۔ اردو مکتوب نگاری کی قدیم روایات:

انسانی زندگی میں معاشرہ اور معاشرتی تعلقات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انسان اپنے رشتہ داروں، دوستوں، جاننے والوں سے تعلقات کے بغیر زندگی کو بے رونق محسوس کرتا ہے۔ وہ یہ خواہش کرتا ہے کہ لوگ اس سے تعلق رکھیں اور اپنے حالات سے آگاہ کریں۔ ضروریاتِ زندگی میں جب دوریاں اور فاصلے حائل ہوئے ہونگے تو انسان کو پیغام رسانی کی ضرورت بھی پیش آئی ہوگی اور پھر تحریر نے غائب شخصیت تک وسیع ابلاغ بن کر خطوط کی شکل اختیار کر لی ہوگی۔

مسلمانوں کے گزشتہ ادبی شہ پاروں میں خطوط و مکاتیب کے وسیع ذخیرے موجود ہیں اور ان کے یہاں خیالات کی ترسیل ایک وقیع علم کا درجہ رکھتا ہے۔ یوں تو پیغام رسانی کی ابتداء انسانی وجود کے ساتھ ہی ہوئی۔ غم و خوشی جیسے جذبات ازل سے انسان کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کو پورا کرنے اور ان جیسے بے شمار جذبات کا اظہار کرنے کے لئے کسی نہ کسی قسم کی پیغام رسانی کا سلسلہ ابتدا سے ضرور رہا ہوگا اور اس سلسلے نے تحریر ایجاد ہو جانے کے بعد مکاتیب کی شکل اختیار کی ہوگی اور اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ خطوط کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ خطوط نگاری کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مثال کے طور پر تجارتی، دفتری، کاروباری، سیاسی، عام اطلاعاتی، علمی، معلوماتی، شخصی، جذباتی، خیالی وغیرہ وغیرہ، ان تمام اقسام کے خطوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ نمبر ۱۔ نجی خطوط جن کا تعلق خالص اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ یہ پرائیویٹ حیثیت سے لکھے جاتے ہیں۔ نمبر ۲۔ عام خطوط جن کا تعلق دیگر شخصیات سے ہوتا ہے۔ یہ عام لوگوں کو لکھے جاتے ہیں۔ ویسے تو ہر خط عام اور نجی ہوتا ہے مگر جب منظرِ عام پر آجاتا ہے تو مطالعہ کی چیز بن جاتا ہے اور یہ خطوط علم و ادب کا قیمتی ذخیرہ بن جاتے ہیں۔ مکاتیب کی تمام اقسام اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔ خطوط سے علمی اور معلوماتی فائدے بھی ہوتے ہیں اور پرانے خطوں کی بنیاد تاریخی و سوانحی مواد ہے جو ہمیں ان سے ملتا ہے۔ بعض خطوط فنِ ادب کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح خط کا فن شخصی فن ہونے کے علاوہ شخصیتوں کا فن بھی بن جاتا ہے۔ خط نگاری ایک فن ہے اور اس فن میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو قدرت کی طرف سے یہ فیضان لے کر آیا ہو۔ خط نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بہت آسان فن ہے مگر کبھی کبھی یہ نازک ترین فن بھی بن جاتا ہے۔

پرانی خطوط نگاری میں صورت کے حسن و جمال پر بڑا زور دیا جاتا رہا ہے۔ اس کے مختلف اجزاء کی خوبصورتی' مناسبت و دلکشی کے لئے بہت اہتمام کئے جاتے تھے' سادہ اور رنگین خطوط دونوں میں سب سے پہلے سرنامے کی جستجو ہوتی تھی۔ موجودہ زمانے کے کچھ لوگ بعض اوقات پرانے طریقے کے سرناموں کا انتخاب کرتے ہیں۔ سرناموں کی جستجو کوئی بری بات نہیں بلکہ اس سے خط کا پہلا تاثر اچھا پڑتا ہے۔ خط نگاری کے اس اصول سے لاپرواہی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جدید دور میں پڑھے لکھے لوگ بھی خط کے اس آداب سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب لوگ اس تربیت سے محروم ہو گئے ہیں جو پرانے زمانے میں گفتگو اور مکاتیب کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ مشرقی خط نگاری کی تاریخ میں حسن وصورت کے لئے بہت سے اہتمام کئے جاتے تھے' مختصراً یہ کہ خطوط کے مختلف ادوار میں عجیب عجیب تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ شروع میں خطوط نگاری میں سادگی ایجاز واختصار' مدعا نگاری' خلوص ومناسبت وموزونیت کے اوصاف کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ تہذیب میں تکلف جیسے جیسے بڑھتا گیا اسی قدر خطوں میں تکلف اور رنگینی کا عنصر آتا گیا۔ طویل سرنامے' لمبے القاب وآداب طرزِ تخاطب میں بناوٹ اور تصنع اور دفتریت کے انداز نمایاں ہوتے گئے اور اس کا خاتمہ اس اسلوب پر ہوا جس کو غالب نے محمد شاہی روشوں کا نام دیا۔

بقول شمس الرحمٰن : ''خط لکھنے کا راز انسان ہزاروں سال پہلے سے جانتا ہو مگر اس پر عمل اس نے بہت بعد میں شروع کیا۔ ابتداء میں خط صرف ضروریات کا اظہار یا زیادہ سے زیادہ واقعات کی کتھونی ہوتے تھے لکھنے والے اس سے زیادہ جوہر دکھاتے تو ان میں اپنی قابلیت کے اظہار کی کوشش کرتے تھے۔ پڑھنے والے کے لئے اس میں کچھ دلچسپی نہ ہوتی تھی۔۔۔۔ وہ محض کاروباری ضروریات سے لکھے جاتے تھے۔۔۔۔ مذہب اور حکومت نے انسانی تہذیب وتمدن کی تعمیر میں ہمیشہ بنیاد کا کام دیا ہے۔ خطوط نویسی کے گلستان میں ہمیں جو پرانے بیل بوٹے نظر آتے ہیں ان کا وجود بھی انہی دونوں کا رہین منت ہے۔ تحقیق کے ساتھ یہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ خط لکھنے کی ابتداء مذہب اور حکومت کے علمبرداروں ہی کے ذریعے وجود میں آئی۔ ممکن ہے کہ انفرادی طور پر لوگوں نے اس سے بہت پہلے خط وکتابت کا سلسلہ شروع کر دیا ہو پھر بھی خطوط کے جو مجموعے ہم تک پہنچے وہی ہیں جو ان دونوں کی وجہ سے لکھے گئے تھے۔۔۔۔ ان میں سے بعض مجموعے آج بھی مقبولیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔''[1]

---

[1] ''اردو خطوط'' از شمس الرحمٰن' صفحات ۱۷ تا ۱۸

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ خطوط نویسی کے فن نے بھی ترقی کی۔ اور جب لوگوں میں خطوط جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا تو خانگی خطوط بھی شائع ہونے لگے اکثر ترقی یافتہ زبانوں میں خطوط کے ایسے مجموعے موجود ہیں جن سے مصنف کی اعلیٰ قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور ان کے اخلاق اور ماحول پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ لاطینی زبان میں ہوریس اور سسرو، انگریزی میں ملٹن، بیکن، کاؤپر، گولڈ سمتھ، بائرن، لارڈ چیسرفیلیڈ، ملکہ وکٹوریہ وغیرہ، فرانسیسی میں والتیر، ورڈ یڈرو وغیرہ کے خطوط نثر کے بہترین نمونے سمجھے جاتے ہیں۔

اردو خطوط نویسی کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے ہمیں عربی و فارسی میں فنِ خط نویسی کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لینا چاہئے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ عربی اور فارسی میں خطوط نویسی کی کیا کیفیت تھی اور اردو خطوط نویسی پر اس کا کیا اثر پڑا؟ ویسے تو ہر زبان میں خطوط نویسی کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں اس فن نے بہت ترقی کی۔ زمانہ نبوت میں خطوں کی دیکھ بھال کا کام شروع ہو گیا تھا۔ دوسرے ممالک میں جو دعوت اسلام کے لئے خطوط بھیجے جاتے تھے انہیں مضمون نگاری میں مہارت رکھنے والے صحابہ تحریر کرتے تھے اور وہی ان خطوں کو سنبھال کر رکھتے بھی تھے۔ حضرت عمرؓ نے محکمہ انشاء کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔ خلافتِ امیہ اور خلافتِ عباسیہ دونوں نے اس محکمے کو ترقی دی اور اس طرح حکومت کی طرف سے خط لکھنا ایک اہم فن بن گیا۔

خط لکھنے کے فن پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ علمی طور پر خط کی تعریف کی جانے لگی اور اس طرح خطوط کی قسمیں مقرر ہو گئیں اور ہر قسم کے لئے ایک خاص اسلوب مقرر کیا گیا۔ عماد سے لے کر ابنِ عبدالکریم تک بہت سے انشا پردازوں کے خطوط اور مراسلے اس حقیقت کی شہادت کے لئے آج بھی موجود ہیں اور انہیں عربی ادب کا بیش بہا ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔ جب اسلامی ایشیا میں مغلوں کی حکومت ہوئی تو عربی کی جگہ فارسی کو دفتری زبان کی سند مل گئی اور اس طرح فارسی خطوط نگاری ایران سے زیادہ ہندوستان میں پروان چڑھی۔ مکاتیب کے وہ مجموعے جو فارسی ادب کی جان ہیں انہیں ایران نے نہیں بلکہ ہندوستان کی سرزمین نے پیدا کیا ہے۔ ان میں حکومت کے خطوط کے علاوہ عالموں، صوفیوں اور بہت سے دوسرے لوگوں کے نجی خطوط بھی شامل ہیں۔ فارسی زبان ایک زمانے تک تہذیب و ثقافت کی مالک رہی ہر پڑھے لکھے گھرانے میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان فارسی زبان میں ہی خط و کتابت ہوتی تھی اسی وجہ سے فارسی زبان میں خطوط و رقعات کے بے شمار مجموعے پائے جاتے ہیں۔

اردو خط و کتابت کی ابتداء میں فارسی خطوں کے ان مجموعوں کی ہی پیروی کی گئی۔ عربی فارسی کے برعکس اردو میں خطوط نویسی کا فن حکومت کی سرپرستی سے آزاد رہا لیکن اردو کے ادیبوں نے ادب کی دوسری صنفوں میں فارسی کا سہارا لیا تھا

اسی طرح خطوط کے سلسلے میں بھی اس سے کافی مدد لی۔اس کا اثر یہ ہوا کہ مشکل پسندی جو کہ فارسی کی خصوصی بنیاد تصور کیا جاتا تھا اردو مکتوب نگاری کا بھی حصہ بن گئی۔ اردو زبان ابھی ناپختہ تھی اس کے خطوں میں فارسی کی طرح مشکل الفاظ تو ادا نہ ہو سکے مگر اسلوب بیان میں صنائع بدائع کی کثرت مقفیٰ و مسجع عبارت کی بھرمار' تشبیوں اور استعاروں کی بہتات' القاب و آداب کی طوالت وغیرہ سب کچھ ہی آ گیا۔مکتوباتِ احمدی محمدی' رقعاتِ عنائیت علی' انشاء اردو سرور وغیرہ جیسے اردو خطوط کے ابتدائی مجموعوں میں اسی انداز کے خطوط ملتے ہیں۔

غالب نے اردو خطوط نویسی کی ایک نئی روش اپنائی۔ ہندوستان کے فارسی ادب میں ترسیل کا اولین ممتاز ہدایت نامہ ''اعجازِ خسروی'' ہے۔ یہ بھی سادگی سے زیادہ تکلف اور رنگینی ہی کی تحریک کرتا ہے۔ وہ کلام میں (بشمول خط) نمکینیت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نمکینیت کا ذائقہ ترکوں کو خاص طور سے عطا ہوا ہے۔خسرو کے بعد فنِ انشاء کے اکثر ماہرین اس رنگینی سے متاثر رہے مگر ابوالفضل نے خطوط نگاری کو ایک نئے انداز سے آشنا کیا۔جس کو رنگین تو نہیں مگر دقیق اور پیچیدہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کے نجی خطوط ان کے انشاء کے دوسرے دفتر میں ہیں اور سرکاری دفتری خطوط سے آسان ہیں ان میں گہرا انفرادی رنگ پایا جاتا ہے۔ابوالفضل کے خطوط ادب عالیہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ اورنگزیب عالمگیر اور چندر بھان برہمن کے خطوط بھی ہیں۔ اورنگزیب کے خطوط ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ چندر بھان برہمن کے خطوط کی خصوصیت یہ ہے کہ تکلف اور رنگینی کے عام رواج کے باوجود انہوں نے خطوں میں سادگی و مدعا نگاری کو خاص مقام دیا۔

۲۔ خطوط نگاری کا ادبی جائزہ:

خطوط ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس سے ہر خیال کا آدمی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا عوام سے تعلق رکھتا ہو یا خواص سے یکساں لطف انداز ہوتا ہے۔ خط میں انسانی زندگی کے ہر پہلو پر تنقید دنیا کے ہر ادب پر تبصرہ اور تمام جاندار و بے جان چیزوں پر بحث کی جا سکتی ہے۔ اچھے مکتوب نگار کے مجموعوں میں ہر فرد کو اپنی سوچ کے مطابق کچھ نہ کچھ مواد مل ہی جاتا ہے۔ خطوں کا مطالعہ انسانی فطرت کے لئے اس لئے بھی دلچسپ ہے کہ خطوں کے ذریعہ ہم مکتوب نگار کو اس کی دنیا میں حرکت کرتے ہوئے محو پاتے ہیں اور اس کی زندگی اپنے اصلی خد و خال میں جیتی جاگتی نظر آتی ہے اور ایسے خطوں کو پڑھ کر ہم یہی سوچنے لگتے ہیں کہ کہیں یہ ہماری اپنی کہانی تو نہیں ہے؟

بقول مولوی عبدالحق: ''خانگی خطوں میں اور خاص کر ان خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے۔۔۔۔ان کی سب سے بڑی خوبی بے زبانی ہے تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے۔۔۔۔گویا

انسان اپنے سے باتیں کر رہا ہے۔ یہاں اندیشہ لائم نہیں ہوتا یہ دلی جذبات اور خیالات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔ پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا۔''[۲]

خطوں کی ایک اور اہم خصوصیت جس کی وجہ سے اسے مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس کی سادگی ہے اور یہی سادگی خطوں کی جان ہے اس میں پڑھنے والے کو وہ لطف آتا ہے جو ادب کی کسی اور صنف کے مطالعہ سے نہیں آتا۔

بقول مہدی حسن الافادی الاقتصادی: ''نج کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا یعنی اظہارِ خیال میں صنعت گریِ طبع کی جگہ صرف آمدِ جذبات ہوتی ہے۔ اس لئے لٹریچر کا ایک ایسا انظراری حصہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبہ انشاء پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے۔''[۳]

کچھ شاعر یا مصنفین کے خطوں میں اس لئے بھی کشش ہوتی ہے کہ ان سے ان کی ذات کا عکس اور کلام و تصانیف کے متعلق انکا خیال واضح ہو جاتا ہے۔ خطوں سے مکتوب نگار کی زندگی کے وہ واقعات اور صفات پر سے پردہ ہٹ جاتا ہے جسے ہم عام زندگی میں کبھی معلوم نہیں کر سکتے۔ انسان اپنی زندگی کے بہت سے کام اور بعض خیالات پردے میں رکھتا ہے مگر خطوں میں اکثر اس کا اظہار کر جاتا ہے اور اگر اس کے یہ خطوط چھپ جائیں تو راز پھر راز نہیں رہتا اس بات کا اعتراف مولوی عبدالحق نے بھی کیا ہے: ''مکتوب الیہ بعض اوقات ایسے افراد ہوتے ہیں جس کی نسبت یہ گمان ہوتا ہے کہ معاملہ ان ہی تک رہے گا۔۔۔۔ اور اس لئے وہ کبھی کبھی ایسے اسرار بیان کر جاتا ہے اور دل کی ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جو کبھی وہ زبان پر نہ لاتا اور نہ حوالہ قلم کرتا اور شاید اسی کے ساتھ اس کے سینے میں مدفون ہو جاتیں۔ لیکن اسے کیا خبر کہ رقیب گھات میں لگے ہوئے ہیں جو اس کے ایک ایک پرچے کو ڈھونڈ نکالیں گے اور اس کے راز کو ڈنکے کی چوٹ پر بیان کریں گے''[۴]

غرض کہ خطوط ادب کی بہترین مثال ہیں۔ ان میں وہ تمام موضوع زیر بحث آتے ہیں جو کسی بھی ادبِ عالیہ کا سرمایہ ہو سکتے ہیں۔ تنقید کی ابتدا بھی خطوں کے ذریعے سے ہوئی اور آج بھی انگریزی ادب میں تنقیدی ادب کے بہت عمدہ نمونے خطوط کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ خطوط میں جس آزادانہ انداز سے تنقید کی جا سکتی ہے وہ کسی بھی مضمون یا مستقل تصنیف میں ممکن نہیں۔ خطوط کی یہ صنعت بھی اسے ادب کی دوسری صنعتوں سے ممتاز کرتی ہے۔

ویسے تو اچھے مکتوب نگار بہت سے گذرے ہیں مگر غالب کے خطوط کے بعد اگر کسی کے خطوں نے لوگوں کو چونکا دیا ہے تو وہ چودھری محمد علی ردولوی ہیں۔ ان کے خطوط کا مجموعہ ''گویا دبستاں کھل گیا'' اردو خطوط نویسی میں ایک گراں قدر اضافہ

---

۲ ''اردو خطوط'' از شمس الرحمٰن صفحہ ۸ ۳ ایضاً' صفحات ۹ تا ۱۰ ۴ ایضاً' صفحات ۱۰ تا ۱۱

ہے ''گویا دبستان کھل گیا'' کا پہلا ایڈیشن جو کہ اگست ۱۹۵۶ء میں پنجاب اکادمی لاہور نے شائع کیا تھا یہ ۲۸۴ صفحات پر پھیلے ہوئے ۱۰۵ خطوط پر مشتمل ہے۔ اس میں ۵۰ خطوط ہما بیگم کے نام ہیں اور دو خط چھبن کے نام۔ یہ دونوں بہنیں ہیں اور چودھری محمد علی ردولوی کی صاحبزادیاں ہیں۔ بقیہ ۵۳ خطوط دیگر دوست احباب کے نام ہیں۔ ''گویا دبستان کھل گیا'' کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن جو کہ ۴۰۰ صفحات پر پھیلے ہوئے ۱۸۰ خطوط پر مشتمل ہے اسے اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔ اس میں ۱۱۸ خطوط ہما بیگم کے نام ہیں ۳ چھبن اور ایک کجن کے نام ہے۔ آخر الذکر بھی چودھری محمد علی کی صاحبزادی ہیں۔ ۵۸ خطوط دیگر عزیز و اقارب اور دوست احباب کے نام ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں پہلا ایڈیشن پڑھنے کے بعد شہاب الدین صاحب کا چودھری صاحب کے نام تحریر کردہ ایک تعریفی خط بھی شامل ہے' جو چودھری صاحب کے ۱۸۰ خطوط کے علاوہ ہے۔ ''گویا دبستاں کھل گیا'' کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں پیش لفظ ہما بیگم نے لکھا ہے اور ''اس کتاب میں'' کے عنوان سے صلاح الدین احمد نے دونوں ایڈیشنوں میں چودھری محمد علی ردولوی کا تعارف کرایا ہے۔ ''تعارف'' کے عنوان سے دوسرے ایڈیشن میں شان الحق حقی نے چودھری محمد علی کو متعارف کرایا ہے۔ دونوں ایڈیشن ہما بیگم نے ہی مرتب کئے ہیں۔

۳۔ چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط کا تجزیہ:

مرزا غالب کے خطوط نے جن خوبیوں کی بناء پر اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل کیا ہے وہ مکتوب نگاری میں فطری والہانہ پن' سادہ سلیس اور روزمرہ کی بے تکلفانہ زبان کے ذریعے مراسلے کو مکالمہ بنا دینا ہے۔ غالب نے اردو ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ غالب کے بعد مکاتیبی ادب میں تقریباً انہی تمام خوبیوں کے ساتھ چودھری محمد علی ردولوی اپنے خطوط کا مجموعہ ''گویا دبستاں کھل گیا'' کے ذریعے داخل ہوتے ہیں۔ وہ شگفتہ اور بے تکلف انداز بیان کے ساتھ مکاتیب میں اصل معاملے کی وضاحت کی خاطر چھوٹے چھوٹے قصے اور لطیفے بہت ہی خوبصورتی سے پر لطف انداز میں سناتے ہیں۔ جس سے ایک حسین فضا قائم ہو جاتی ہے۔ چودھری محمد علی ایک زندہ دل انسان تھے انہیں حسین شے اور پر کیف فضا کی منظر کشی کرنے میں ایک خاص قسم کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ اپنے اردگرد کی جزئیات تک سے باخبر رہتے تھے۔ ان کے خطوط میں ایسی فضا ملتی ہے جو اپنے گھر کی ہو۔ مثال کے طور پر اپنی بیٹی ہما بیگم کو ایک خط لکھتے ہوئے اس میں جو انداز اختیار کرتے ہیں وہ کچھ یوں ہے۔

''اس وقت صبح کے آٹھ بجنے والے ہیں۔ ابر گھرا ہے بوندیں پڑ رہی ہیں' باغ میں ہر طرف ہریالی ہے' بیس دن ادھر ہر سبزی میں زردی ہر پتی مرجھائی اور اب ماشاءاللہ ہر چیز ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے لڑکی میکے پہنچ گئی۔ ٹھنڈی ہوا پہاڑ سے

بہتر چل رہی ہے، وہاں تو گرم کپڑے نہ پہنو تو چل لگ جائے یہاں کھلے بندوں بیٹھے رہو۔ برسات کی جھڑی لگی ہے درخت جھوم رہے ہیں۔ جب ہوا زور سے گدگداتی ہے تو ہنسی کے مارے ایسا لوٹتے ہیں کہ ہنستے ہنستے گر پڑیں گے''۔ ۵

اسی انداز کا ایک اور خط چودھری محمد علی اپنے ایک دوست جن کا نام ''عزیز'' ہے کو لکھتے ہیں کہ

''میاں نجے کہتے ہیں انہوں نے عمر میں کبھی یہ نہ کیا کہ ایک خط دوسرے کے لفافے میں رکھ جائیں۔ ان کے خیال میں یہ سنسر صاحب کی حرکت ہے۔ حاجی جب گھوڑی خریدنے نیلام چلے تو خود بہت سویرے یکہ والے کو جا کر جگایا تھا۔ جب نیلام میں گھوڑی خرید چکے تو روپے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ روپے ہاتھ میں لگتے ہیں، مگر نکل نہیں رہے ہیں۔ جھک کر دیکھا تو عبا الٹی زیب تن تھی۔ کہنے لگے وہ تو مال مزکی تھا۔ ورنہ الٹی جیب میں کبھی کچھ رہا ہے۔ یہ سب اسی یکہ والے کی حرمزدگی ہے۔ کیا شریر قوم ہوتی ہے کیا نام کہ یہی قول میاں نجے کا ہے''۔ ۶

چودھری صاحب نے بے شمار خطوط ہما بیگم اور اپنے دیگر دوست احباب کے نام لکھے ہیں ان میں سے چند خطوط کے جستہ جستہ فقرے یہاں تحریر کئے جا رہے ہیں۔

ہما بیگم سے اپنے ایک خط میں باتیں کرنے کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ کچھ یوں ہے

''میری جان، دعائیں حاضر ہیں!

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس کے معنی یہ نہیں کہ واقعی میرے دل میں درد اٹھا ہے اور حکیم ڈاکٹر چارپائی کے اردگرد گھوم رہے ہیں بلکہ صرف شاعرانہ پہلو سے درد ہو رہا ہے۔ تم کو تو کچھ لکھتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے کیونکہ تم سے کوئی مصیبت بیاں نہیں کی کہ تم نے توکل کا راستہ دکھانا شروع نہیں کیا۔۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے توکل کی تلقین سے مجھ سے بھی کوئی کلمہ کفر کہلانے پر تلی بیٹھی ہو۔ تم تو اس رنگ میں ہو اور بی کمن کو دیکھو وہ کراچی میں بیٹھی بیٹھی تحریر فرماتی ہیں کہ میاں جان میں نے سنا ہے کہ تم بہت بڈھے اور دبلے ہو گئے ہو۔ پوچھو بڑھاپے میں کوئی دبلا اور بوڑھا نہیں ہو جاتا تو کیا موٹے بھینگتی ہیں''۔ ۷

یہ بات صحیح ہے کہ اتنی سادگی اور برجستگی ہمیں غالب کے بعد محمد علی ردولوی کے خطوں میں ہی ملتی ہے۔ ہما بیگم نے محمد علی سے ان کے خطوط شائع کروانے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تو انہوں نے ہما بیگم سے شکایت کی کہ اب میرے خطوں میں وہ سادگی اور بے لوثی باقی نہیں رہے گی۔ اس خط کی عبارت یہ تھی۔

''ہما پیاری! دعائیں قبول فرماؤ اور میرے بس میں کیا ہے! ایک بار مولوی عوض علی مرحوم اور ہم ساتھ جا رہے

---

۵ ''کو یار دبستاں کھل گیا''، صفحات ۱۴۱ تا ۱۴۲ ۶ ایضاً، صفحات ۱۳۶ تا ۱۳۷ ۷ ایضاً، صفحات ۲۳۴ تا ۲۳۵

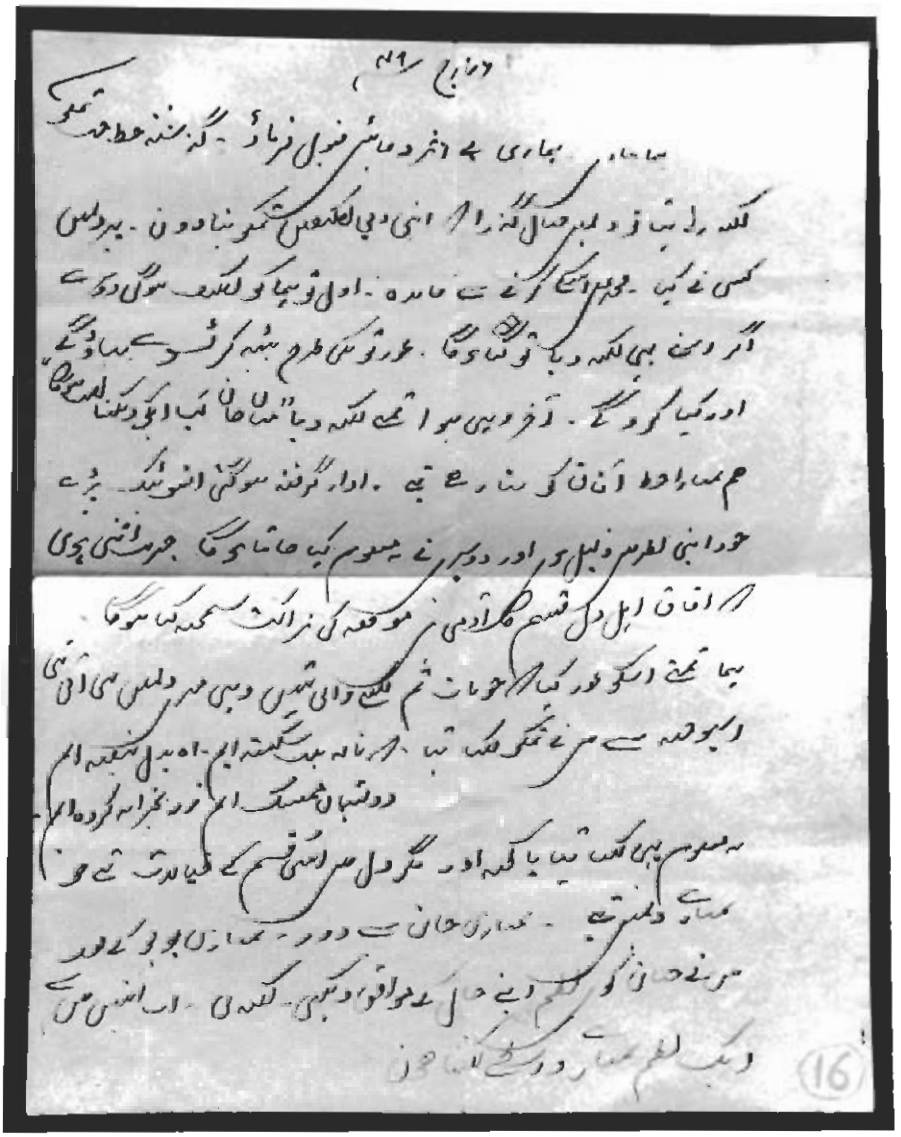

۱۶۔ چودھری محمد علی ردولوی کے ۶ / مارچ ۱۹۴۸ء کے تحریر کردہ خط کا عکس۔

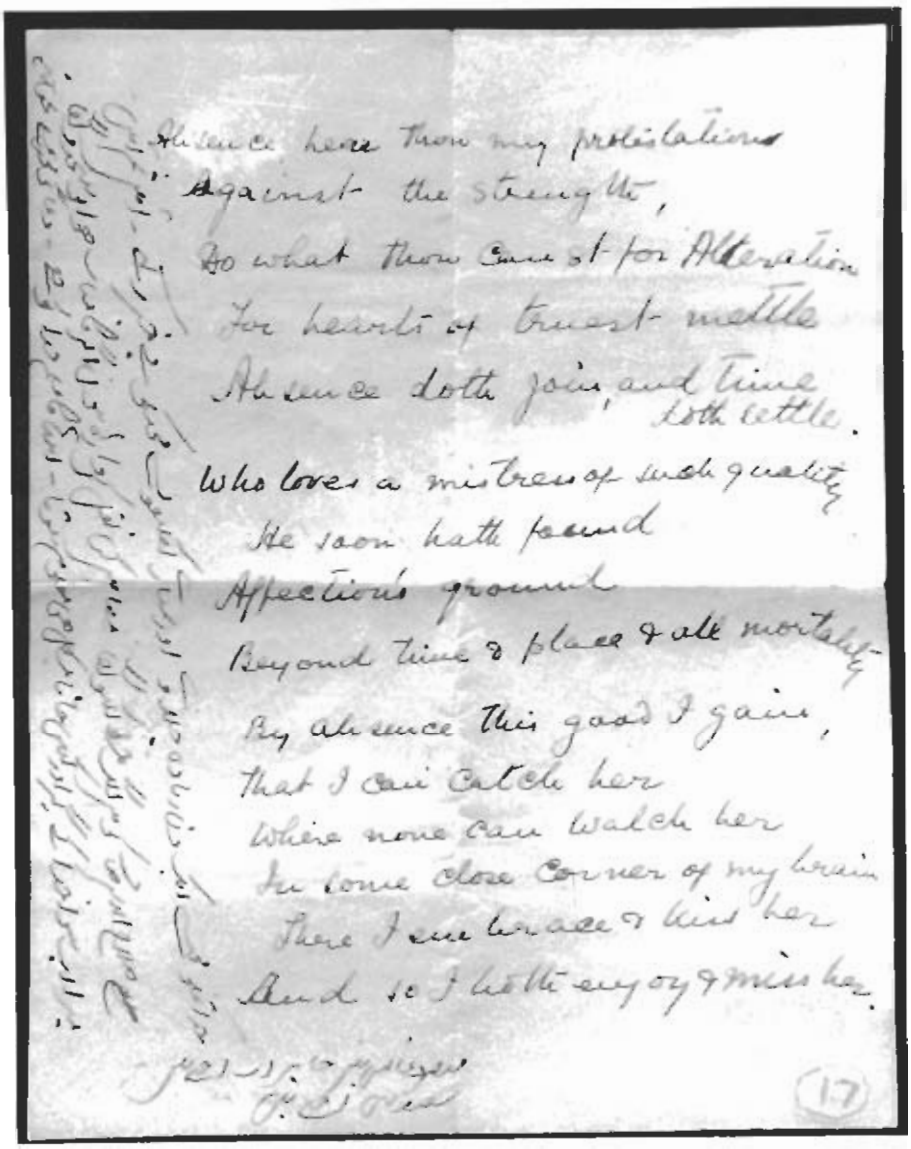

Absence hear thou my protestations
Against the strength,
To what thou canst for Alteration
For hearts of truest mettle
Absence doth join, and time doth settle.

Who loves a mistress of such quality
He soon hath found
Affection's ground
Beyond time & place & all mortality.

By absence this good I gain,
That I can catch her
Where none can watch her
In some close corner of my brain
There I embrace & kiss her
And so I both enjoy & miss her.

(17)

۱۷۔ چودھری صاحب کے گزشتہ خط میں انگریزی تحریر کا عکس۔

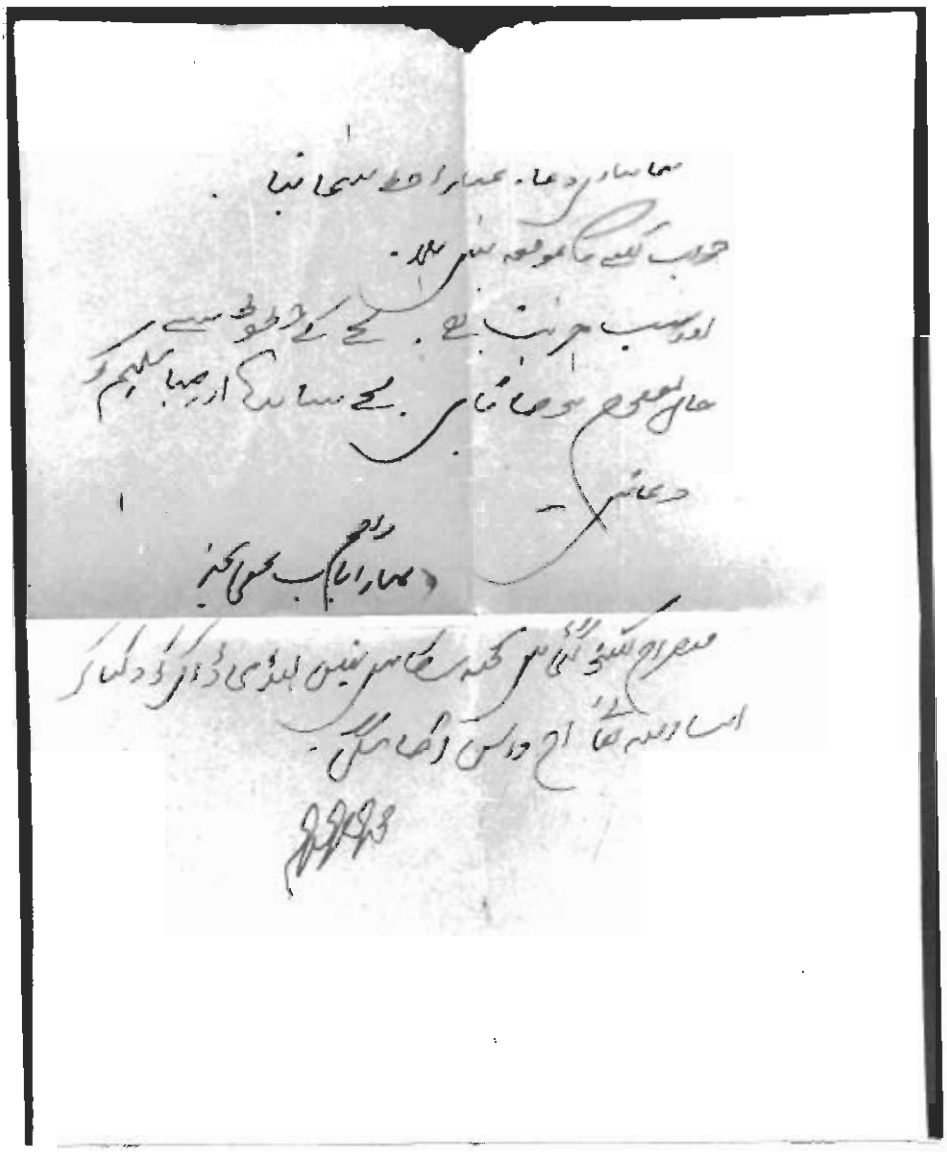

۱۸۔ چودھری صاحب کے ۳ رنومبر ۱۹۵۱ء کے تحریر کردہ خط کا عکس۔

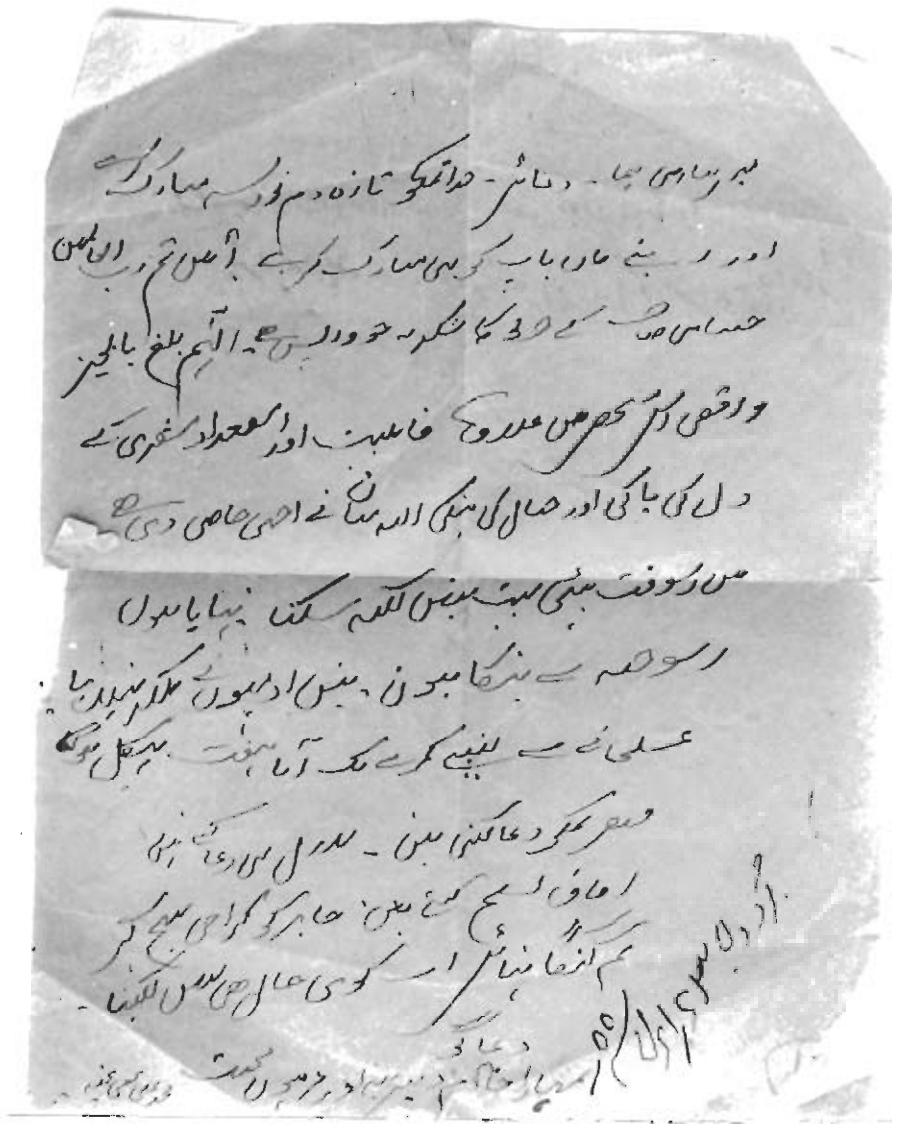

۱۹۔ چودھری صاحب کے ۲۳ر اپریل ۱۹۵۵ء کے تحریر کردہ خط کا عکس۔

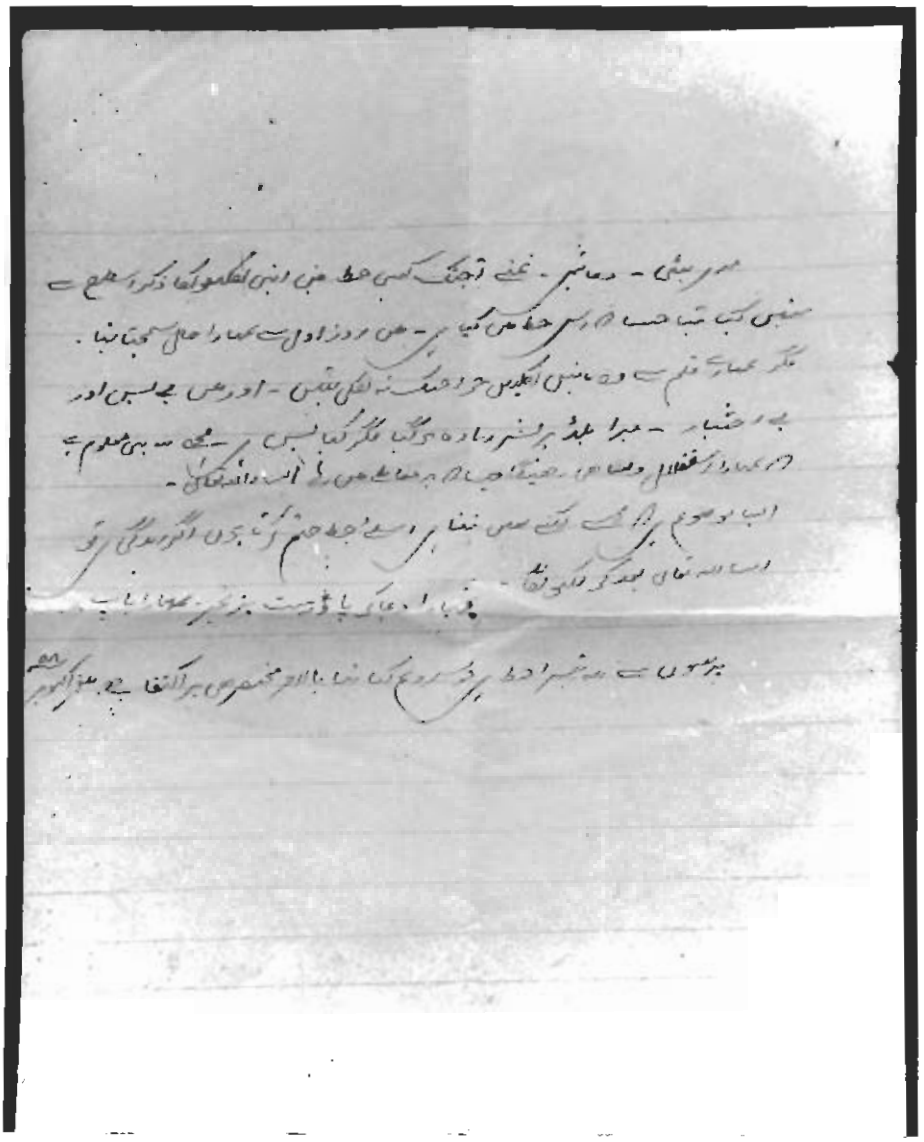

۲۰۔ چودھری محمد علی ردولوی کے ۳/اکتوبر ۱۹۵۸ء کے تحریر کردہ خط کا عکس۔

تھے۔ میں نے ان کی تعریف شروع کی کہ آپ اچھی خیرات کرتے ہیں وہ کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے ''لے بھئی ای کا کہو' بھئی ہمرا سب کیا کرا وا مٹی کر دیو لے اب تم کہد یو اب کا ہو یئے۔ لے ہمرا تو ثوا ب گوا۔ حکم ہے کہ کہو نا اور تم کہد یو تو ہم تو کہیں کے نہ رہن بھائی۔ واہ بھئی واہ۔ ایسا کوئی کرت ہے بھائی۔'' تم نے لکھا ہے کہ میرے خط چھپوانے کے لئے جمع کر رہی ہو۔ اب خط لکھتے وقت یہ یاد آ جایا کرے گا اور بجائے سادگی اور صفائی بے لوثی کے انا نیت' او چھاپن' اظہار قابلیت' الا بلا خاک دھول خطوں میں نہ معلوم کیا کیا سا جائے گا۔ لے بھائی ہما ای کا کہیو۔ بھئی ہمرا کیا کرا وا سب مٹی کر دیو۔۔۔۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرے خطوط چھپیں نا۔ اگر ان سے کوئی فائدہ مقصود ہو تو ضرور چھپیں مگر اس خیال کے بعد وہ تحریر کی بے تکلفی تو گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جیل خانے میں چھپوانے کے لئے خطوط رکھے تھے۔ دیکھو لو ایک خط کے سوا جو انہوں نے اپنی بی بی کے مرنے پر لکھا تھا اور جتنے خطوط ہیں ان میں لڑکوں کا باپ مردو۔ بی بی کا شوہر غائب اور صرف ادب کا منشی۔ علوم کا مولوی۔ انگریزی پالیٹکس کا ادھ کچرا نقال ''انا'' کا ڈھنڈورا پیٹنے والا بڑے بڑے الفاظ اور عربی ترکیبوں کا اردو کی اونچی نیچی زمین پر TANK چلانے والا دکھائی دیتا ہے۔''[۸]

یہ بات بالکل درست ہے کہ جب کسی کو معلوم ہو جائے کہ اس کے خطوط شائع ہوں گے تو پھر اس کی تحریر میں وہ سادگی اور برجستگی باقی نہیں رہتی۔ مگر چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط میں آخر وقت تک وہی سادگی' وہی بے تکلفی' وہی بے لوثی اور خلوص و جذبات کی عکاسی نظر آتی ہے جو ابتداء میں تھی۔

چودھری محمد علی اپنے ایک دوست کو جو کہ سلیم پور کے راجہ تھے خط لکھتے ہیں اور اس میں انتہائی سادگی کے ساتھ اپنی پریشانیوں کا حال یوں بیان کرتے ہیں۔

''۔۔۔۔ معلوم نہیں کب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ معلوم کیوں مگر آپ کے دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ مواقع اتنے کم رہ گئے ہیں اور میرا سن اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ اگر دید کی صورت نہ بندھے اور میرا رخصتِ سفر بندھ جائے تو تعجب نہیں۔ روپیہ اتنا کم رہ گیا ہے کہ جب تک اشد ضرورت نہ آن پڑے لکھنؤ جانے کا رعب نہیں پڑتا۔ اگر لکھنؤ آ گیا تو کار پر سلیم پور پہنچ جانا سہل ہے۔ کار بھی اسی وقت تک ہے جب تک کوئی خریدار نہیں ملتا۔ خریداروں کا یقیناً یہ حال ہو گیا ہے کہ

''سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول''[۹]

چودھری صاحب نے ایک کتاب ''میرا مذہب'' کے عنوان سے لکھی۔ اس کتاب کے شائع ہوتے پر لوگوں میں خاصے نظریاتی اختلافات پیدا ہوئے اور طرح طرح کے تبصرے ہونے لگے۔ محمد علی نے محرم کی مجلسوں' جلوس' تعزیہ داری وغیرہ میں شرکت کرنا چھوڑ دی تھی۔ اس وجہ سے اس کتاب کی اشاعت پر ان کے بہت سے شیعہ دوستوں نے خطوط لکھے۔

۸۔ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۱۴۸ تا ۱۴۹ ۹۔ ایضاً' صفحہ ۹۵

جس میں میجر سید ابو جعفر خان بھی تھے۔ چودھری صاحب نے ان کے خط کے جواب میں جو انداز اختیار کیا وہ کچھ یوں ہے:

''۔۔۔۔ واللہ میجر صاحب یہ نہ شرط انصاف نہ شرط دوستی' اپنے میٹھے بولوں سے آپ کیا کرنے پر تلے ہیں۔ میں بوڑھا خرف' ''بڈھا اور بالا برابر''۔ سٹھیا گیا ہوں بچوں کا ایسا بھولا پن پھر سے آ گیا ہے۔ اور آپ میری حالت سے فائدہ اٹھا کر مجھ کو پھر سے شیعہ کرنا چاہتے ہیں۔ آخر اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

اللہ میاں نے آپ کی زبان میں نرمی' آپ کے قلم میں اثر اسی واسطے دیا تھا کہ آپ میرے ایسے نادان پر ہاتھ صاف کیجئے۔ اور مجھ کو مسلمان سے پھر شیعہ کر لیجئے۔ اور تو اور ذری اس بات پر غور کیا ہوتا کہ ابھی ابھی چار پانچ سو روپیہ لگا کر ''میرا مذہب'' چھپوایا ہے اگر شیعہ ہو گیا تو اس رقم پر پانی پھر جائے گا۔۔۔۔ اچھا میجر صاحب ہمارے آپ کے درمیان صلح ہو جائے۔ شرائط حسب ذیل ہیں۔ میں محمد ﷺ آلِ محمد ﷺ پر دل و جان سے قربان ہوں۔۔۔ آپ نام بنام تبرا چھوڑ کر صرف دشمنانِ محمد ﷺ آلِ محمد ﷺ سے بیزاری کیجئے۔ اور اس کی پرواہ بالکل نہ کیجئے کہ ٹوپی کس کے سر پر سج گئی۔۔۔۔ دل میں بھی صرف دشمنانِ محمد ﷺ آلِ محمد ﷺ کا خیال آوے۔۔۔۔ تقیہ کے اوپر جو کچھ مجھ کو کہنا تھا کہا۔۔۔۔ تقیہ کا غلط استعمال اور تبرا یہ دونوں ایسی مشکل راہیں ہیں کہ جس میں ذرا سا پاؤں ڈگ گیا آدمی منہ کے بل آ رہا۔ اور زندگی دوہری ہو گئی۔۔۔۔ دوہری زندگی کسی کو نہیں پسند۔'' [۱۰]

''میرا مذہب'' کی ہی اشاعت کے سلسلے میں چودھری محمد علی ایک خط کسی مینیجر صاحب کو لکھتے ہیں جس میں اپنے خیالات کی وضاحت کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

''میرے دل کو شیعہ یا سنی کہے جانے سے تسکین نہیں ہوتی اور جس جذبے سے تسکین ہوتی ہے وہ نصیب نہیں۔ یعنی مجھ کو ارباب فہم بے وقوف کہیں' گنہ گار کہیں' جاہل کہیں مگر مسلمان سمجھیں۔ غضب تو یہ ہے کہ کوئی متعصب شیعہ کہتا ہے کوئی سنیوں کا خوشامدی کہتا ہے کوئی ڈھل مل یقین کہتا ہے' کوئی دہریہ کہتا ہے؟ مگر مسلمان کوئی نہیں کہتا۔ تیرہ سو برس بعد مسلمان ہونا ویسا ہی مشکل ہو گیا ہے جیسے پھر سے معصوم بچہ ہو جانا۔۔۔۔ ذری یار دخدا لگتی کہو اگر میں آئمہ علیہم السلام کی جگہ دل میں رکھتا ہوں تو شیعہ کب ہو گیا۔ اگر میں حضرت ابوبکرؓ کا معترف ہوں تو سنی کیسے ہو گیا''۔ [۱۱]

چودھری محمد علی کو زبان و بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں پر جو عبور حاصل تھا اس کی جھلک ''گویا دبستاں کھل گیا'' میں شامل تقریباً ہر خط میں نظر آتی ہے۔ ہما بیگم کو ایک خط لکھتے ہیں' جس میں گاندھی کے انتقال پر پرسہ دیتے ہوئے جو انداز اختیار کیا ہے وہ کچھ یوں ہے:

---

۱۰ ''گویا دبستاں کھل گیا''، صفحات ۹۲ تا ۹۴ ۱۱ ایضاً، صفحات ۱۰۳ تا ۱۰۵

''۔۔۔۔گاندھی کا پرسہ قبول کرو۔ایک شخص نے کہا ہے سقراط کو دنیا نے زہر کا پیالا دیا۔عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دی اور گاندھی کو سیسے کی گولیاں دیں۔دنیا نے کچھ ترقی نہیں کی، جہاں تھی وہیں ہے۔یہ تو ضرور ہوا، مگر سقراط کو زہر دینے والے دنیا سے ناپید ہو گئے۔عیسیٰ علیہ السلام کو مارنے والے انیس سو پندرہ برس سے نکھرے پھر رہے ہیں۔کیسے کہوں کہ راشٹریہ سویم سنگھ اور ہندو سبھا دنیا میں پھلے پھولیں گے۔۔۔۔اس اعلیٰ اللہ مقامہ کا صرف یہ قصور تھا کہ اس نے ہندوؤں کی دوستی میں انسانیت کو برقرار کیا۔اس نے کہا میں بت کو پوجتا ہوں۔گو صرف پتھر کو نہیں پوجتا، میں سناتن دھرمی ہوں۔میں نے تمام مذاہب کو جانچ کر سناتن دھرمی مذہب اختیار کیا ہے۔اگر مسلمانوں سے لڑ دگے تو دونوں خاک میں مل جائیں گے۔پھر بھی اسلام تو ہندوستان کے باہر رہ جائے گا۔ہاں ہندو یت ختم ہو جائے گی، اس لئے کہ ہندو یت سوا ہندوستان کے کہاں ہے۔اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ایک پڑھے لکھے آدمی نے اس کو شہید کیا۔۔۔۔معلوم ہوتا ہے کہ کسی بے حس اور بے مس پتھر نے وہ چینی کا برتن توڑ ڈالا جس کا قوام ہزار برس میں تیار ہوتا ہے''۔[۱۲]

چودھری محمد علی کے خطوط پر لطف ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی ہیں۔اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں انکی اپنی شخصیت پوری طرح جھلک جاتی ہے۔محمد علی ایک پختہ اور شائستہ کردار کے انسان تھے۔غالب کے بعد نجی خطوط میں تحریر کی دل آویزی اور لطفِ مطالعہ جو چودھری صاحب کے خطوط میں ملتا وہ اور کہیں نہیں ملتا۔ہما بیگم کو خط لکھ رہے ہیں اس میں جو انداز اختیار کر رہے ہیں وہ کچھ یوں ہے۔

''آج کل میں بہت پریشان رہا اور پریشان ہوں۔مگر میری پریشانی موٹاپے پن کی ہے۔سکھ روگ لگا ہے۔بعضے وقت خیال ہوتا ہے کہ کفرانِ نعمت کر رہا ہوں۔پھر عقل کہتی ہے۔

ہو جائے گا چھوٹی چھوٹی باتوں میں خفا
کیا تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے

اب مولوی لوگ ان کے کان بھر دیں تو اور بات ہے۔جیسا کھانا کھاتا تھا ویسے ہی کھانا کھاتا ہوں۔۔۔۔نیا ریشمی لحاف اوڑھتا ہوں، پھر اور کیا چاہئے۔مگر دل نہیں مانتا۔۔۔۔دکھڑا رونے کو اور کچھ نہ سہی تو یہی ہے کہ سلمان کا خط نہیں آتا۔''[۱۳]

اسی قسم کا ایک اور خط جو ہما بیگم ہی کے نام ہے۔دراصل چودھری محمد علی نے بہت زیادہ خطوط اپنی لاڈلی بیٹی ہما بیگم کو ہی لکھے ہیں جو اپنے باپ سے بہت قریب تھیں۔قریب ان معنوں میں کہ وہ انہیں بہت زیادہ چاہتے تھے اور ہر موضوع پر ان سے

---

[۱۲] ''کو یاد بستاں کمل کیا'' صفحات ۹۹ تا ۱۰۰ [۱۳] ایضاً، صفحہ ۷۰

گفتگو کرلیا کرتے تھے۔ اب دیکھئے کہ اس خط میں کیا انداز اختیار کیا ہے۔

''تمہارے بڑے اچھے خطوط آتے ہیں۔ جن سے آنکھیں ٹھنڈی اور دل سکون پذیر ہوتا ہے۔ اور میں پوسٹ کارڈ پر لکھ کر سمجھتا ہوں کوئی بڑا پالا مار لیا ہے''۔ ۱۴

ایک اور خط جس میں چودھری صاحب اپنے ریل کے سفر کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ ایک ہم سفر انہیں کیسا ملا۔

''سنو ایک قصہ سنو! ریل پر میرا اور ایک ہندو سوامی کا ساتھ ہوا۔۔۔۔ بکنے کی تو عادت ہے ہی میں اس سے کہنے لگا کہ دل کا آئینہ شگاف کرنے کی حسرت مجھ کو بھی ہے مگر مایا نہیں چھوڑتی۔ اس نے کہا میں تم کو بتاؤں۔ عورت کو ترک کر دو۔ میں نے کہا واہ سوامی جی واہ آپ یہ کہتے ہیں اور ہمارے آقائے ولی نعمت یہ حکم دیتے ہیں کہ بیاہ کرو، نسل بڑھاؤ، تعداد زیادہ کرو تاکہ تمہاری وجہ سے میں دوسری امتوں پر مباہات کروں۔ بھلا یہ مجھ سے کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے پھر اسی نفس پاک سے بے لوث مسکراہٹ سے جواب دیا ''اچھا خیر ایسے ہی چلے چلو۔ اس کے یہاں سب کی جگہ ہے''۔ ۱۵

۴۔ اردو کے مکاتیبی ادب میں ''گویا دبستاں کھل گیا'' کا مقام اور تنقیدی جائزہ:

جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے، تنقید کی ابتداء خطوط کے ذریعہ سے ہوئی اور آج بھی انگریزی ادب میں تنقیدی ادب کے بہت سے نمونے خطوط کی شکل میں ہی نظر آتے ہیں۔ خطوط میں جس آزادی کے ساتھ تنقید کی جا سکتی ہے وہ کسی اور صنف میں ممکن نہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اردو میں خطوط نویسی کی ابتدا غالب سے ہوئی۔ مگر ایسا نہیں ہے غالب سے پہلے رجب علی بیگ سرور نے خطوط لکھے ہیں اس کے علاوہ مکتوبات احمدی محمدی، رقعات عنایت علی، انشاء اردو وغیرہ اردو خطوط کے ابتدائی نمونے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ مرزا غالب نے مکتوب نگاری میں ایسا خوبصورت انداز اختیار کیا جو کوئی اور نہ کر سکا۔ غالب کے بعد خطوط کے بہت سے مجموعے شائع ہوئے مگر کسی میں بھی وہ خلوص و صداقت و برجستگی اور آمد نہیں جو غالب کے خطوط کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اردو خطوط نگاری کا ابتدائی دور فارسی انداز سے بہت متاثر ہے۔ غالب کی خطوط نویسی کی خصوصیات کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے خیالات کا اظہار اس انداز سے کرتے ہیں۔

''وہی القاب و آداب، وہی سرنامے، وہی عنوان، وہی اختتامیے، وہی رنگِ انشاء، وہی تکلف، وہی رنگینی۔ مگر انیسویں صدی کے ربع اول میں سادگی کا کچھ کچھ میلان پیدا ہوا۔ چنانچہ انشائے بے خبر سے ظاہر ہوتا ہے نئی طرز کی ایجاد کا سہرا صحیح معنوں میں غالب کے سر ہے۔ ۱۸۴۹ء کے لگ بھگ انہوں نے نئے انداز میں خط لکھ کر اردو میں نہ صرف مکتوب

---

۱۴ ''گویا دبستاں کھل گیا''، صفحہ ۵۹ ۱۵ ایضاً، صفحات ۸۷ تا ۸۸

نگاری کی طرزِ نو نکالی بلکہ خود اردو نثر کو بھی ایک بدیع طرزِ نگارش سے آشنا کیا۔ مرزا غالب کے خطوط اردو خطوط نگاری کی تاریخ میں منفرد امتیازات کے حامل ہیں۔۔۔۔ غالب نے۔۔۔۔ اپنی زندگی ہی میں اپنے خطوط شائع ہوتے دیکھے اور ان میں دلچسپی لی۔ یہ وہ خط تھے جن میں ذاتی معاملات اور عام مطالب کے علاوہ ان کی زندگی کے ہر قسم کے حالات ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ انکی مے نوشی اور عشق بازی کے تذکرے بھی آتے ہیں۔۔۔۔ ان کے خطوں میں ہم کلامی کی وہ بے گراں آرزو موجزن ہے جو کسی طور تسکین نہیں پاتی اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی فطرت کی پیاس جب شعر کی شراب سے بھی تشفی نہیں پاتی تو وہ نثر میں اپنی آرزوئے شوق کو ڈھونڈنے نکلتے تھے۔۔۔ غالب نے اردو خط نگاری میں جو نئے اسلوب پیدا کئے اس کے متعلق غالب شناسوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔۔۔۔ ان کی خط نگاری کی اہم بات شخصی تفصیلات کا جذباتی ذکر ہے۔۔۔۔ کہیں کہیں خود کلامی اور خود انتقادی بھی ہے۔ اس سے ان کے مطالب خط کے کناروں سے اچھل کر ادب کا دریائے بے کراں بن جاتے ہیں''۔ ۱۶

غالب کے خطوط کی مقبولیت سے اردو مکتوب نگاری کو ایک متعین ادبی مقام حاصل ہوا۔ غالب کے بعد خوش مزاق خطوط نگاری ان کے طرز کی تقلید کرتی نظر آتی ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد سرسید احمد خان کی تحریک نے اردو مکتوب نگاری پر بھی بہت اثر ڈالا سرسید احمد خان جس طرح سے نثر میں مدعا اور مقصد کے حامی ہیں اسی طرح خطوط نگاری میں بھی مقصد کے ہی طرف دار ہیں۔ غالب کے خطوط کی اشاعت اور مقبولیت کے بعد ہر طرف خطوط کے مجموعے شائع ہونے لگے۔ ان کی اشاعت سے ایک طرف تو ہمارے ادبی سرمایہ میں اضافہ ہوا اور دوسری طرف ان کے خطوط سے ہمیں بہت سی تاریخی، علمی، ادبی معلومات حاصل ہوئیں۔ دوسرے شائع ہونے والے خطوط میں سے سب کو وہ ادبی مقام نہ مل سکا جو غالب نے حاصل کیا۔ مگر ان لوگوں کے خطوں سے یہ فائدہ ہوا کہ بہت سے خطوط خود ادب کا حصہ بن گئے۔ جبکہ خطوط ادب پارے نہیں ہوتے اور نہ ہی اس بات کو ذہن میں رکھ کر خطوط لکھے جاتے ہیں کہ وہ ادبی شکل اختیار کرلیں گے۔ بعض لوگوں کے خطوط کی بے ساختگی طرزِ ادا بے تکلفی اور اندازِ بیان نے انہیں ادبی شکل دیدی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''خط نگاری خود ادب نہیں مگر جب اس کو خاص ماحول، خاص مزاج، خاص استعداد، ایک خاص آن، خاص گھڑی اور خاص ساعت میسر آجائے تو یہ ادب بن سکتی ہے۔ مگر خط کو ادب بنانے کا کام بہت مشکل ہے۔ یہ شیشہ گری ہے، شیشہ گری۔ اور پھر آئینہ ساز ہو کر بھی کم ہی لوگ ایسے ہونگے جو سچ مچ ایسا آئینہ ڈھال سکتے ہونگے جس کے جلوے خود تقاضائے نگاہ بن جائیں گے اور ہر نظارہ اپنے جوہر کی ہر ادبی لکیر کو مژگاں بنا دیں''۔ ۱۷

ڈاکٹر سید عبداللہ نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ خط کو ادب بنانے کا کام ''شیشہ گری'' ہے اور یہ ایسی شیشہ گری ہے جو

---

۱۶ اردو خط نگاری از ڈاکٹر سید عبداللہ، صفحات ۲۷ تا ۲۸ ۱۷ ایضاً، صفحہ ۱۸

آئینہ ساز کو تمام عمر کی جد و جہد کے بعد بھی مشکل سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ ہمارے مکاتیبی ادب میں جن لوگوں کے خطوط نے اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے ان میں غالب' سرسید احمد خاں' مولانا الطاف حسین حالی' شبلی نعمانی' نواب محسن الملک' وقار الملک' ریاض خیر آبادی' مولانا ابوالکلام آزاد' سید سلیمان ندوی' نیاز فتح پوری' عبدالماجد دریا آبادی' رشید احمد صدیقی' مجنوں گورکھپوری' فراق گورکھپوری' سر محمد اقبال' بابائے اردو مولوی عبدالحق' خواجہ حسن نظامی' جوش ملیح آبادی وغیرہ ہیں ان کے علاوہ تین اہم مجموعے اور بھی شائع ہوئے ہیں۔

نمبر۱: نقوشِ زنداں۔ جس میں سجاد ظہیر کے خطوط اپنی بہو کے نام ہیں۔

نمبر۲: زیرِ لب۔ صفیہ اختر کے خطوط اپنے شوہر جاں نثار اختر کے نام اور عزیزم کے نام ہیں۔

نمبر۳: ڈاکٹر تاثیر کے خطوط۔ انکے شاگرد عزیز محمود کے نام ہیں۔

خطوں کے ان مجموعوں کے علاوہ چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط کا مجموعہ ''گویا دبستاں کھل گیا'' اردو کے مکاتیبی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ''گویا دبستاں کھل گیا'' کا تنقیدی جائزہ لیں ہمیں پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ ان کے مکاتیب کے بارے میں اردو ادب کے بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی کیا رائے ہے اردو کے مکاتیبی ادب میں ''گویا دبستاں کھل گیا'' کا کیا مقام ہے۔ مالک رام جیسے بڑے ادیب اور نقاد چودھری محمد علی ردولوی کی خطوط نویسی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

''چودھری محمد علی نے یہ خط نہیں لکھے ہیں بلکہ ان کے قلم نے جس وقت وہ یہ باتیں سوچ رہے تھے ان کے ذہن و قلب کی تصویر کھینچ لی ہے۔ اب بھلا کیسے یہ ممکن ہے کہ کیمرے کی تصویر اصل سے مختلف ہو''۔ ۱۸

یہ صحیح ہے کہ اتنی سادگی' برجستگی و خلوص ہمیں اور کہیں نہیں ملتا اور یہی خصوصیات انکے مکاتیب کی جان ہیں۔ صلاح الدین احمد چودھری صاحب کی مکتوب نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

''مکاتیب محمد علی کی ادبی خوبیوں کی نسبت صرف اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ چودھری صاحب کو زبان و بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں پر جو بے پناہ قدرت حاصل ہے' وہ اس مجموعے کے قریب قریب ہر خط میں جھلکتی ہے اور بعض مکاتیب میں تو اس کے کرشمے ہر ہر سطر پر دل کا دامن کھینچتے ہیں اور پڑھنے والے کی نظر اس لطافت زار میں گم ہو کر رہ جاتی ہے''۔ ۱۹

چودھری محمد علی کی مکتوب نگاری کے سلسلے میں صلاح الدین احمد نے جو اپنی رائے کا اظہار کیا ہے وہ بالکل درست

---

۱۸ اردو کے منثور مکتوب نگار از مالک رام' صفحہ ۵۵

۱۹ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۱۲

ہے۔ نہ صرف یہ کہ انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے بلکہ پوربی زبان کا برجستہ استعمال عبارت کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اور جس خوبصورتی سے وہ پوربی الفاظ استعمال کرتے ہیں اس سے زبان کی لطافت اور لذت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

''گویا دبستاں کھل گیا'' پر مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے تبصرہ کیا ہے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے:

''گویا دبستاں کھل گیا'' ایک ایسے شخص کے خطوط ہیں جس نے خط نگاری کو زندگی کا ضروری شعبہ قرار دے رکھا ہے۔ ان خطوں کا مالک خط نگاری کو نہ صرف مسرت کا چشمہ خیال کرتا ہے بلکہ ان کو دانش و بینش اور بصیرتِ حیات کا ذریعہ بھی سمجھتا ہے۔ یہ خط ذہنی فراغت اور روحانی سکون سے لبریز ہیں۔ ان میں گھریلو پن بھی ہے اور حقیقت بھی۔ خط نگار کو اچھی گفتگو اور جزئیات نگاری سے خاص دلچسپی ہے۔۔۔۔ ان کے خطوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کامیاب ادیب اگر چاہے تو بات چیت اور تحریر کے درمیانی فاصلوں کو بالکل مٹا سکتا ہے۔ یہ خطوط اردو خط نگاری کی تاریخ میں ایک نئے مقام کی نشان دہی کر رہے ہیں''۔ ۲۰

چودھری محمد علی کا ہر خط اپنے اندر ایک خاص قسم کی دلچسپی رکھتا ہے اس میں طنز و بذلہ سنجی بھی ہوتی ہے اور محبت و خلوص بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ جو الفاظ استعمال کرتے ہیں ان میں پوربی زبان کی جھلک ہوتی ہے جس سے ان کی سادگی اور بے تکلفی کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل پوربی وہ زبان ہے جو قصبہ ردولی میں عام طور پر بولی جاتی تھی جہاں چودھری صاحب مقیم تھے۔ انہوں نے مکتوب نگاری میں جو پر کیف انداز اختیار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور شاید اسی وجہ سے ان کو اردو کا فطرت نگار ادیب کہا جاتا ہے۔ ان کے خطوط نے ان کے اسلوب بیان کی انفرادیت کے جوہر کو خاص طور سے نمایاں کیا ہے۔ اور ثابت کر دیا کہ ایک کامیاب ادیب اگر چاہے تو بات چیت اور تحریر کے درمیان فاصلوں کو ختم کر دے۔

شان الحق حقی نے ''گویا دبستاں کھل گیا'' پر اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح سے کیا ہے ''حق یہ ہے کہ غالب کے بعد نجی خطوط میں تحریر کی یہ دل آویزی اور لطف مطالعہ جو چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط میں ملتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔۔۔۔ کے خطوط (ہما بیگم) کے نام کسی علمی تصنیف یا محض ادب نگاری کا حیلہ و بہانہ نہیں اور پھر بھی عین ادب قرار پاتے ہیں۔ پر لطف و دل آویز ہونے کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں فکر انگیز بھی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی اپنی شخصیت ان میں پوری طرح جھلک جاتی ہے''۔ ۲۱

نقوش کے مکاتیب نمبر میں تمکین کاظمی نے اپنے ایک خط میں چودھری صاحب کی مکتوب نگاری کے سلسلے میں اپنے

---

۲۰ نقوش مکاتیب نمبر جلد اول۔ صفحہ ۳۸

۲۱ ''گویا دبستاں کھل گیا'' تعارف از شان الحق حقی۔ صفحات ۱۴ تا ۱۵

خیالات کا اظہار بہت ہی اچھے انداز میں کیا ہے۔اسی طرح مالک رام ''گویا دبستاں کھل گیا'' کی اشاعت پر اپنے تاثرات کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

''ابھی پچھلے دنوں ایک اور ایسا خطوط کا مجموعہ شائع ہوا ہے کہ اسے دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔اور اسے پڑھ کر وجدان وجد کرنے لگا' خدا کا شکر ہے کہ

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

میری مراد چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط سے ہے۔جو''گویا دبستاں کھل گیا'' کے بولتے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ان خطوں میں وہی بے ساختگی اور آمد ہے جو غالب کا حصہ تھی۔چودھری محمد علی کی ندرتِ زبان کی تعریف فضول ہے کہ وہ اس دریا کے پرانے شناور ہیں''۔۲۲

''گویا دبستاں کھل گیا'' کے مطالعہ کے بعد شہاب الدین صاحب چودھری محمد علی کو ایک خط لکھتے ہیں جس میں اپنے تاثرات کا اظہار اس انداز سے کر رہے ہیں:

''۔۔۔۔واللہ آج دو دن کے بعد اس قابل ہوا ہوں کہ سر اٹھاؤں۔آپ پوچھیں گے ارے میاں تم ہو کون؟ اور سر جھکائے کیا سر مار رہے تھے؟ سنئے تعارف کی مجھے عادت نہیں اور یاد آوری کا میں قائل نہیں۔میرا نام دیکھ کر آپ کو یاد ہو تو فبہا ورنہ کسی سے پوچھ لیجئے گا کہ جن صاحب نے اپنا یہ نام اور پتہ لکھا ہے وہ ہیں کون ذاتِ شریف۔

تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ارے بھئی سر مار نہیں رہے تھے سر دھن رہے تھے وہ ایک کتاب چرو میاں کی ''گویا دبستاں کھل گیا'' مجھے چڑھ گئی تھی۔پھر ہم تھے اور وہ۔ہم نہ تھکے کتاب ہی ختم ہو گئی۔جس طرح سرکس میں میاں جوکر کا گھوڑا تمت بالخیر ہو جاتا ہے اور وہ دم کی طرف سے پھسل پڑتے ہیں۔مگر نہ پیاس بجھی نہ سیری ہوئی۔جی چاہتا تھا کہ شیطان کی آنت ہو جاتی۔مگر اونٹ کے منہ میں زیرا ہو گئی۔اب بتائیں کہ ملی کیسے؟ عطیہ لاہور گئی تھیں اور وہاں سے یہ تحفہ ساتھ لائیں۔۔۔۔آپ کے خطوط پڑھے خوب جی لگا کر پڑھے۔کہیں پر روئے' کہیں پر ہنسے' کہیں پر اپنے حال پر خجل ہوئے' کہیں آپ کو دعائیں دیں' ہما پر بڑا رشک آیا' کاش ہم بھی کسی کی ہما ہوتے یا ہمارے کوئی ایسی عنقا ہما ہوتی۔پھر یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ پہلے محمد علی بنو پھر اس کی تمنا کرو۔مگر یہ تمنا بھی ویسی ہی ہے جیسے لیت الشباب۔خطوں کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ محمد علی کے ایسے دنیا میں کئے ہوتے ہیں۔اور ہمارے ایسے تو استنج کے ڈھیلے کی طرح مارے پھرتے ہیں۔زبان کتنی پاکیزہ اور شستہ' محاورات اور روزمرہ کا کتنا برمحل برجستہ استعمال پڑھ کر

---

۲۲ نقوش مکاتب نمبر' جلد اول۔صفحہ ۵۲

جی چاہتا ہے کہ پھر دہرایئے۔ خط کیا ہیں وسیع تجربات اور معلومات کا ایک خزانہ ہیں اور علم وفضل کی ایک کان جس میں سے ڈھلے ہوئے جواہرات اور ہیرے ابلے پڑ رہے ہیں۔ جس کا جی چاہے حسب توفیق دامن بھر لے۔ میرے پلے بھی بہت کچھ پڑ گیا۔ اگر بغیر پڑھے مر جاتا تو ایک نعمت سے محروم رہتا۔ صفحہ ۱۵۸ پر اللہ میاں سے آپ کا معاملہ ''ضرب کلیم'' سے کم نہیں۔ اور حضرت موسیٰ کے روائیتی قصوں سے ٹکر لیتا ہے۔ مجھے اس لئے اور بھی پسند آیا کہ اپنے خیالات کا عکس بجنسہ اس میں نظر آ گیا۔ دعائیں مانگتا تھا مگر مانگنا نہیں آتی تھیں۔ جس طرح کوئی بے چارہ کم علم اپنی عرضی نہ لکھ سکے نہ اپنا مدعا حاکم کے سامنے بیان کر سکے''۔ ۲۲ (الف)

ان تمام قد آور شخصیات کے تاثرات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ''گویا دبستاں کھل گیا'' مستحق ہے کہ اسے اردو کے مکاتیبی ادب میں اعلیٰ مقام سے نوازا جائے اور چودھری محمد علی ردولوی کو خراجِ عقیدت پیش کی جائے۔

۵۔ چودھری صاحب کے مکتوبات کا موضوعاتی جائزہ:

''گویا دبستاں کھل گیا'' کا پہلا ایڈیشن جو کہ ۱۰۵ خطوط پر مشتمل ہے اس میں پچاس خطوط ہما بیگم کے نام ہیں اور دو خطوط چھبن کے نام ہیں۔ دونوں بہنیں ہیں اور چودھری محمد علی کی صاحبزادیاں ہیں۔ بقیہ ۵۳ خطوط دیگر دوست احباب کے نام ہیں۔ ''گویا دبستاں کھل گیا'' کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن جو کہ ۱۸۰ خطوط پر مشتمل ہے اس میں ۱۱۸ خطوط ہما بیگم کے نام ہیں ۳ چھبن اور ایک بجن کے نام ہے یہ تینوں ہی چودھری محمد علی کی صاحبزادیاں ہیں۔ ۵۸ خطوط دیگر دوست احباب اور عزیز واقارب کے نام ہیں۔ گویا ۶۷٫۸% خطوط اپنی بیٹیوں کے نام اور ۳۲٫۲% خطوط دیگر حضرات کے لئے تحریر کئے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر ۶۵٫۶% خطوط ایسے ہیں جو صرف ایک ہی شخصیت یعنی ہما بیگم کو لکھے گئے ہیں۔ لہٰذا چودھری محمد علی کے خطوط کا ایک بڑا حصہ نجی موضوعات پر مشتمل ہے جس میں معاشرتی پہلو بھی نمایاں۔ ان کے اکثر خطوط ایسے ہیں جن میں انہوں نے اپنے بچوں سے جدائی کا ذکر کیا ہے۔ ایسے خطوط کو پڑھ کر انکی بے چینی و بے قراری کا احساس ہوتا ہے۔ چودھری صاحب نے زندگی بہت عیش وآرام سے گزاری تھی مگر زندگی کے آخری لمحات انکے لئے بہت تکلیف دہ تھے ان کا سب سے عزیز بیٹا سلمان جس سے وہ بہت پیار کرتے تھے وہ ان سے جدا ہو گیا تھا۔ اور شاید سلمان چودھری صاحب سے کچھ ناراض بھی تھے جس کی وجہ سے وہ بہت مضطرب رہتے تھے ان تمام باتوں کا ذکر وہ اکثر خطوں میں کرتے تھے' ہما بیگم کے تسلی بھرے خط کے جواب میں انہوں نے غالب کا یہ شعر لکھا تھا۔

---

۲۲ (الف) ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۳۴۷ تا ۳۴۹

کہتے تو ہو کہ ''بت غالیہ وہ آئے''
ایک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ ''وہ آئے''

آگے لکھتے ہیں کہ ''۔۔۔۔سلمان کا خط نہ لکھنا بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ کیونکہ باوجود ان کی خاموشی کے زندہ ہوں' کھاتا ہوں' پیتا ہوں' ہنستا ہوں' دوائیں بانٹتا ہوں' شعر پڑھتا ہوں' برج کھیلتا ہوں

یوں ہی صبح ہوگی' یوں ہی شام ہوگی
یہی رات دن کا تماشا رہے گا'' ۲۳

یہ بھی محبت کا انوکھا انداز ہے ایک طرف شکایت کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ ظاہر کررہے ہیں کہ انہیں کوئی پرواہ نہیں ہے زندگی انکے بغیر بھی کٹ رہی ہے۔ یہ انکی تحریر کا ایک انداز ہے ایک اور جگہ پر سلمان کا خط نہ آنے کی شکایت کرتے اور ہما بیگم سے سوال کرتے ہیں کہ ''۔۔۔۔ یہ سلمان مجھ کو خط کیوں نہیں لکھتے کوئی شکایت ان کو مجھ سے ہے؟ میں نے تو اپنے خیال میں کوئی تکلیف ان کو نہیں پہنچائی۔

رہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

میں اسی طرح زندہ ہوں' ہنستا بھی ہوں' مضامین بھی لکھتا ہوں' برج بھی کھیلتا ہوں مگر سلمان والی کھٹک برابر رہتی ہے''۔ ۲۴

چودھری صاحب کے اس خط کا موضوع بھی وہی ہے کہ سلمان نے خط نہیں لکھا۔ انکے خط کی عبارت کے ایک ایک لفظ سے شکایت جھلک رہی ہے۔ اسی قسم کی شکایت بھرا ایک اور خط ہما بیگم کو لکھتے ہیں۔ اور ان سے شکوہ کرتے ہیں کہ تم اپنے بھائی کی وکالت کرتی ہو۔

''۔۔۔۔تمہارا خط سلمان کی وکالت میں پہنچا۔ سلمان کے Sense of duty پر ہمیشہ مجھ کو فخر اور ناز رہا ہے اور ہے۔ اللہ میاں کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھ کو ایسا لڑکا عطا ہوا۔ مگر پیاسا بغیر پانی کے تسکین نہیں پاتا۔ اس وقت تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہزار مصروفی ہو ایک پوسٹ کارڈ تو بس میں بیٹھے بیٹھے بھی لکھ سکتے تھے۔۔۔۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا'' ۲۵

---

۲۳ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۶۸ ۲۴ ایضاً' صفحات ۱۶۳ تا ۱۶۴ ۲۵ ایضاً' صفحہ ۱۷۴

اس خط میں اپنے ہونہار بیٹے پر فخر بھی کر رہے ہیں اللہ کا شکر بھی ادا کر رہے ہیں مگر وہ جو ایک پیاس سلمان کی آمد یا ان کے خط کے آنے سے بجھ سکتی ہے وہ نہیں بجھ پاتی اس پیاس کا ذکر وہ اپنی تحریر میں جا بجا کرتے ہیں۔ اور مثال کے طور پر کوئی نہ کوئی شعر لکھ دیتے ہیں۔ اس خط کا موضوع بھی سلمان ہی ہیں اور سلمان کے ہی موضوع پر ایک اور خط ہما بیگم کو لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔ میاں سلمان کے بارے میں معلوم ہوا کہ اب پاکستان نہیں آ رہے ہیں۔ ہم کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ جیسے میاں گھر رہے ویسے رہے بدیس۔ ان کی یاد سے ایک گونہ تکلیف سی ہوتی ہے'' ۲۶

چودھری صاحب کو خبر ملی ہے کہ سلمان پاکستان نہیں آ رہے ہیں اس کا اظہار وہ اس مصرعہ سے کرتے ہیں اور اپنی تکلیف کے بارے میں اس انداز سے بتا رہے ہیں کہ ''ہم کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی'' حالانکہ انہیں بہت تکلیف ہوئی یہ انداز بھی انکی تحریر کی ایک خصوصیت ہے جو غالب سے ملتی جلتی ہے۔ اسی لئے انہیں غالب جیسا مکتوب نگار کہا جاتا ہے۔

چودھری صاحب کے تقریباً بیس خطوط ایسے ہیں جن کا موضوع سلمان ہیں اور ان کا خط نہ آنے اور کسی بھی قسم کا رابطہ نہ رکھنے کی شکایت۔ اگر اسی طرح اس موضوع پر خطوط کی نقل کی جائے تو کتاب کا ایک بڑا حصہ نقل ہو جائے گا اور انکی شکایت ختم نہ ہوگی۔ چونکہ چودھری صاحب کے خطوط کی تعداد نجی موضوعات پر زیادہ ہے لہذا اس کے جستہ جستہ فقرے پیش کئے گئے ہیں۔ ان خطوط میں نجی موضوعات کے علاوہ معاشرتی پہلو بھی جگہ جگہ نمایاں ہیں۔ انسانی نفسیات کے وہ بہترین نباض ہیں۔

ایک خط مولانا عابد شہر صاحب کو لکھتے ہیں اس کا انداز یہ ہے۔

''۔۔۔۔ اس وقت اگر تم لندن بھی چلے جاؤ گے تو ہم پرواہ نہ کریں گے۔ مگر جب تک یہ صورت نہیں ہے۔۔۔ ان کے لئے یہ دل بے کل ہے ہی۔ تم ہوئے، ہما ہوئیں، کجن، چھبن، الن ہوئیں اور اتر کر دو چار اور ہوئے ان سب کی یاد ستایا کرتی ہے۔ سلمان نے دوسری ترکیب نکالی ہے۔ انہوں نے سوچا اگر ہم اس کو خط نہ لکھیں گے تو اس کو غصہ چڑھے گا اور جب اس کے دل میں شکایت پیدا ہو جائے گی تو یہ کہے گا' اوہ جی اگر کوئی ہماری پرواہ نہیں کرتا تو ہم بھی اس سے فارغ ہیں۔ اور اس طرح سے اس بڈھے خرف کی تکلیف کم ہی ہو جائے گی۔ جب یہ مرے گا تو بہنوں کو اور دوسروں کو تاسف کے خطوط لکھ دیں گے۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر کچھ صفات بیان کر دینگے کہ اردو اچھی لکھتے تھے ہاہا بڑا افسوس ہے۔ قیصر کو لکھ دیں گے کہ تم گھبراؤ نہیں میاں جان نہیں رہے تو کوئی بات نہیں ہم تو ہیں'' ۲۷

---

۲۶ ''کو یاد بستاں کھل کیا'' صفحہ ۳۱۹

۲۷ ایضاً، صفحہ ۲۲

اس خط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کی جدائی سے بہت دکھی تھے۔ اور اس کرب کا اظہار وہ اپنے مخصوص انداز سے کر رہے ہیں جو انکی تحریر کی پہچان ہے۔ اس خط کا موضوع نجی تو ہے ہی مگر اس میں انہوں نے انسانی نفسیات کو بڑے ہی ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے مثال کے طور پر سلمان کے تاثرات ان کے مرنے کے بعد کیا ہو سکتے۔

اسی انداز کا ایک خط چودھری محمد علی اپنے دوست عزیز صاحب وکیل کو لکھتے ہیں۔

''۔۔۔۔جن کو ہم چاہتے تھے اور جو ہمیں چاہتے تھے وہ بچھڑ گئے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں'' ۲۸

یہ خط چودھری محمد علی اپنے دوست کو لکھتے ہیں مگر موضوع تخاطب نجی ہی ہے مخصوص انداز میں اپنے دل کا حال اور اپنی تنہائی کا کرب بیان کر رہے ہیں اور اپنے مزاج کے مطابق میر تقی میر کا شعر مثال کے طور پر پیش کر رہے ہیں جو ان کی دلی کیفیات کی عکاسی کر رہا ہے۔

ایک خط چودھری محمد علی صلاح الدین صاحب کو لکھتے ہیں۔ ان کے خط کا اصل موضوع ان کی تصنیف کردہ کتاب ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' ہے۔ اس کتاب کا کاتبوں اور ناشروں نے برا حال کر دیا۔ اس کی خبر اپنے مخصوص انداز تحریر میں دے رہے ہیں۔

''۔۔۔۔''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' امید ہے کہ ڈھائی برس کے بعد پریس سے آجائے۔ جیسے ہی آگئی حاضر کر دوں گا۔ مگر صلاح الدین صاحب! چھاپنے والے نے کیا ظلم کیا ہے۔ چھپائی ایسی ہے جیسے یتیم بچے کا منہ ہوتا ہے۔ غلطیاں ایسی ہیں کہ جیسے برے گھر کی لونڈی ہوتی ہے۔ کتاب مسخ ہو کر رہ گئی ہے اور ہم ہیں کہ بے بس' بے اختیار' دم بخود بیٹھے ہیں'' ۲۹

اس خط میں معاشرتی پہلو بھی ہے اور نفسیاتی بھی اور برجستہ تشبیہات کا استعمال بھی' ساتھ ساتھ وہ شکایات بھی جو ناشر اور کاتب سے ہوتی ہیں اور کتاب چھپوانے والا واقعی بے بس ہوتا ہے۔ چودھری صاحب نے انتہائی انکساری کے ساتھ معاشرے کی بدحالی کی نشاندہی کی ہے۔

ایک خط اپنے دوست ہاشمی صاحب کو لکھتے ہیں۔ یہ تعزیتی خط ہے۔ لیکن تعزیت کرنے کا انداز وہی غالب جیسا ہے' عام روش سے ہٹ کر باتیں کرتے ہیں۔ عبارت کا موضوع تعزیت ہی ہے۔ لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔میں ناتجربہ کاری کے زمانے میں تعزیت اور پرسے پر بہت ہنسا کرتا تھا۔ میری ایک لڑکی جو بہت دنوں

---

۲۸ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۳۱ ۲۹ ایضاً' صفحہ ۷۲

سے بیمار تھی (اس کے علاوہ چار لڑکیاں اور بھی تھیں) وہ گذر گئی۔ صبح کو ایک صاحب تعزیت کو آئے۔ بے چارے کم سخن تھے۔ آ کر چپ بیٹھ گئے۔ میں نے کہاں ہاں تو پھر شروع کیجئے۔ بچی کیا بیمار تھی، مجھ کو اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ خدا آپ کو صبر دے' وہ بے چارے پریشان ہو گئے۔ اس کے بعد میرا اکلوتا لڑکا گذر گیا۔ اس واقعے کے بعد ایک دیہاتی جاہل ملاقاتی نے ہمدردی کی۔ عجیب بھونڈے طریقے سے اس نے مجھ کو تسکین دی' مگر یہ معلوم ہوا کہ جیسے زخم پر کسی نے مرہم رکھ دیا۔ اس نے کہا۔ ''وہ لڑکا تمہارا تھا ہی نہیں اگر تمہارا ہوتا تو تمہارے پاس رہتا نا' وہ جس کا تھا اس نے لے لیا۔ تم کیوں رنج کرتے ہو؟'' ہاشمی صاحب! اس وقت بھی وہ زخم ہرا ہے اور اس وقت بھی وہ مرہم اپنا کام کر رہا ہے۔ اس کے بعد سے میں ہر پہلو سے تعزیت کی قیمت سمجھنے لگا اور اسی وجہ سے یہ صفحہ سیاہ کیا کہ شاید دلی ہمدردی غم میں کچھ افاقہ کرے'' ۳۰

اس خط میں چودھری محمد علی نے اپنے ذاتی غم کو خط کا موضوع بنایا ہے اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب تک ہم خود اس غم سے آشنا نہیں ہوئے اس وقت تک اس کسک سے بے خبر تھے۔ مگر جب ہم نے چوٹ کھائی تو ہمیں معلوم ہوا کہ تعزیت کس لئے کی جاتی ہے' لوگوں کو تسلی و تشفی کیسے دی جاتی ہے۔ اس خط میں بھی لوگوں کی نفسیات بتائی ہے۔ اس خط کا موضوع خاص لوگوں کے نفسیاتی پہلو کی عکاسی ہے۔

چودھری محمد علی کے مزاح کی حس بھی بہت تیز تھی۔ بذلہ سنجی اور ظرافت ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ اگر وہ کسی اور پر نہیں ہنس سکتے تھے تو اپنے آپ کو ہی اس کا نشانہ بنا لیتے تھے۔

ڈاکٹر حسین ظہیر کا چودھری صاحب کے اچھے دوستوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کا خط بہت دنوں سے نہیں آیا ہے اور نہ ہی ملاقات ہوئی ہے اب چودھری صاحب ان کو جو خط لکھتے ہیں اس کا انداز کچھ یوں ہے:

''۔۔۔۔ زمانہ اور اسباب زمانہ اتنے دوسرے ہو گئے ہیں کہ نہ معلوم کتنے ہیں کہ جن سے مل کر جی خوش ہوتا تھا۔ اور اب برسوں خبر بھی نہیں ہوتی۔ خود ہمارے ساتھی تو قریب قریب ختم ہو چکے۔ بھلے کو ہم نے اپنے سے کم سن لوگوں سے رسم بڑھالی تھی۔ گویا سینگ کٹا کے بچھڑوں میں داخل ہو گئے تھے مگر خدا کا کرنا ایسا ہے کہ ان سے بھی واسطہ نہ رہا۔ اب دو ایک بڈھے رہ گئے ہیں' ان سے کبھی ملاقات ہو جاتی ہے۔۔۔۔ ایک ایک پرانا قصہ بیس بیس بار بیان ہوتا ہے۔ سنتے سنتے جگہیں مقرر ہو گئی ہیں کہ کس مقام پر ہنسنا چاہئے اور کس پر افسوس کرنا چاہئے اور کس مقام پر تعجب کرنا چاہئے۔۔۔۔ ہم کو اس وقت سیدہ کا جو چہرہ یاد آیا۔۔۔ جس پر بے شکن جوانی کھیل رہی ہے۔ تمہارا چہرہ بھی وہی صاف امنگ کا بھرا یاد ہے۔ اب نہ معلوم کتنی شکنیں

---

۳۰ ''کو یا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۱۱۷ تا ۱۱۸

تجربہ کی پڑ گئیں ۔ ہماری لڑکیاں کجن' الن' ہما سنا ہے بڑھیاں ہوگئیں ۔ (عالیہ میں ماشا اللہ ابھی خفیف جوانی کی جھلک دکھائی دیتی ہے)۔ سنا ہے سلمان کے ماتھے کے بال اڑ گئے ۔ گالوں پر بڑھاپے کا گوشت بھر آیا ہے ۔ جب یہ حال ہو تو ہمارے چہرے کا کیا پوچھنا ۔ کوشش کرتے ہیں کہ خط بنانے میں بھی اپنے چہرے پر نظر نہ پڑے اور اگر پڑ جاتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ ایک تھپڑ ماریں ۔ معلوم ہوتا ہے شیخ حبیب اللہ مرحوم کے والد شیخ عنایت اللہ مرحوم بیٹھے ہیں ۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی تو اعزہ میں دو ایک جوان لڑکیوں کی مائیں جن کو حسد ہوتا تھا ان میں سے ایک تھیں جو ہماری بی بی مرحومہ سے جلن نکالنے کے لئے کہتی تھیں کہ ''ارے دولھا کی چاند ایسی صورت دیکھ کر شیعہ ہو جائے گی'' ۔ آج یہ قصہ جس سے بیان کریں وہ کہے یہ بڑھا بہت جھوٹ بولتا ہے'' ۔ ۳۱

چودھری صاحب کا یہ خط نجی نوعیت کا ہے ۔ عبارت کا موضوع طنز و مزاح پر مبنی ہے ۔ اس میں بھی انسانی نفسیات کے بارے میں بتایا ہے کہ انسان اپنے آپ کو کیسا دیکھنا پسند کرتا ہے اور اس کی سوچ کیا ہے ۔

چودھری محمد علی کا ایک اور مزاحیہ خط جس میں وہ دو کائستھ لوگوں کا ذکر کرتے ہیں اور مثال میں اپنے آپ کو مزاح کا نشانہ بناتے ہیں ۔ دراصل چودھری صاحب کی کمر میں چک آ گئی ہے اس کی اطلاع اپنے دوست خورشید صاحب کو دیتے ہیں ۔ انداز کچھ یوں ہے :

''۔۔۔۔ آج کل علاوہ روحانی تکلیف کے ایک جسمانی تکلیف بھی اضافہ ہوگئی ہے یعنی کمر میں سخت چک آ گئی ہے ۔ آپ کہیں گے کہ یہ کون ایسی مصیبت تھی جس کی بنا پر احباب سے خراج ہمدردی وصول کیا جائے ۔ حضرت بات یہ ہے کہ ایک بار دو کائستھ میرے پاس ایک غرض لے کر آئے اور بہت چالاکی سے اپنا مطلب نکالنے میں مصروف ہوگئے ۔ میں نے کہا ۔ ''ہو نہ کائستھ اپنا مطلب نکالنے کے لئے دوسروں کے نقصان کی پرواہ نہیں کرتے ہو'' ۔ انہوں نے جواب دیا ''ہم وہ کائستھ نہیں ہیں جو آپ سمجھتے ہیں'' ۔ اسی طرح میری کمر کی چک وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں ۔ یہ ایسی چوک ہے جو نماز میں پچنی بنا دیتی ہے'' ۔ ۳۲

اس خط میں چودھری صاحب ایک طرف اپنی کمر میں چک آ جانے کے بارے میں بتا رہے اور دوسری طرف مثال میں دو کائستھ لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں اور انہیں مطلبی ظاہر کر رہے ہیں اور وہ کائستھ اپنی صفائی یہ کہہ کہ پیش کر رہے ہیں کہ ہم اس قسم کے کائستھ نہیں ہیں جیسے آپ سمجھ رہے ہیں یعنی صرف مطلبی نہیں ہیں ۔ دوسری طرف اپنی کمر کی تکلیف کی بھی وضاحت

---

۳۱ ''کو یا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۶۳ تا ۶۴ ۳۲ ایضاً' صفحہ ۹۸

کر رہے ہیں کہ وہ تکلیف نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ یعنی کہ دونوں باتیں مبہم ہیں۔ کائستھ چودھری صاحب سے کیا طلب کر رہے تھے نہیں معلوم۔ اسی طرح سے دوسری تکلیف کمر کی کیا ہوسکتی ہے نہیں معلوم۔ یہ ایک نفسیاتی سوچ ہے کہ انسان کا ذہن پہلے کس جانب جائے گا کہ کمر میں چک آنے کی وجہ کیا ہے اور اس کی وضاحت خود ہی چودھری صاحب کر دیتے ہیں کہ نماز میں پٹخنی کھا جانے کی وجہ سے چک آئی ہے تاکہ وہ کچھ اور نہ سوچ لیں۔ اور شاید اسی وجہ سے کائستھ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس خط میں انسانی فطرت کی وضاحت کی گئی ہے۔ آگے چل کر انہوں نے خورشید صاحب کے نام ایک اور خط لکھا ہے' جن کے دو خطوط آ گئے ہیں اور اب چودھری صاحب انہیں جواب دے رہے ہیں اس خط میں وہ معذرت کس انداز سے کر رہے ہیں:

''۔۔۔۔آپ کا محبت نامہ آیا تھا اور جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے جواب بھی لکھا تھا۔ مگر قسم نہیں کھاؤں گا۔ ممکن ہے لکھنے کا ارادہ ہی کرتے کرتے رہ گیا ہوں۔ بہرحال اگر وہ خط میں نے نہ بھی لکھا ہو تو آپ از ڈاک خانہ دور رہے ہوں مگر از دل دور کبھی نہیں رہے۔۔۔۔ میں زندہ ہوں اور ابھی تک۔ چلا جاؤں تو افسوس کر لیجئے گا۔ مگر تعجب کی گنجائش نہ ہوگی۔ ادھر کچھ بڑھاپے کی وجہ سے شکایتیں بڑھ گئیں ہیں۔۔۔۔ بچوں کی مفارقت کا پرانا قصہ ہے۔۔۔۔ میری ایک کتاب ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' دو برس سے ایک ظالم مطبع والے کے یہاں پڑی ہے۔ دوسرا رسالہ ''میرا مذہب'' تیار ہے۔ چاہتا تھا ان دونوں کو چھپا ہوا دیکھ لیتا تو جی خوش ہو جاتا۔ صوری اولاد کو نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ معنوی ہی اولاد کو کھیلتے دیکھ لیتا تو جی خوش ہو جاتا۔ آج کل ''صحیفہ کاملہ'' اکثر دیکھتا ہوں۔ اردو کا ترجمہ تو کچھ نہیں مگر فارسی کے ترجمے میں کچھ جھلک اصل کتاب کی آ جاتی ہے۔۔۔ ''صحیفہ علویہ'' بھی نظامی پریس نے چھاپا ہے۔۔۔۔ مذہب میں چھری کٹاری تو بہت دیکھی ہوگی۔ مذہب کا مرہم' مذہب کی فرحت' مذہب کی ٹھنڈک' مذہب کی خوش گواری جیسے صبح کی ٹھنڈا ہوا' ذری ان کی بھی سیر کیجئے''۔[۳۳]

چونکہ چودھری صاحب خورشید صاحب کے خط کا جواب نہیں دے سکے ہیں لہذا بہت ہی خوبصورتی سے معذرت کر رہے ہیں تاکہ خورشید صاحب ان سے بدگمان نہ ہوں۔ چودھری صاحب مزاحیہ انداز سے اپنے اوپر طنز کر رہے ہیں مختلف قسم کی پریشانیوں کا رونا روتے ہوئے اپنی تصنیف ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ وہ ایک ظالم مطبع والے کے یہاں پڑی ہے تقریباً دو سال سے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناشر نے انہیں بہت پریشان کر رکھا ہے۔ دوسری تصنیف ''میرا مذہب'' بھی چھپوانا چاہتے ہیں مگر انکی مرضی کے مطابق ابھی تک دونوں نہیں چھپ سکی ہیں۔ چاہتے ہیں کہ دونوں ایک ساتھ ہی خورشید صاحب کو بھیجیں مگر آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔ جب سے ان کے بچے ان سے دور ہوئے انہوں نے اپنا دل لکھنے پڑھنے میں لگانے کی کوشش کی جس کا اظہار اس انداز سے کرتے ہیں کہ ''صوری اولاد کو نہیں دیکھ سکتا ہوں۔

---

۳۳ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۱۴۳ تا ۱۴۴

معنوی ہی اولاد کو کھیلتے دیکھ لیتا تو جی خوش ہو جاتا''۔یعنی ان کی خواہش یہ تھی کہ اگر کتابیں چھپ جاتیں تو انہیں قدرِ سکون مل جاتا۔اور وہ کتابیں پڑھ کر ہی اپنا دل بہلا لیا کرتے۔ایک کتاب جس کا نام ''صحیفہ علویہ'' ہے نظامی پریس نے چھاپی ہے اس میں کچھ الفاظ کی تکرار کی گئی ہے اور خورشید صاحب سے کہہ رہے ہیں کہ آپ بھی اس کا مطالعہ کیجئے۔اس خط کا موضوع ادبی بھی ہے معاشرتی بھی اور نفسیاتی بھی۔چودھری صاحب نے مطبع کی فطرت بتائی ہے کہ یہ لوگ جان بوجھ کر کام میں تاخیر کرتے اور ستاتے ہیں۔انسان کو ذہنی کوفت میں مبتلا کرتے ہیں۔اسی طرح کا ایک اور خط ہے۔چودھری محمد علی نے اپنے دوست حمایت الحسن کے خطوط کے جواب نہیں دیئے۔مگر اب جو خط انہیں لکھ رہے ہیں اس میں معذرت کا بہت ہی دلچسپ انداز اختیار کیا ہے جو کچھ یوں ہے:

''مائی ڈیئر مولانا۔ایک عورت تھی وہ بڑی ہنس مکھ تھی۔جس مرد کو دیکھتی تھی ہنس دیتی تھی۔اس کے شوہر کو کچھ یہ بات پسند نہ تھی۔عشق است و ہزار بدگمانی!اس نے اپنے شوہر کو اطمینان دلایا۔''ہنسنا میرا سجاؤ ہلم تم چنتا نہ مانیو''۔یہی حال میری کوتاہ قلمی کا ہے۔آپ اپنے خطوطِ محبت کا جواب دیر میں پا کر الجھا نہ کیجئے۔اگر میں روز روز خطوط کا جواب دیا کروں تو اتنی تمہیدیں کہاں سے پاؤں اور میرے خطوط بجائے میری عقیدت کے ترجمان ہونے کے جمعرات کا آموختہ ہو کر رہ جائیں۔۔۔۔ارے بھئی خوب یاد آیا میں ٹھاکر صاحب کا نام بھول گیا۔جس کے یہاں چائے پی تھی اور برج کھیلا تھا۔ارے بھئی وہی چھترپا کالج کے ہیڈ ماسٹر۔ان کو نہ معلوم ہو کہ میں ان کا نام بھول گیا۔ورنہ ان کو میری بات اوچھی معلوم ہوگی اور مجھ کو خفت ہوگی۔۔۔۔ان کی کتابیں دیکھ کر ان کے پڑھے لکھے خوش علم ہونے کا اثر ہوا تھا۔اسی کے ساتھ یہ کمی بھی محسوس ہوئی تھی کہ بجائے خود اپنے دماغ سے باتیں نکالنے کے شیکسپیئر اور ملٹن کا مال گدڑی بازار میں لئے بیٹھے رہتے ہیں''۔[۳۴]

اس خط کے شروع میں چودھری صاحب نے ایک خاتون کا ذکر کیا ہے جو بہت ہی خوش مزاج تھیں اور ہر ایک مرد سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھیں اور پھر اپنے شوہر سے کہتی تھیں کہ آپ پریشان نہ ہوں یہ تو میرا گفتگو کرنے کا انداز ہے۔اب چودھری صاحب اپنے خط نہ لکھنے کی وجہ بتاتے ہیں کہ اگر میں خط کا جواب نہیں دیتا تو یہ میری عادت ہے بالکل اس عورت کی طرح اس لئے تمہیں بدگمان نہیں ہونا چاہئے۔آگے لکھتے ہیں کہ اگر میں روز روز خط لکھوں گا تو پھر اس میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی اور وہ دلچسپی ختم ہو جائے گی جو لوگ چاہتے ہیں۔پھر اس کی مثال بہت خوبصورت دی ہے کہ جمعرات کا آموختہ ہو کر رہ جائے گا۔چودھری صاحب کمال ہوشیاری سے ایک طرف تو خط کا جواب نہیں دیتے اور دوسری طرف توضیح انتہائی مدلل

---

[۳۴] ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۱۵۳ تا ۱۵۴

پیش کرتے ہیں۔ اسی خط میں ایک ہیڈ ماسٹر کا ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ کچھ وقت گزارا تھا ان کا نام بھول گئے ہیں مگر اپنی فطرت کے مطابق کسی کی دل آزاری انہیں گوارہ نہیں اس لئے انہوں نے منع کیا ہے کہ ہیڈ ماسٹر کو نہ بتانا کہ میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ ان کی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے مگر انکا اندازِ تحریر اپنا نہ ہونے کی وجہ سے افسوس کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس خط میں بھی انسانی نفسیات کی عکاسی ہو رہی ہے۔

چودھری صاحب اپنے ایک بہت ہی عزیز دوست شاہ آفاق احمد کو جو کہ عمر میں ان سے بہت چھوٹے تھے' اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتے تھے۔ ان کی جدائی انہیں بہت شاق گذرتی تھی۔ اگر وہ ایک دو دن کے لئے بھی ردولی سے باہر جاتے تھے تو چودھری صاحب تڑپ اٹھتے تھے۔ ایک بار شاہ آفاق بنارس گئے وہاں سے اپنی خیریت کا جو خط انہوں نے لکھا اس کا جواب چودھری صاحب نے کچھ اس انداز سے دیا ہے:

''میری آنکھ کا نور میرے دل کا سرور آفاق بیٹا سلمہ! دعائیں دلی۔ تمہارا خط آیا جتنی باتیں تم نے لکھیں ہیں وہ سب میرے دل میں سماگئیں اور میرے دل کے تار انہیں باتوں سے مل گئے۔ ہر تار انہیں سروں میں سانس دینے لگا۔ محبت بھی عجیب نعمت ہے کہ سینکڑوں کوس بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور ظاہر میں دیکھو تو چپ ہیں۔ میں باوجود تمہاری مفارقت کے اچھا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ از دیدہ دور از دل قریب' محسوس کر رہا ہوں۔۔۔۔ بقول شاعر

''نجریا سے جیا بھر دیہوں' چھوئے نہ دیہوں سریر''

یہ دریافت کرتے ڈر لگتا ہے کہ کب تک آؤ گے۔'' بہر حال جہاں رہو نیکے رہو تم ہمرے سیندروا کے بھاگ''۔۔۔۔ کل چودھری نعمت اللہ مجھ کو دیکھنے آئے تھے۔ بڑا دل خوش ہوا جیسے جسم میں طاقت آگئی اور دل کے چمن میں پھول کھل گئے البتہ کھانے پر تمہاری جگہ خالی تھی۔ سیخ کے کباب اور چقندر کی ترکاری گوشت کے ساتھ تم نہیں تھے۔ اس لئے مجھ کو یہ معلوم ہوا جیسے نمک کم ہے۔ اس وقت صبح کا وقت ہے۔ میاں جعفر پوسٹ کارڈ کا کونا پکڑے اس طرح سے کھڑے ہیں کہ میرے چہرے پر دھوپ نہ پڑے تا کہ میرے حواس دماغ سے نہ نکل جائیں۔۔۔۔ میں خود کیا کہہ رہا ہوں۔ اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا تمہارا ازکام اچھا کرے اور تمام بری باتوں کو تم سے دور رکھے اور تمام اچھی باتوں کو تم سے قریب کرے۔ آمین ثم آمین' راقم تمہارا دعا گو عفی عنہ'' ۲۱ رفروری ۱۹۵۸ء ۳۵

یہ خط ہندوستان کے رسالہ ''نوائے طلبا'' میں چھپ چکا تھا جسے شارب ردولوی نے غیر مطبوع تصور کر کے اپنی تصنیف ''تنقیدی مطالعے'' میں شائع کیا۔ چودھری صاحب کا یہ خط موضوع کے لحاظ سے نجی ہے اس میں اپنی دلی کیفیت بتائی

---

۳۵ ''تنقیدی مطالعہ'' از شارب ردولوی' صفحات ۲۱۳ تا ۲۱۵

ہے یہ خط چودھری صاحب کی ذہنی نفسیات کی عکاسی کر رہا ہے۔ سلمان کی بے توجہی اور دوسرے عزیزوں کی دوری کی وجہ سے وہ غیروں کو اپنا بنا کر ان میں اسی قسم کا پیار ڈھونڈ رہے ہیں جو اپنوں سے نہیں ملا۔

اسی قسم کا ایک خط وہ اپنے چھوٹے بیٹے سعید کو لکھ رہے ہیں۔ جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ ان کو کچھ ہدایت دیتے ہیں۔

''مائی ڈیئر سعید!

میرا بیٹا ناغے نہ ہوا کریں۔ شکایت کا خط آیا تھا تم ناغے بہت کرتے ہو۔ مجھے امید ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کا تم کو اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اور کیا لکھوں موت کا ہر وقت انتظار دیکھا کرتا ہوں۔

سیاں آون کی بھنکیں بریاں' در جو اٹھاری رہوں'' (۱۴ر نومبر ۱۹۵۸ء) ۳۶

چودھری صاحب کے اس خط کا موضوع نجی ہے۔ وہ سعید کی تعلیم کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں انہیں انکی ذمہ داریوں کا احساس دلا رہے ہیں اور اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے زندگی سے مایوس نظر آ رہے ہیں۔ چودھری صاحب اپنے دوست خواجہ غلام السیدین کو خط لکھ رہے ہیں اس میں انہوں نے کچھ مشورے مانگے ہیں۔

''۔۔۔۔صرف یہ استدعا ہے کہ ہمیشہ کی طرح دل بڑھانے والا مشورہ دیجئے گا' اور اس نیم کور مفلوج کی دعائیں لیجئے گا اور آس نہ توڑیے گا۔

کیا کہیں خواجہ صاحب موت اور زندگی کے درمیان جھول رہے ہیں۔ اگر اعمال کی سزا ہے تو مالک یوم الدین کا عدل ہے اور اگر تخفیف عذاب کی صورت ہے تو الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم''۔ ۳۷

چودھری صاحب کا یہ خط بھی موضوع کے اعتبار سے نجی نوعیت کا ہے اس خط سے ان کی بے بسی کا اظہار ہوتا ہے۔ بہر حال وہ ہر طرح سے اپنے رب کے شکر گزار ہیں۔ یہ خط انکی منفی سوچ کی عکاسی کر رہا ہے۔

چودھری محمد علی کے بے شمار خطوط موضوع کے اعتبار سے نجی نوعیت کے ہیں کچھ خطوط ایسے ہیں جن میں سیاسی پہلو نمایاں ہے مثال کے طور پر یہ خط وہ ہمایوں مرزا کو اس طرح لکھتے ہیں۔

''۔۔۔۔آپ کے ذہن پر مجھ کو رشک ہے۔ آپ کے خیال پر غبطہ ہے اور یہ افسوس ہے کہ میں آپ کا ایسا کیوں نہ ہوا۔ کیا کروں آدمی تاریخ کا بچہ ہے اور تاریخ سے بچ کر نکل جانا سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ مگر اللہ میاں کی دنیا صرف ہمایوں مرزا

---

۳۶ ''تنقیدی مطالعے'' از شارب ردولوی صفحہ ۲۱۵ ۳۷ ایضاً، صفحہ ۲۱۴

صاحب اور محمد علی سے تو بنی نہیں ہے۔ یہاں تو مولوی عبدالشکور صاحب بھی ہیں اور مولوی مہدی حسن صاحب بھی ہیں اور علی ظہیر بھی۔۔۔۔ جب تک روپیہ دنیاوی آرام کی کنجی ہے جب تک ایک سے دوسرا چالاک ہے۔۔۔۔ سب سے بہتر زمانہ جو اسلام کا تھا یا عیسائیت کا یا یہودیوں کا جب خود پیغمبران علیہم السلام موجود تھے اس وقت تک تاویلیں ہوا کیں۔ خود پیغمبر کی موجودگی میں سورۃ منافقون کی ضرورت ہوئی۔ السلام علیکم کا جواب ترکی بہ ترکی دیا گیا تو یہ امید لگانا کہ ایک دن مولویوں سے چھٹکارا ملے گا' کچھ ٹوٹی ہوئی آس ہی معلوم ہوتی ہے۔۔۔۔ ہم فقط یہی کر سکتے ہیں کہ اپنا کام کئے جائیں اور کوشش کریں کہ قرآن کو مہجور نہ بنا دیں۔۔۔۔ سمپورنانند جی اور الگورائے شاستری کے ساتھ تو سفر کر نہیں سکتے۔۔۔۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے خیالات نے راستبازی کی شاہراہ دکھائی۔ مگر Gregariot's Animal کیا کرے۔۔۔۔ اس لئے صرف قرآن کی پیروی سے کام چلتا دکھائی نہیں دیتا۔ اور مجبوراً تاریخ روایات Traditions' کی پابندی کرنی پڑے گی۔ باقی سب چیزوں کو مٹا دیجئے اور صرف قرآن ہی رہنے دیجئے۔۔۔۔ نہیں تو دنیا چھوڑ کر کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جایئے اور جب معلوم ہو کہ اسلام رہبانیت نہیں ہے تو کھسیانے ہو کر پھر لوٹ آیئے۔۔۔۔ ہمایوں مرزا صاحب یقین کیجئے گا آپ کے خط سے میرے دل کی قوت بڑھ گئی۔ پھر کہتا ہوں کہ بارِ الہا اسلام میں بہت سے ہمایوں مرزا پیدا کر دے۔ آمین''۔ ۳۸

اس خط کا موضوع مذہب ہے اور خاص طور سے مذہب اسلام سے متعلق باتیں کی ہیں۔ اس میں چودھری محمد علی نے مولویوں پر طنز بھی کیا ہے۔ اور رہبانیت کی مخالفت کی ہے۔ دوسرے مذاہب کا اپنے مذہب اسلام سے موازنہ کیا ہے۔ اس خط سے انسانی نفسیات کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے مولویوں کی نفسیات پر بحث کی ہے اور انکی محدود سوچ پر روشنی ڈالی ہے۔

چودھری صاحب نے اپنے ایک دوست میجر سید ابو جعفر کے نام تحریر کردہ ایک خط میں اپنے مذہبی عقیدے کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ یہ خط اس سے پہلے ''تجزیہ'' کے عنوان کے تحت بحوالہ ۱۰ بیان کیا جا چکا ہے۔ اس خط میں چودھری صاحب اپنے آپ کو صرف مسلمان کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ لوگ انہیں شیعہ سمجھیں یا سنی۔ اس خط میں انہوں نے اپنا مخصوص مزاحیہ انداز اختیار کیا ہے جو انکی تحریر کی پہچان ہے۔ حسب ذیل خط چودھری صاحب ہما بیگم کو لکھتے ہیں جس کا موضوع بھی مذہب ہے۔

---

۳۸ ''کو یا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۴۳ تا ۴۶

''ایک آدمی ہیں اسد کوئی یورپین ہیں۔ مسلمان ہو گئے ہیں۔ وہ ایک پرچہ نکالتے تھے ''عرفات'' اب ادھر نہیں آتا۔ خدا کرے وہاں آتا ہو اور تمہاری نظر سے گذرتا ہو۔ انگریزی میں ہے اور قرآن کی تفسیر خوب کرتا ہے۔ یہ بزرگ منکمہ مذہبیات کا صدر ہے'' ۳۹

اس خط میں چودھری صاحب ایک یورپ کے باشندے کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ ان کا نام اسد ہے وہ ''عرفات نامی ایک رسالہ نکالتے تھے۔ دراصل چودھری صاحب کو یہ رسالہ چاہئے جو اب ہندوستان میں شائع نہیں ہوتا اور ان کا خیال ہے کہ پاکستان میں شائع ہوتا ہے انگریزی زبان میں ہے اور قرآن کی تفسیر اچھی کرتا ہے اور یہ تمام مذہبی رسالوں میں سب سے اول نمبر پر ہے وہ ہما بیگم کو ہدایت دے رہے ہیں کہ اگر انہیں اس کی تمام کا پیاں مل جائیں تو خرید لو۔ اس خط سے چودھری صاحب کی مذہبی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔

چودھری صاحب کا ایک اور خط جو کہ کسی مینیجر صاحب کے نام ہے اس میں مذہب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

''۔۔۔۔ آپ نے میرے مذہبی رجحانات کے بارے میں جو فرمایا ہے وہ ایک حد تک ممکن ہے بالکل درست ہو گو مجھ کو خبر نہ ہو مگر میرے دل کو شیعہ یا سنی کہے جانے سے تسکین نہیں ہوتی اور جس جذبے سے تسکین ہوتی ہے وہ نصیب نہیں۔ یعنی مجھ کو ارباب فہم بے وقوف کہیں' جاہل کہیں' گنبہ گار کہیں مگر مسلمان سمجھیں۔۔۔۔ کوئی متعصب شیعہ کہتا ہے' کوئی سنیوں کا خوشامدی کہتا ہے' کوئی ڈھل مل یقین کہتا ہے' کوئی دہریہ کہتا ہے؟ مگر مسلمان کوئی نہیں کہتا۔ تیرہ سو برس بعد مسلمان ہونا ویسا ہی مشکل ہو گیا ہے' جیسے پھر سے معصوم بچہ ہو جانا'' ۴۰

اس خط میں چودھری صاحب اپنے مذہبی عقائد کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ ان کے بارے میں دوسرے لوگ کیسے خیالات رکھتے ہیں۔ دراصل چودھری محمد علی اپنے آپ کو صرف مسلمان کہلانا پسند کرتے تھے۔ ان کے اس خط کا موضوع بھی مذہب ہے اس خط میں زیادہ تر انہوں نے مذہب سے متعلق ہی باتیں کی ہیں۔ اس خط کا تذکرہ اس سے پہلے ''تجزیہ'' کے عنوان کے تحت بحوالہ ۱۱ کیا جا چکا ہے۔

چودھری صاحب کا ایک اور خط میجر سید ابو جعفر کے نام ہے' یہ بھی مذہب سے ہی متعلق ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''۔۔۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ حدیث و تفسیر کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔۔۔۔ قرآن سمجھنے کے لئے احادیث ضروری ہیں لیکن اسی قدر جتنی ضروری ہوں۔ یہ نہیں کہ بجائے دال میں نمک کے' نمک میں دال ڈالی جائے اور واقعی ہوا ہے یہی کہ ہمارے علماء

---

۳۹ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۱۰۲ ۴۰ ایضاً صفحہ ۱۰۳

منبر پر سے یا چوکی پر سے اگر ایک آیت پڑھتے ہیں تو پچیس احادیث پڑھتے ہیں''۔[۱]

چودھری محمد علی کا یہ خط بھی موضوع کے اعتبار سے مذہب سے متعلق ہے۔ اس میں انہوں نے ان علماء پر طنز کیا ہے جو ایک آیت پر پچیس احادیث پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ لوگ صرف اپنی اہمیت جتانے کے لئے ایسا کرتے ہیں ورنہ اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

چودھری محمد علی کے بے شمار خطوط مذہب سے متعلق ہیں چونکہ ان کے دوست احباب کا یہ خیال تھا کہ شاید ان کو مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اسی وجہ سے وہ اکثر خطوط میں اپنے مذہبی عقیدے کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو صرف مسلمان کہتے تھے اور یہ خواہش تھی کہ دوسرے لوگ بھی انہیں مسلمان ہی سمجھیں۔ سیاسی موضوع پر بھی چودھری محمد علی کے کئی خطوط ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے دوست احباب اور اپنی بیٹی ہما بیگم کو لکھے ہیں ان میں چند کا تذکرہ ضروری ہے مثال کے طور پر ہما بیگم کو لکھتے ہیں کہ'' ۔۔۔۔ روپیہ کا توڑا ہمیشہ سے تھا اب کانگریس گورنمنٹ کی دشمنی سے دولت کے پرلگ گئے ہیں ۔۔۔۔ پنجاب میں جو دھمال مچ رہی ہے تم کو بھی معلوم ہے۔ ہم بیٹھے بیٹھے سوچ رہے ہیں جو دن ان پر بیت گیو وہ دن ہم پر آوت ہے۔۔۔۔ ہندو غریب حکومت کا ترسا۔ نئی دولت اس سے دھرتے اٹھاتے نہیں بنتا۔ ہندو یہاں حکومت کریں گے جہاں ان کی کثرت ہے۔ سرحد پر حکومت کریں گے جہاں ان کی قلت ہے۔ پنجاب میں ہندو اور سکھ مل کر ڈیما کریسی کو تہہ کر کے صندوق میں بند کر دینگے''۔[۲]

یہ خط موضوع کے اعتبار سے سیاسی نوعیت کا ہے اس میں چودھری صاحب نے ملک کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے بارے میں بتایا ہے کہ کس قسم کی تبدیلی آئے گی اور لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔

سیاسی نوعیت کا ہی ایک اور خط جو کہ ہما بیگم کو ہی لکھا گیا ہے۔ کچھ یوں ہے:

''۔۔۔۔ یہاں کے حضرت آدم ہی نرالے ہیں۔ سمجھدار لوگ جواہر لال نہرو سے لے کر ردولی کے میاں لطیف الرحمٰن تک حالت سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ڈیما کریسی شخصی حکومت تو ہے نہیں۔ یہاں تو جو زیادہ آدمیوں کا نمائندہ ہو وہی لیڈر ہے۔۔۔۔ ڈیما کریسی کا عجیب کھیل ہے۔ اس میں سب سے زیادہ سمجھدار آدمی کی بات نہیں چلتی اور نہ سب سے زیادہ بے وقوف کی بات چلتی ہے۔ بلکہ سب کی عقلوں کا مجموعے کر کے اوسط نکالو جیسا اوسط ہوگا ویسا کام ہوگا۔ ڈیما کریسی میں ہر شخص کا معیار علم اونچا ہونا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہی چین یا ہندوستان کی ایسی ڈیما کریسی بنے گی۔۔۔۔ ہم کو تاریخ اور خود ذاتی تجربہ بتاتا ہے کہ جب مسلمانوں کا راج گیا اور ڈیما کریسی کا نام ہندوؤں نے سنا اسی دن سے اس فساد کی بنیاد پڑی''۔[۳]

۱؎ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۱۹۲ ۲؎ ایضاً' صفحات ۷۳ تا ۷۴ ۳؎ ایضاً' صفحات ۸۲ تا ۸۵

یہ نومبر ۱۹۴۷ء کا خط ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جو سیاسی حالات ہندوستان اور پاکستان میں رونما ہوئے ہیں ان کے بارے میں چودھری صاحب اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں اور ڈیما کریسی کی وضاحت کر رہے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ اس خط میں وہ نظامِ حکومت پر طنز کر رہے ہیں اور آنے والے کل کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں کہ یہاں حکومت کس طرح کی ہوگی اور لوگ زندگی کیسی گزاریں گے۔ ہندو، سکھ، مسلمان سب ایک دوسرے کو اپنی کوتاہیوں کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے بعد ڈیما کریسی کا نام ہندوؤں نے سنا اور اسی دن سے اس فساد کی بنیاد پڑ گئی۔ ہندو ذہنیت بہت خراب ہے وہ ہزار برس سے مستقل مسلمانوں کے غلام رہے۔ ان میں فطری خامی یہ ہے کہ وہ کبھی شہنشاہی نہیں کر سکتے۔ جبکہ ہندوستان میں ہندو مسلمان سب ایک ہیں۔ کیونکہ انکی رگوں میں بھی وہی خوف ہے۔ اسلام میں ڈیما کریسی کبھی رہی بھی ہے تو صرف تیس سال۔ مسلمانوں کو شروع سے یہ معلوم تھا کہ انسان کا نقطہ نظر مساوات ہونا چاہئے۔ وہ ہما بیگم سے کہتے ہیں کہ تم نے ہندوستان بھی دیکھا اور پاکستان بھی تم بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔ پھر لفظ قائداعظم میں وہ بات موجود ہے جو نماز میں ہوتی ہے۔ آگے چل کر چودھری صاحب تھیوکریٹک اسٹیٹ کی وضاحت چاہتے ہیں اور ہما بیگم سے پوچھتے ہیں کہ اگر پاکستان تھیوکریٹک اسٹیٹ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ اسی تھیوکریسی کی بنا پر جناح کانگریس سے الگ ہوئے اور اسی تھیوکریسی کی وجہ سے مسلمانوں کا سب سے بڑا اور دنیا میں پانچواں بڑا ملک بنا۔ خدا اس کو برقرار اور برسرِ اقتدار رکھے۔ یہ بات چودھری صاحب نے ۱۹۴۷ء میں کہی تھی۔ اب پاکستان دولخت ہونے کے بعد بہت چھوٹا ہو چکا ہے۔ خدا اس بچے کھچے پاکستان کو سلامت رکھے۔

ایک خط چودھری صاحب نے ہما بیگم کو گاندھی جی کے پرسہ پر لکھا ہے جو موضوع کے لحاظ سے معاشرتی نوعیت کا ہے۔ اس کا تذکرہ اس سے پیشتر ''تجزیہ'' کے عنوان کے تحت بحوالہ ۲ کیا جا چکا ہے۔

یہ خط گاندھی کے پرسے کا ہے اس کا موضوع تعزیتی ہوتے ہوئے بھی معاشرتی ہے لوگوں کی سوچ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں کم علمی کی وجہ سے لوگ صحیح طور پر اپنے ذہن کو استعمال نہیں کر پاتے اور ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں جنکی وجہ سے وہ کھلی فضا میں آزادی کے ساتھ سانس لے رہے ہوتے ہیں۔ چودھری صاحب کو گاندھی کی بے وقت موت کا بہت صدمہ تھا۔ انہیں اس بات کا بھی ڈر تھا کہ خط پاکستان جاتے ہوئے کہیں سنسر نہ ہو جائے۔ گاندھی کی اہمیت ان کی نظر میں اتنی تھی کہ اس کا اظہار وہ اس طرح سے کر رہے ہیں کہ نہ جانے کس ظالم اور پتھر دل نے وہ چینی کا برتن توڑ دیا جس کا قوام ہزار برس میں تیار ہوتا ہے۔ یعنی گاندھی جیسی فطرت رکھنے والے لوگ دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو صرف دوسروں کی بھلائی کے لئے جیتے ہیں۔

مینیجر صاحب کے نام اپنے اس خط میں جس کا موضوع مذہب ہے اور جس کا تذکرہ حوالہ ۴۰ کے تحت پہلے کیا جا چکا ہے' چودھری صاحب لکھتے ہیں کہ:

''۔۔۔مولوی عبدالماجد دریا آبادی نے تو غضب کیا' انہوں نے لکھا ہے کہ محمد علی کہتا ہے کہ میں سنی یا شیعہ نہیں ہوں۔اس میں پچاس سیکڑ وہ کامیاب ہوا۔یعنی شیعہ تو اس کو اپنے گروہ سے الگ سمجھیں گے مگر سنی اس کو شیعہ ہی جانیں گے۔ اس کی ذمہ داری خود محمد علی ہی پر ہے۔کیونکہ اس نے خلافت کا مسئلہ چھیڑ دیا'' ۴۴

اس خط میں چودھری صاحب اپنے دوست عبدالماجد دریا آبادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرے مذہب کے بارے میں وہ کیسے خیالات رکھتے ہیں۔انکے خیال میں ''میرا مذہب'' نامی کتاب پڑھنے سے شیعہ اور سنی دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر کیا سمجھیں گے اور ان میں کیا معاشرتی تبدیلیاں رونما ہونے کا امکان ہے۔مذہبی کے ساتھ ساتھ اس طویل خط کا موضوع معاشرتی بھی ہے۔

چودھری صاحب نے کچھ خطوط ادبی موضوعات پر بھی لکھے ہیں۔ان میں سے ایک خط شہاب الدین کو لکھتے ہیں جس کا موضوع ادبی ہے:

''واہ واشہاب الدین صاحب آپ نے یہ خط اب لکھا۔پہلے نہ لکھا کہ اس کو سامنے رکھ کر میں ہما کو لکھا کرتا اور ''گویا دبستاں کھل گیا'' میں چار چاند لگ جاتے۔نظم میں باتیں' نثر میں باتیں۔بڑھاپے کا حال عبرت کا سبق دیتی ہیں۔۔۔کل آنکھوں میں سرخی کم ہوگئی تھی۔چار مہینوں سے ڈاکٹر نے لکھنا پڑھنا سب بند کر دیا تھا۔آپ کا خط پڑھ لیا۔آج پھر آنکھیں سرخ ہوگئیں'' لے بھائی شہاب الدین ای کا کہیو۔ہمرا کیا کراوا سب مٹی کر دیہو'' گر مجھ کو بالکل اندھا کرنا ہے تو دو ایک خط ایسے ہی اور بھیج دیجئے تا کہ آنکھیں پھوٹیں پیر جائے۔۔۔میرے پاس صرف ''گناہ کا خوف'' ہے وہ حاضر ہے ''صلاح کار'' بڑھیا ہوگئی۔آپ بھی پیش از وقت بڈھے ہوئے۔جنسی معاملات کو خیر باد کہئے۔''مشکول محمد علی شاہ فقیر'' صدیق بک ڈپو میں ملے گی۔شاید ''اتالیق بی بی'' مل جائے۔''میرا مذہب'' دیمک چاٹ گئیں۔اللہ بخشنے والا ہے''۔ ۴۵

اس خط میں چودھری صاحب نے مزاحیہ انداز اختیار کیا ہے۔شہاب الدین نے ان کے خط کے مجموعے ''گویا دبستاں کھل گیا'' کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار خط کے ذریعے کیا چودھری صاحب کی تحریر کا انداز انہیں بہت پسند آیا۔انہوں نے چودھری صاحب سے انکی دوسری کتابیں بھی طلب کیں ہیں۔چودھری صاحب اپنے مخصوص ادبی انداز سے انکے خط کا جواب دیتے ہیں۔اور کچھ کتابیں بھیجتے ہیں اور کچھ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ مختلف بک ڈپو سے مل جائیں گی' اور کچھ کی نایابی کا تذکرہ کرتے ہیں۔

---

۴۴ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۱۰۵ تا ۱۰۶

۴۵ ایضاً' صفحات ۳۵۲ تا ۳۵۴

ایک اور خط چودھری صاحب صلاح الدین صاحب کو لکھ رہے ہیں یہ خط بھی ادبی نوعیت کا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''۔۔۔۔ اکیڈمی کی رکنیت میں بخوشی قبول کرتا ہوں۔ آپ روپیہ روانہ کرنے کی ترکیب بتایئے۔۔۔۔ بڑے کاموں کی شروع چھوٹی ہوتی ہے۔۔۔۔ آج کی رائی کل کا پہاڑ ہو کر دکھائی دے گا۔۔۔۔ گھبرایئے نہیں' حضرت دن رات جی چاہا کرتا ہے کہ ''ادبی دنیا'' کو کوئی تحفہ بھیجوں۔ مگر بڑھاپا' افکار' کاہلی' اول جلول مزاج' کچھ کرنہیں پاتا۔ آدھی آدھی لکھی ہوئی دو چیزیں موجود ہیں۔ اللہ جانے پہلے وہ ختم ہوں گی کہ ہم۔ ایک ڈراما بھی ادھورا پڑا ہے۔۔۔۔ دونوں میں سے جو چیز ختم ہوگئی وہ ''ادبی دنیا'' پر نچھاور کرنے کو بھیجوں گا''۔ ۴۶

اس خط کا موضوع ادبی ہے۔ اس میں چودھری صاحب کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں اور صلاح الدین کی فرمائش پر اپنی لکھی ہوئی کچھ تحریر بھیجنا چاہتے ہیں اور اکیڈمی کی رکنیت بھی قبول کر رہے ہیں۔ روپیہ بھیجنے کی ترکیب پوچھ رہے ہیں اور صلاح الدین صاحب کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ ان کے قلم ان کے ارادوں اور ان کی زبان میں اثر کے لئے دعا گو ہیں۔ اور انہیں بتاتے ہیں کہ بڑے کاموں کی شروعات بہت مشکل ہوتی ہے لیکن انسان اگر چاہے تو کیا نہیں کر سکتا ہے۔ محاورے کے طور پر انہوں نے لکھا ہے کہ ''آج کی رائی کل کا پہاڑ ہو کر دکھائی دے گا'' یعنی آج کا چھوٹا کام کل بہت بڑا ہو جائے گا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ چودھری صاحب نے کچھ ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ مگر شاید چھپ نہ سکے۔ چودھری صاحب کا ایک اور خط جو سیاسی نوعیت کا ہے اس میں وہ ہما بیگم کو ردولی کے معاشرتی اور سیاسی حالات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

''یہاں نوٹیفائڈ ایریا کا الیکشن تھا۔۔۔۔ ممبر ہوگئے پریزیڈنٹی کے لئے اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔۔۔۔ میں جانتا ہوں ان باتوں سے تم کو دلچسپی کم ہوگی۔ مجھ کو بھی کوئی خاص دلچسپی سوا مسلم لیگ کے اور کسی چیز سے نہیں''۔ ۴۷

موضوع کے اعتبار سے چودھری صاحب کا یہ خط سیاسی رنگ لئے ہوئے ہے اس میں وہ ردولی کے نوٹیفائڈ ایریا کے الیکشن کے بارے میں بتا رہے ہیں اور ممبر ہوگئے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ اب یہ دیکھنا ہے کہ پریزیڈنٹی کے لئے کیا ہوگا ابلیس کے غرور کی مثال دے کر بتانا چاہ رہے ہیں کہ غرور کرنے والے کا کیا حشر ہوتا ہے مگر لوگ پھر بھی نہیں مانتے۔ آخر میں مسلم لیگ سے اپنی دلچسپی کے بارے میں لکھا ہے۔ اور اپنی بیٹی سے کہتے ہیں کہ تم کو ان باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہوگی۔

چودھری محمد علی کے سب سے زیادہ خطوط نجی موضوع پر ہیں جو انہوں نے اپنے عزیز و اقارب دوست و احباب کے نام

---

۴۶ ''کویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۲۳۹ تا ۲۴۰ ۴۷ ایضاً' صفحات ۵۷ تا ۵۸

لکھے ہیں۔ کچھ خطوط سیاسی موضوع پر ہیں جو اپنی بیٹی ہما بیگم اور کچھ دوست احباب کے نام لکھے ہیں۔ اسی طرح کچھ خطوط مذہبی موضوع پر ہیں جو زیادہ تر دوست احباب کو ہی لکھے ہیں۔ کچھ خطوط کے موضوعات انسانی نفسیات' معاشرتی پہلو' سماجی قدریں' جنسی مسائل' اودھ کی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ ادبی موضوع پر زیادہ تر خطوط دوست واحباب کے نام ہیں' کچھ دیگر رشتہ داروں کے نام ہیں۔ زیادہ تر ہر موضوع پر خطوں کی تعداد ہما بیگم کے ہی نام ہے۔ چودھری صاحب انسانی نفسیات کے بہترین نباض ہیں اس لئے ان کے ہر خط میں اس کی جھلک ضرور نظر آتی ہے خواہ وہ خطوط سیاسی نوعیت کے ہوں یا مذہبی یا معاشرتی۔

۶۔ مکتوب الیہان سے تعلقات کی نوعیت:

جیسا کہ اس سے پہلے تحریر کیا جا چکا ہے چودھری محمد علی کے ۶۷،۸% مطبوعہ خطوط اپنی بیٹیوں کے نام اور صرف ۳۲،۲% دوست احباب کے لئے تحریر کئے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اپنی بیٹیوں کے نام تحریر کردہ خطوط تو محفوظ رہے اور احباب کے نام لکھے جانے والے خطوط میں سے بہت سے ضائع ہو گئے۔ یعنی ہما بیگم انہیں حاصل کر کے طبع نہ کر سکیں۔ خط خواہ اپنی بیٹی کے نام ہو یا کسی دوست یا جاننے والے کے نام چودھری صاحب مکتوب الیہ کے قلب میں انتہائی بے تکلفی سے اترتے نظر آتے ہیں۔ اس کے احساسات کو سمجھتے بھی ہیں اور اس کے دکھ درد کو بانٹنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی دلجوئی بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے خیالات انتہائی عمدگی سے اس کے دماغ میں اتارتے جاتے ہیں۔

''گویا دبستاں کھل گیا'' کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چودھری محمد علی کے خطوط میں دلچسپی اور رنگینی کے ساتھ ساتھ انکی شخصیت کے تمام پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ایک ادیب کی حیثیت سے' ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے' ایک مخلص دوست کی حیثیت سے ایک موحد اور ایک شفیق باپ کی حیثیت سے' ایک داستان گو' گفتگو کرنے والے کی حیثیت سے' ایک معالج کی حیثیت سے' ایک آقا کی حیثیت سے' ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے' غرض کہ ہر شکل میں ان کی شخصیت بڑی سحر کن اور پرکشش نظر آتی ہے۔ چودھری محمد علی کا ہر خط اپنی سادگی' اپنی دلچسپی و پرخلوص انداز طنز و مزاح' اپنی خوبصورتی اور اپنی چاہت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے ہر خط میں بے تکلفی' شفقتی اور برجستگی و اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے۔ پریشانیوں اور دکھ درد کے باوجود وہ مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انکے خطوط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے باہمت انسان تھے۔ ہر دکھ و تکلیف کو کس قدر خندہ پیشانی سے جھیل جانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہر ایک کے دکھ درد کو نہ صرف محسوس کرتے تھے بلکہ برابر کے شریک رہتے تھے۔ اور جس طرح سے بھی ہو سکتا تھا اس کے لئے راہیں ہموار کرتے تھے۔

یوں تو خطوط ذاتی اور نجی قسم کے ہوتے ہیں مگر چودھری محمد علی کے خطوط کی نوعیت یہ ہے کہ وہ اس میں ایک طرف تو

اپنے عزیز، رشتہ داروں، دوست احباب، نوکر چاکر کا تذکرہ، ان کی ذاتی زندگی کے حالات، پورے قصبہ رودلی کے حالات وہاں کی تہذیب وتمدن کی جھلک دکھاتے ہیں اور دوسری طرف اپنی نجی زندگی، ذاتی مسائل، دکھ سکھ کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چودھری صاحب کے کچھ خطوں کے بعض فقرے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جو خصوصیات پہلے بیان کی جا چکی ہیں وہ کس حد تک درست ہیں۔

ایک خط وہ اپنی منہ بولی نواسی عتیق (جو لانس نائک محمد عظیم الحسن قادری کی زوجہ اور کوئٹہ، پاکستان میں مقیم تھیں) کو لکھتے ہیں جس میں صوفیوں کا ذکر عبادت کا انداز اور اپنی عبادت کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اس خط میں وہ شفیق نانا ہوتے ہوئے بھی دوستانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ صوفیوں کی عبادت اور اپنی ریاضت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''۔۔۔۔ جس طرح صوفیوں کے یہاں ایک زمانہ ہوتا ہے جس کو قبض کہتے ہیں۔ اس زمانے میں ہزار عبادتیں کریں۔۔۔۔ نور انوارِ الٰہی نہیں ساطع ہوتے۔ اور ایک زمانہ بست کا ہوتا ہے جس میں عبادتوں کا لطف آتا ہے اور انوارِ الٰہی کی بارش ہوتی ہے۔ اسی طرح سے میرے خط لکھنے کا بھی حال ہے۔ کبھی ہر وقت خطوط لکھنے کا تقاضہ ہوا کرتا ہے اور سب کو لکھا کرتا ہوں۔۔۔۔ جب آیۃ الکرسی پڑھتا ہوں تو تمہاری ماں کا نام جہاں آیا بس تم یاد پڑ جاتی ہو۔ اب ایک اور ذریعہ تمہاری یاد آنے کا پیدا ہو گیا ہے۔ میں ادھر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں ''میرا مذہب'' اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر بہت ہے۔ جہاں حضرت خلیفہ اول کا نام آیا بس تم یاد آ گئیں۔ وہ رسول کے یار عتیق تھے اور تم ہماری۔۔۔۔ آج کل یہاں تین چیزوں کا بڑا زور ہے۔ آم، گرمیاں اور اندھوری۔ آم کا رنج نہ کرو یہاں کی جہنمی گرمی اور اندھوریوں سے تو بچ گئیں۔۔۔۔ عتیق یہ تو بتاؤ جب تمہارے میاں دفتر چلے جاتے ہیں تو کیوں کر وقت کاٹتی ہو؟۔۔۔۔ یہ کلب کیسا ہے جس کا ذکر تم نے کیا ہے؟ تم پردہ کئے جاتی ہو یا چھوڑ دیا؟ پردہ بڑی غلط چیز ہے قرآن شریف میں چہرے اور ہاتھ پاؤں کا پردہ کہیں نہیں ہے۔ نہ اللہ میاں کا منشا ہے کہ اس کی آدھی مخلوق قید میں رہے''۔ ۴۸

اس خط سے چودھری صاحب کی روشن خیالی کا اظہار ہوتا ہے وہ جس دور اور جس ماحول سے تعلق رکھتے تھے اس زمانے میں خواتین کے لئے پردہ لازمی تھا۔ ان کی انہیں باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک صدی آگے کی سوچ رکھتے تھے اور یہی سوچ کم وبیش غالب کی تھی۔ وہ اپنی اِن منہ بولی نواسی کو بہت پیار سے سمجھاتے ہیں کہ اگر آم تم نہ کھا سکیں تو کوئی بات نہیں دو بڑی تکلیفوں سے بچ گئیں ایک تو گرمی کی شدت اور دوسرے گرمی دانوں کی تکلیف۔ یہ مزاحیہ انداز ہے۔ اسی طرح آیۃ الکرسی میں والدہ کے نام کا تذکرہ اس وجہ سے کیا کہ عتیق النساء کی والدہ کا نام سمیع النساء تھا جو محلہ قضیانہ کی رہنے والی

---

۴۸ ''کو یا دبستاں کھل گیا''، صفحات ۲۳ تا ۲۷

تھیں۔ یہ بھی مزاحیہ انداز ہے۔ اس خط میں چودھری محمد علی کی حیثیت ایک شفیق موحد' روشن خیال اور بہت زیادہ پیار کرنے والے دوست نمانانا کی ہے۔ ان کے ہر خط میں دوستانہ انداز پایا جاتا ہے۔

ایک اور خط جوانہوں نے اپنی بیٹی چھبن کو لکھا ہے۔ اس میں انکے شوہر کی بیماری پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرے بچوں کی جدائی کا کرب اور قیصر بیگم' جابر کا ذکر کرتے ہیں۔ قیصر بیگم چودھری صاحب کی دوسری زوجہ محترمہ ہیں اور جابر پہلی زوجہ کے آخری چشم و چراغ ہیں۔ خط کچھ اس انداز سے لکھا ہے: ''۔۔۔۔ انسان کی بے بسی' بے اختیاری عبرت کے قابل ہے۔ جب سبط کی بیماری کا خط آیا تو سب سے زیادہ تکلیف اس کی ہوئی کہ کاش میں تمہارے پاس ہوتا۔۔۔۔ ادھر دو تین کچوکے ایسے لگے ہیں کہ بہت دن تک نہ بھولیں گے۔۔۔۔ کل ہمارے خط سے اس اندھیرے میں روشنی دکھائی دی۔۔۔۔ بی بی جے دن زندہ ہیں یہی نشیب و فراز دیکھنا ہیں۔۔۔۔ کجن' چھبن' ہما' سلمان کی سینکڑوں تصویریں' پیدا ہونے سے لے کر آج تک خوشی کی' غم کی' بیماری کی' تندرستی کی' بھولے پن کی' ہوشیاری کی' ہنسی کی' رونے کی' ان کو چھاتی سے لگانے کی' ان پر غصہ کرنے کی' اپنی بڑھیا کے روحانی اثر کی' آج تک گھر پر چھایا ہے۔ قیصر کی جو ماشاء اللہ آج تک گھر بھر پر چھائی بچھائی ہیں۔ جابر جنکے دل کا حال وہی جانتے ہیں مگر ان کی بے اختیاریاں ہم ہی جانتے ہیں۔ سعید کی جو صرف گورکن ہیں یہ سب کچھ نگاہ کے آگے ہے''۔ ۴۹

اس خط میں جسے چودھری صاحب نے اپنی بیٹی چھبن کے نام لکھا ہے ایک بے بس باپ کے روپ میں نظر آرہے ہیں۔ وہ گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتے ہیں اور پھر اپنی عزیز ترین اولادوں کی مختلف ادوار کی تصاویر اپنے ذہن میں بناتے ہیں اپنے گزرے ہوئے کل کو یاد کرتے ہیں۔ اپنی پہلی بیوی کے روحانی اثرات کا ذکر کرتے ہیں اور قیصر بیگم جو کہ انکی دوسری بیوی ہیں انکا ذکر طنزیہ انداز سے کرتے ہیں کہتے ہیں کہ وہ آج تک گھر پر چھائی بچھائی ہیں۔ اپنے بیٹے جابر کی پریشانی اور ان کی دلی کیفیت سے باخبر ہو کر بھی بے خبر ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ سعید کو گورکن ان معنوں میں کہا ہے کہ وہ ہی اب ان کو آخری منزل تک پہنچانے والے ان کے ساتھ قیام پزیر ہیں۔

مذکورہ بالا خط میں چودھری صاحب کی حیثیت ایک بے بس مگر شفیق باپ اور بے پناہ چاہنے والے شوہر کی ہے۔ وہ اپنی دونوں بیویوں سے محبت کرتے تھے۔ مزید براں ایک داستان گو کی حیثیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔

مندرجہ ذیل خط چودھری صاحب نے اپنی عزیز ترین بیٹی ہما بیگم کو لکھا ہے جس میں انکی بہت سی حیثیتیں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ لکھتے ہیں:

---

۴۹ ''کو یا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۲۸ تا ۳۰

''۔۔۔۔ میں ردولی میں پابہ زنجیر ہوں۔ وجہ کیا کہ روز معلوم ہوتا ہے کہ موٹر کل تیار ہو جائے گا اور ہمیشہ وہی روزِ اول رہتا ہے۔ تمہارے تفضل ماموں دو چار روز کے لئے گھر آئے تھے۔ آج نانپارہ گئے ہیں کہتے تھے کہ وہاں رہ کر ملازمت کی کوشش کرونگا۔ میرا دل کہتا ہے کہ ایک دو دن نانپارہ میں رہ کر گھوڑی بھسیلے ہی میں دم لے گی۔ مگر میں کس منہ سے کہوں' سوپ تو سوپ ہنسے چھلنی کیا ہنسے جس میں بہتر چھید۔ شاہ ضیاالحق کی بی بی سے پندرہ' سولہ برس کے بعد ملاپ ہوا ہے اتنے برس تک بے چارے بندر کی طرح زندگی بسر کیا کئے۔۔۔۔ موتی جان بے چاری قضا کر گئیں مگر کسی سے خدمت نہیں لی۔ شام کو دروازے پر بیٹھی تھیں صبح کو جب دروازہ نہ کھلا تو جگن بڑھئی نے حقِ ہمسائیگی ادا کیا۔ دیوار پھاند کر گھر میں گھسا دیکھا تو انگنائی میں پڑی ہیں۔۔۔۔ وہ گھرانوار کو دیا گیا ہے۔ ابھی دلہنیا یا سدن وہاں گئی نہیں ہیں مگر ان کے نام زد ہو گیا ہے۔ دلہنیا کے لڑکا ہونے والا ہے۔ دن قریب ہونگے۔ گو قریب تر معلوم نہیں ہوتے۔ وہ بہت خوش ہے۔ باورچی خانے سے سہ دری آتے وقت ذرا سا سر جھکا کر کنکھیوں سے اپنا پیٹ دیکھتی چلتی ہے۔ مجھ کو نہ معلوم آپ ہی آپ کیوں خوشی ہے۔ مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا میرے ہی پوتا پیدا ہونے والا ہے۔۔۔۔ شمسل کے لڑکا ہونے والا ہے۔ مٹھو بہت خوش ہیں یہی حال سب گدھوں کا ہوتا ہے۔۔۔۔ عظمت' مٹھو اور ہم حج کو ساتھ گئے تھے گو اعمال ایسے نہ ہونگے مگر ''رحمتِ حق بہانہ میجوید'' کے حکم سے ممکن ہے۔۔۔۔ گریموفون کے بارے میں تم نے لکھا ہے کہ تم کو پسند نہیں ہے۔۔۔۔ لیکن بی بی اگر رکارڈ عمدہ ہوں اور آواز ملائم ہو تو خوش آئند ثابت ہوتا ہے''۔[۵۰]

اس خط میں سب سے پہلے چودھری محمد علی ایک محبت کرنے والے باپ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں پھر اپنے دوستانہ رویہ کے باعث ہما بیگم کو ان تمام باتوں سے باخبر کرنا چاہتے ہیں جو اس دوران رونما ہوئی ہیں۔ اس خط میں جو انداز اختیار کرتے ہیں وہ ان کی روشن خیالی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس زمانے کا ایک باپ اپنی بیٹی سے ایسی باتیں عام طور سے نہیں کرتا تھا جو انہوں نے کی ہیں۔ یہ باتیں دوستوں سے ہی کی جاتی ہیں مگر چونکہ وہ بہت آزاد خیال انسان تھے اس لئے وہ اپنی بیٹی سے ہر موضوع پر بات کر لیتے تھے۔ اس خط میں چودھری صاحب نے نوکروں کا بھی ذکر کیا ہے انکے نجی مسائل بھی بیان کئے ہیں۔ پھر خاندان کے دیگر افراد اور انکے نجی معاملات قصبہ ردولی سے تعلق رکھنے والے دوسرے حضرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ موسیقی سے دلچسپی کا اظہار غرض زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس خط میں بھی چودھری صاحب ایک داستان گو کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ مندرجہ ذیل خط چودھری صاحب صلاح الدین احمد جو کہ ''ادبی دنیا'' کے مدیر اعلیٰ تھے لکھتے ہیں کہ:

۵۰؎ ''کویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۱۷ تا ۱۹

''ادبی دنیا'' موصول ہوا تھا مگر شکریہ کا خط نہ لکھ سکا۔ نو ہفتے تک ہلکی حرارت میں مبتلا رہا۔۔۔۔ گو گزشتہ علالت اللہ میاں کی نوٹس تھی کہ تیار رہو۔۔۔۔ بہر حال اب بالکل اچھا ہوں۔ البتہ عقل کچھ گٹھل سی ہوتی معلوم ہوتی ہے۔۔۔۔ کچھ سٹھیانے پن کا اثر شروع ہو گیا ہے۔ حضرت آپ کی ادب نوازی' ادیب پروری کا تقاضہ تو یہ کہتا ہے کہ ''ادبی دنیا'' کی خدمت میں دن رات مصروف رہوں۔۔۔۔ اپنے میں وہ حال نہیں پاتا جس استہزا یعنی Sense of the ridicmlous کچھ کم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے قلم اٹھاتے کچھ ڈر سا معلوم ہونے لگا ہے''۔ ۱؎

اس خط کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ چودھری محمد علی کے تعلقات ''ادبی دنیا'' کے مدیر صلاح الدین احمد سے بڑے گہرے اور ادبی نوعیت کے تھے۔ چودھری صاحب نے ان کی ادب نوازی اور ادیب پروری کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور اپنی خدمات پیش کیں ہیں۔ اس خط سے چودھری محمد علی کی شخصیت بحیثیت ایک ادیب کے سامنے آتی ہے۔

اسی قسم کا ایک اور خط نیاز فتح پوری کے نام ہے ان سے بھی چودھری صاحب کے علمی و ادبی نوعیت کے مراسم تھے۔ اپنی زمینداری چلے جانے کا حال کچھ اس طرح سے لکھتے ہیں: ''۔۔۔۔ وجہ یہ ہے کہ پہلی جولائی کو پالیٹکس کے اسرافیل' کانگریس کے دھوتو بیگ پنتھ صاحب اپنا نرسنگھا یعنی زمینداری کی موت کا صور پھونکیں گے۔ اس دن بچے زمیندار بوڑھے ہو جائیں گے۔ زمیندار بتوں کے محل گر جائیں گے اور زمینداروں کے بہی کھاتے ہوا میں روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔۔۔۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے تشریف لانے کی خوشی میں اگر کوئی ضرورت لکھنؤ کی ہوتی بھی تو ملتوی کر دی جاتی' کیونکہ نیاز صاحب روز روز رو دلی نہیں آیا کرتے۔ رہا تعارفی خطوط کا معاملہ اس کے لئے قول و قلم سے ہر وقت دست و زباں حاضر ہیں۔۔۔۔ بہر حال جس طرح کے تعارفی خطوط فرمایئے گا انشا اللہ تعالیٰ لکھے جائیں گے۔ اور پھر بھی یہ آرزو باقی رہے گی کہ کاش اس سے زیادہ کوئی خدمت کر سکتا''۔ ۲؎

نیاز فتح پوری رو دلی آنا چاہتے ہیں اور چودھری صاحب بحیثیت میزبان ان کا استقبال کس خوبصورت الفاظ سے کر رہے ہیں۔ اس سے ان کی مہمان نوازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو کام نیاز فتح پوری ان سے کروانا چاہتے ہیں اس کے لئے وہ ہر طرح سے اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں اور انتہائی انکساری کے ساتھ بہت کچھ خدمت کرنے کی آرزو کا اظہار کرتے ہیں۔ اس خط میں چودھری صاحب دوست نواز' مہمان نواز اور ایک ادیب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

جریدے ''نقوش'' کے ایڈیٹر محمد طفیل سے چودھری صاحب کا قلمی تعارف تھا۔ ان سے دوستی کی نوعیت علمی اور ادبی

۱؎ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۱۷ ۲؎ ایضاً' صفحات ۱۰۹ تا ۱۱۰

حدوں تک محدود تھی۔ ان کو خط لکھ رہے ہیں جو کچھ یوں ہے:

''۔۔۔۔ حضرت کا خیال ہے کہ میں نے مضمون لکھنے میں پہلے عذر کیا تھا۔ یہ نخرہ نہ تھا بلکہ بڑھاپا۔ گرمیاں' زمینداری جانے سے فقیری کا دھڑا کا سب نے مل کر حواس باختہ کئے تھے۔۔۔۔ آپ نے مضمون اس اصرار سے مانگا تھا اور تصویر بھی طلب کی ہے کہ انانیت اور اوچھاپن راضی ہو گئے۔۔۔۔ اس بڑھاپے میں میرے بچے سب دور دور جا پڑے۔ ان کے کہنے سے یہ تصویر کھنچوائی تھی ورنہ اس سن میں تصویر کھنچوانا کیسا۔ آئینہ دیکھ کر غصہ چڑھ آتا ہے۔ اڑسٹھ برس دو مہینے کے سن میں ۱۷ر جولائی ۱۹۵۱ء کو یہ تصویر کھنچوائی تھی۔۔۔۔ آپ کے یہاں مولویوں کی تباہ کاریاں زور پکڑ رہی ہیں۔ اس کا انسداد کچھ کیجئے گا ورنہ آپ کو بھی وہی روز بد دیکھنا نصیب ہوگا' جو ایران' افغانستان وغیرہ کا ہے''۔ ۵۳

خط کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تحریر سیاسی نوعیت کی بھی ہے اور مذہبی بھی اس لئے کہ چودھری صاحب نے مولویوں کا ذکر کیا ہے۔ اس خط میں چودھری محمد علی کی حیثیت ایک علمی و ادبی دوست کی ہے تھوڑا بہت بے تکلفی کا انداز بھی پایا جاتا ہے۔ چودھری محمد علی کے ادبی حلقہ کے ایک اور دوست عبدالماجد دریا آبادی ہیں ان کا اور چودھری محمد علی کا ادبی ذوق تقریباً ایک جیسا تھا۔ گو افکار اور خیالات میں یکسانیت نہ تھی لیکن خلوص و محبت کی بنا پر خاصے اچھے تعلقات تھے۔ چودھری صاحب کا کوئی بھی خط عبدالماجد دریا آبادی کے نام دستیاب نہیں ہو سکا البتہ چودھری صاحب پر تبصرہ انہوں نے اپنے ہفتہ وار اخبار ''صدق جدید'' لکھنؤ میں بہت ہی اچھے انداز سے کیا ہے۔ کچھ احباب ایسے بھی ہیں جن سے چودھری صاحب کے بے تکلفانہ مراسم تھے ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ راجہ پرتھی پال سنگھ جو چودھری صاحب کے بچپن کے دوست تھے۔ دونوں نے ایک ہی اسکول سے تعلم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ شیخ ولایت علی قدوائی بھوق سے بھی چودھری صاحب کے بڑے اچھے مراسم تھے ان دونوں کا ذکر انہوں نے اپنی تصانیف ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' اور ''میرا مذہب'' میں کیا ہے۔ چودھری صاحب نے ''راجہ پرتھی پال سنگھ'' کے عنوان سے ایک خاکہ بھی لکھا ہے۔ ان لوگوں کے نام کوئی خط دستیاب نہیں ہوا۔ چودھری محمد علی کے ہم مذاق اور عزیز ترین دوست شاہ آفاق احمد تھے۔ گو کہ یہ چودھری محمد علی سے عمر میں بہت چھوٹے تھے مگر چودھری صاحب انکا شمار دوستوں میں کرتے تھے اور اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتے تھے۔ انکے نام متعدد خطوط ہیں جن میں سے ایک درج ذیل ہے:

''آفاق بیٹا! آج کیا پروگرام ہے؟ اگر گاؤں جاتے ہو تو ''بسلامت روی و باز آئی''۔ اگر گھر پر کوئی مشغلہ ہو تو ''چشم ما روشن دل ما شاد'' اگر بیکار بیٹھے ہو تو۔ کرم نما و فرد و آ کہ خانہ خانہ تست''۔ ۵۴

---

۵۳ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۲۴۹ تا ۲۵۱ ۵۴ ایضاً' صفحہ ۱۳۳

اس خط میں چودھری صاحب بحیثیت ایک خیر خواہ اور جگری دوست کے نظر آ رہے ہیں۔ ہر حال میں وہ آفاق احمد کی بھلائی چاہتے ہیں۔ جو کہیں بھی رہیں کچھ بھی کریں بس خوش رہیں۔

چودھری محمد علی کے کچھ دوست ایسے بھی تھے جن سے مذہبی معاملات پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ حسامی صاحب کو لکھتے ہیں کہ:

''۔۔۔۔''میرا مذہب'' سے اس گنہ گار کی ذہنیت کچھ جناب کو معلوم ہو چکی ہوگی۔۔۔۔ میں نے حج کے بعد سے یہ کوششیں کی کہ کم از کم نماز پابندی سے پڑھا کروں۔ گو پڑھتا رہا ہوں مگر سفر میں چھوٹ جایا کی۔ پھر سفر حضر میں کم و بیش جاری رہی۔ مگر آزادہ خیالی باقی رہی۔ پھر خداوند تعالی نے رحم کیا۔ اور انفعال اور توبہ کا خیال دل میں جاگزیں ہونے لگا۔ قرآن شریف اردو اور انگریزی میں پڑھتا ہی تھا۔ جوں جوں مرنے کے قریب آتا گیا عقبیٰ کا خیال زیادہ ہوتا گیا۔۔۔۔ حسامی صاحب مفلوج دماغ میں مطالب اس طرح امڈے آتے ہیں جیسے آندھی میں سوکھی پتیاں''۔ ۵ے

اس خط میں چودھری صاحب اپنے مذہبی رجحان کے بارے میں بتا رہے ہیں اور یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ کیوں زیادہ مذہب کی طرف آئے ہیں۔ اپنی کوتاہیوں کا انہیں بخوبی اندازہ ہے جس کا اظہار وہ جگہ جگہ کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو اکثر تنقید کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔

۷۔ مکتوبات میں شعر و ادب کے مختلف رجحانات:

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ اردو میں خطوط نگاری کی با قاعدہ روایت غالب سے شروع ہوتی ہے اور غالب نے ہی اسے معراج تک پہنچایا۔ غالب کے بعد اور بہت سے مشاہیر ادب نے خطوط لکھے ہیں مگر نہ تو کوئی غالب کا مکمل انداز اختیار کر سکا اور نہ ہی ایسی انفرادیت قائم کر سکا جسے مکاتیبی ادب کی پیش قدمی کہا جا سکے۔ غالب کے خطوط نے ہی اچھا اور اعلیٰ معیار مقرر کیا ہے۔ ایک اچھا خط وہ ہے جس میں تصنع اور تکلف کے بغیر نجی معاملات سے متعلق باتیں لکھی جائیں۔ اور لکھنے والا اس تحریر میں اس حد تک کھل جائے کہ درمیان میں کوئی حجاب باقی نہ رہے اور خط کی تحریر میں جو زبان استعمال کی جائے وہ گفتگو کی عام فہم، سلیس، شستہ زبان ہو اور کہیں سے بھی قابلیت کا اظہار نہ پایا جاتا ہو۔ زبان و بیان کی سادگی اور سلاست کے باوجود معیار سے گرنے بھی نہ پائے اور یہی وہ خوبیاں تھیں جو غالب کے خطوط میں پائی گئیں اور انہیں مکاتیبی ادب کا درجہ ملا۔ غالب کے خط کے بعد اگر کسی کے خطوط نے لوگوں کو چونکا دیا تو وہ چودھری محمد علی ردولوی ہیں۔ چونکہ چودھری صاحب خط

۵ے ''کو یا دبستاں کھل گیا''، صفحات ۲۷۴ تا ۲۷۶

کو زندگی کا ایک جزو سمجھتے تھے اس لئے ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ کسی نہ کسی کو خط لکھیں۔ محمد علی کے خطوط میں تقریباً وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو غالب کے خطوط میں ہیں۔ خطوط کے مطالعہ سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ادیب کے خطوط اس کے نفسیاتی مطالعہ میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اور ادیب کی شخصیت پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

بقول غلام مہر رسول: ''خطوط و مکاتیب ہر شخص کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لئے نہایت عمدہ اور بڑی حد تک قابلِ اعتماد سرمایہ ہیں''۔ ۵۶

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ: ''یہ خطوط اردو خطوط نگاری کی تاریخ میں ایک نئے مقام کی نشاندہی کر رہے ہیں''۔ ۵۷

چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط میں دلچسپی اور رنگینی کے ساتھ ساتھ انکی شخصیت کے کئی پہلو ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

بقول مالک رام: ''ان کے خطوں کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا محبت کرنے والا باپ، مخلص دوست، خدا سے ڈرنے والا آدمی اور اچھا اور نیک شہری اور بڑے مرتبے کا انسان ہے اور جب کوئی آدمی بڑے مرتبے کا انسان ہو تو اسے اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ لوگ اسے شیعہ سمجھتے ہیں یا سنی، ہندو خیال کرتے ہیں یا مسلمان۔ اس کے نزدیک انسان خلاصہ کائنات ہے۔ کیونکہ انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے نہ کہ سنی یا شیعہ، ہندو یا مسلمان''۔ ۵۸

چودھری محمد علی کے خطوط اس قدر دلچسپ اور انکا انداز تحریر اتنا دلکش ہے کہ ان کو ایک بار پڑھ لینے کے بعد بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے ایک طرف تو ان کے خطوط انکے نجی حالات اور معاملات کے آئینہ دار ہیں۔ دوسری طرف اس دور کے سیاسی، سماجی، تمدنی حالات کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے خطوط میں طنز و مزاح، شوخی و ظرافت حد درجہ پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے عزیزوں سے دوری، دکھ اور دید کی حسرت سے متعلق جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی شوخی و طنز و ظرافت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان حالات میں جب انہیں خود ہنسنا دشوار ہو گیا تھا اس وقت بھی انہوں نے دوسروں کے لئے ہنسنے ہنسانے اور خوش ہونے کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ ان کے خطوط کی زبان بڑی سادہ اور دلکش ہے۔ انہوں نے پوربی الفاظ کا استعمال بھی جگہ جگہ کیا ہے جس سے عبارت کے حسن میں اور خوبصورتی پیدا ہو گئی ہے۔ محاوروں کا استعمال مناسب انداز سے کرتے

---

۵۶ ''نقوش مکاتیب نمبر جلد اول صفحہ ۱۴ ۵۷ ایضاً۔ صفحہ ۳۸ ۵۸ ایضاً، صفحہ ۵۶

ہیں۔ چودھری محمد علی ردولوی کو شعروشاعری سے بھی خاصی دلچسپی تھی مگر شاعر نہ بن سکے۔ شعروشاعری سے لگاؤ ان کے تقریباً ہر خط سے محسوس ہوتا ہے۔ ایک طرف تو تحریر کا انداز شاعرانہ دوسری طرف مختلف شعراء کے اشعار کا برمحل استعمال اس خوبی کی نشاندہی کرتا ہے۔ انہوں نے شاعری کی ہے کچھ اشعار نمونے کے طور پر ہیں۔ چودھری صاحب نے جس قسم کی شاعری کی ہے اس کی وضاحت وہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں۔

(وجہ شاعری از قلم موصوف)

''ایک مرتبہ صدیق حسن صاحب نے سرخے آم کی قلمیں مانگی تھیں اور مزاحاً'' لکھا تھا کہ اگر کمشنروں کے علاوہ کسی اور کو بھی سرخے دیئے جاتے ہوں تو ہم کو بھی بھیجو۔ پار سال وہ فیض آباد میں کمشنر تھے اور ان کو دو تین بار آم بھیجے تھے۔ اب کی سال تھے ہی نہیں بھیجتا کیسے۔ میں نے جواب میں شروع سے چھ اشعار سوداؔ کے ع

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک

میں سے لکھے اور اس کے بعد جوڑ لگایا وہ حسب ذیل ہے:

کھولے آغوشِ محبت کو بڑھا میں جوں ہی
پیچھے ہٹ کر کہا اس نے ذری دور سرک
ہوں میں ''سرخے'' کی پری تو نے نہیں پہنچانا
اور بھی ایسی کہیں دیکھی تھی چہرے کی دمک
میں خفا تجھ سے ہوں اور کہنے یہی آئی ہوں
کہ نہ دیکھے گا تو اس بار مرے پھل کی ڈلک
میں ہمیشہ رہی حکام سے پھنکی پھنکی
یہی انداز رہا یہ ہی رہی میری مڑک
جب سے آئی ہوں ترے گھر تو ہی کہہ دے سچ سچ
کس کمشنر نے کبھی دیکھی اس آنچل کی جھلک

اور غضب تو نے کیا بھیجا مجھے فیض آباد
ایسی رسوائی ہوئی تھی نہ مری آج تلک
ہے سزا تیری کہ اک سال نہ آؤں ترے پاس
رہے دل بیچ ترے بس مری فرقت کی کسک
گر ملاقات ہو صدیق حسن صاحب سے
میری تسلیم کو پہنچانا مقرر ان تک
اور کہنا کہ قلم میرے ہیں جو حاضر ہیں
باقی بھیجواؤں گی تیار کراکر ان تک
ان کی بیگم کو بھی پیغام میرا دے دینا
کہ بن اصلاح ہے یہ نظم کہاں اس میں نمک'' ۵۹

چودھری محمد علی ردولوی کی یہ نظم ہما بیگم کی تصنیف کردہ کتاب ''جوہار'' سے دستیاب ہوئی۔ یہ مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب ہے جسے ہما بیگم نے مرتب کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ چودھری صاحب کی یہ نظم پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں شاعری سے کتنی دلچسپی تھی۔ شاید پڑھنے کی حد تک شاعری سے انہیں بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ لیکن شاعری کے میدان میں وہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔ اساتذہ کے کلام کو پڑھ کر یا ان کے اشعار کو برمحل استعمال کر کے انہیں زیادہ سکون ملتا تھا۔

ایک خط ہما بیگم کو لکھتے ہیں جس میں کئی جگہوں پر اشعار کا برمحل استعمال ہے۔ اس کے علاوہ اس خط میں ایمان کی پختگی' اپنے اوپر طنز و تنقید' اللہ سے ہم کلام ہونا' دنیا سے کم دلچسپی مگر کتابوں سے لگاؤ' حکایتیں' اپنے اکیلے پن کا ذکر' سلمان کے خود خط نہ لکھنے کی شکایت' مہمان نوازی وغیرہ جیسے مضامین ہیں لکھتے ہیں کہ:

''۔۔۔۔ خدا تم کو خوش رکھے اور تمہاری مرادیں پوری کرے۔ جو پند و نصائح تم کرتی ہو وہ میرے دل میں بھی آتے ہیں۔ مگر دل پر اللہ میاں قفل چڑھائے ہیں۔ وہ کسی طرح نہیں کھولتے۔ اگر وہ قفل کھل جائے تو پھر کیا کہنا اب نماز بھی زیادہ جی لگا کر پڑھتا ہوں اور دعا بھی بہت جی سے مانگتا ہوں۔ اس رحم و کرم کا خیال جی میں جماتا ہوں مگر

مرا دل ایست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

اور اوقات میں بھی غور و فکر کر کے ایمان کے عقیدے دل میں مضبوط کرتا ہوں۔ مگر صبح کے وقت جس کو حضوری کا وقت کہو اس وقت دل میں وہی خیالات یلغار بولتے رہتے ہیں جن سے ایمان متنفر ہے۔

---

۵۹ ''جوہار'' از ہما اخلاق حسین' صفحات ۴۶۵ تا ۴۶۶

عالم بخروش لاالہٰ الا اوست
غافل بگماں کہ دشمن است این یا دوست
دریا بوجود خویش خطے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

یہاں جی چاہتا ہے کہ خاص تعلق ہوتا جس کو Personal God کہتے ہیں مگر وہاں قاعدہ ہی اور دکھائی دیتا ہے۔ نماز کے بعد بارگاہِ خدا میں عرض کرتا ہوں کہ بارالہٰا ایمان دے۔ اللہ میاں فرماتے ہیں ہمارا کام ہی ہے ایمان بخشنا۔ مگر تم خود اپنے دل میں ڈھونڈو۔ یہ طلب تمہاری صادق ہے؟ میں عرض کرتا ہوں میرے مالک میری تمنا ایمان کی روشنی سے سینہ جگ مگ جگ مگ کرنے لگے۔ جی سے معلوم ہوتی ہے۔ وہاں سے ارشاد ہوتا ہے کہ ہاں ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر غور کرو تم نے جوانی میں بہت سی عورتوں کو جانا ہے۔ بھلا ایمان سے کہو اس بے تابی' تڑپ' شوق کا کچھ بھی شائبہ ہماری تلاش میں پاتے ہو۔ میں عرض کرتا ہوں جی نہیں اس طرح کی تڑپ' بے چینی تو نہیں پاتا۔ ایک دوسری طرح کی خواہش ضرور ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ ہم تمہارے دل کا حال تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ خواہش جو تم محسوس کرتے ہو تو یہ ہماری محبت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بوڑھے ہو گئے ہو۔ عورت منہ نہیں لگاتی۔ طاقت جواب دے رہی ہے۔ موت کھڑی گھور رہی ہے اس لئے اس طرح کے خیالات دل میں پاتے ہو۔ میں عرض کرتا ہوں بارالہٰا اب تیرے سمجھانے سے سمجھ میں آتا ہے۔ واقعی تیری خواہش انہی مجبوریوں سے ہوگی۔ مگر ہے تو۔ جوانی میں نہ سہی بڑھاپے میں سہی مگر اب تو ہے۔ اسی کا خیال فرما کر رحم کر اور دے دے دولت ایمان۔ جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں چلے چلو۔

چہ روظیفہ تو دعا کردن است و بس

درفکر آن مباش کہ نشنید یا شنید

۔۔۔۔ میں عرض کرتا ہوں ارے میرے رب میں تو اس سے زیادہ کی آس لگائے ہوں۔ تو رحیم ہے' کریم ہے' غفار ہے' تیرا کیا نقصان ہے اگر اس سے زیادہ دے دے میرے قلب کو تسکین ہو جائے۔ حکم ہوتا ہے زیادہ بک بک مت کرو۔۔۔۔ ابے ہم تیرے رگ پٹھے سے واقف ہیں۔ بہروپیا' جھپ چھپا لیا دنیا بھر کا۔ آیا ہے وہاں سے ہوا باندھنے۔ میں عرض کرتا ہوں اب حضور مالک ہیں جو جی چاہے کہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ حضرت ابراہیم نے یہی کہا تھا کہ قائل تو تو نے کر دیا۔ مگر دل کو تسکین نہیں ہوئی۔ وہ بڑے آدمی تھے تیرے مقرب تھے۔ ان کو کچھ نہیں کہا اور ہمارے اوپر خفا ہوتے ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں۔۔۔۔ میں ساڑھے تین برس کا تھا آپ نے باپ کا سایہ سر سے اٹھالیا۔۔۔۔ گھر میں پھوپھی دادا رہتے تھے وہ والد

کے قصے سنایا کرتے تھے کہ تمہارے باپ نے یہ کیا وہ کیا۔ میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوتا تھا کہ ہم بھی بڑے ہونگے تو یہی کریں گے۔ اس کے بعد ہم کالون اسکول بھیج دیئے گئے۔ وہاں سب طرح کے خیالات دل میں ڈالے گئے۔ جب جوانی قریب آئی تو تو ہی نے خیالات میں آزادی دی خودرائے قائم کرنے کی قوت بخشی۔ ہربرٹ اسپنسر مل کے خیالات دل میں جمنے لگے۔ کفروالحاد کی بنا پڑ گئی۔ جس طرح سے تو نے خسرہ مقرر کیا ہے کہ سب کو نکلے اسی طرح سے شروع جوانی میں تیرے ہی حکم سے خیالات میں آزادی آتی ہے۔ جیسے بعضوں کو اسی خسرہ سے سینہ کے بیماری ہو جاتی ہے۔ جو جان لے کر جاتی ہے۔ اسی طرح شروع جوانی کے خیالات بھی ہیں کہ بعضوں پر ان کا اثر نہیں رہتا اور بعض بے چارے ایسے بدقسمت ہوتے ہیں کہ جن کو خیالات کی دق ہو جاتی ہے۔ جیسے دق کی دوا کرنے میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ اسی طرح ان خیالات کو بھی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت سے خوش قسمت بچ جاتے ہیں۔ بہت سے ہمارے ایسے جوانا مرگ پاتے ہیں۔ اب اس میں ہمارا کیا بس تھا اور کون بس ہے۔ حضور جان بخشی ہو تو ایک بات عرض کروں۔ ہاتف غیب۔ کہو کہو کہے جاؤ ہم سنتے ہیں۔۔۔۔ ہم وعدہ نہیں کرتے مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ بے آس مت ہو جاؤ۔۔۔۔ ہم اپنے بندوں کی عرض حال کو برا نہیں مانتے' کہہ چلو۔۔۔۔ ہم تمہارے اوپر مشیت کے راز اپنے کھولنا نہیں چاہتے۔ مگر اتنا بتائے دیتے ہیں کہ الایمان بین الخوف والرجا۔ بس اٹھو سجدے سے اپنا کام دیکھو۔۔۔۔ تمہاری پیٹھ کا درد بھی بے چین کیے ہے۔ کوئی اچھا خیال آتا ہی نہیں۔ لیکن میں ہر بات کے لئے تیار ہوں۔ اپنی موت سب سے سخت ہے۔ جب میں اس پر بھی راضی ہو گیا ہوں تو پھر کچھ اور کہنے کی حاجت نہیں۔

سنو ہما! تم کو تمہاری بہنیں لتری کہتی تھیں۔ اب نہ معلوم کہتی ہیں یا نہیں۔۔۔۔ ایک بات کہنا چاہتا ہوں تم سے کیسے تاب ہوگی کہ اس معاملے میں لترا پن نہ کرو۔ مگر میں مجبور ہوں کہنے پر۔ یہ سلمان مجھ کو خط کیوں نہیں لکھتے کوئی شکایت ان کو مجھ سے ہے؟ میں نے تو اپنے خیال میں کوئی تکلیف ان کو نہیں پہنچائی۔

رہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

۔۔۔۔ سلمان نے خود تو نہیں لکھا مگر منن سے دو تین خط خیریت کے لکھوا کر بھیجے۔۔۔۔ ہا بیگم اب دنیا کی ہر ہوس کم ہو گئی ہے مگر کتابوں کا شوق ویسا ہی ہے۔۔۔۔ ایک بات کہہ دوں اگر تم اپنا پیٹ کاٹ کر یا بغیر پیٹ کاٹے ہی سہی تم نے کوئی کتاب بھیجی تو خدا اور رسول ﷺ کی قسم مجھ کو بڑی اذیت ہوگی۔ میں اپنے اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میرا دل چاہے گا کہ دیوار سے سر پھوڑوں۔ اس لئے بیٹی میرے اوپر رحم کر کے ایسی بات نہ کرنا جس میں تمہارا باپ کم بخت بڑی شدید تکلیف میں مبتلا ہو جائے۔۔۔۔ ہاں وہ لاڈلے نواب والا سوز تو لکھ دیں۔

عید کا دن عشرہ ذی الحجہ مقرر کیوں ہوا
ایک شہزادہ نبی زادہ چھری سے بچ گیا
کرتے ہیں اس کے عوض میں مومنین دنبے فدا
عشرہ ماہ محرم کیا قیامت روز تھا
رحمت اللعالمین کا قتل دل جانی ہوا
بھوکا پیاسا فاطمہؓ کا لال قربانی ہوا ۲۰

اپنی منہ بولی نواسی عتیق (بیگم عظیم الحسن قادری) کے نام ایک خط میں ایک بیماری کا ذکر مزاحیہ انداز میں کرتے ہیں۔ اور بڑے بڑے اساتذہ کا کلام نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں جس سے انکے شعری ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

۔۔۔۔تم نے مجھ کو لکھا تھا کہ خط کا جواب جلد دینا' میں نے جو سون کھینچی تو آج تک نہ چیتا۔ بیٹی میری اس حرکت پر نہ خفا ہونا نہ تعجب کرنا اگر دل کسی طرح نہ مانے تو افسوس کر لینا۔ بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ عبرت کر کے چپ ہو جانا۔ یعنی دل میں خیال نہ لانا کہ کہیں خوانخواستہ نصیب دشمناں یہی عارضہ مجھ کو بھی نہ ہو جائے۔ ہاں بیٹی یہ عارضہ تو ہے ہی۔ پہلے میں بھی سمجھا کرتا تھا کہ اکثر جو میں لوگوں کو خط نہیں لکھتا تو یہ صرف میرا موٹا سا پن ہے یا کاہلی ہے یا یہ کہ میرے دل میں اس کی محبت نہیں ہے۔ اب پتہ چلا کہ یہ ایک چھوٹا موٹا عارضہ ہے جس کا علاج اگر ہو بھی تو ابھی ہمارے ممالک تک تو پہنچا نہیں۔ امریکہ وغیرہ میں معلوم ہوا کہ ہے۔ وہاں بہت سے پڑھے لکھوں نے ایک جلسہ قائم کیا ہے۔ اس کا نام شاید ہے ''انجمن امداد نفسیاتی'' مثلاً کوئی لڑکی ہے وہ بد مزاج ہے' خود غرض ہے۔۔۔۔ یا کوئی لڑکا ہے وہ ہر وقت کتاب ہی لئے پڑھا کرتا ہے۔ بھائی بہنوں سے زیادہ گھلتا ملتا نہیں۔۔۔ گھر والے کہتے ہیں کہ ان کی دنیا ہی علیحدہ ہے۔ ان بیماریوں کی خبر اکثر خود آدمی کو مشکل سے ہوتی ہے۔۔۔ مجھ کو اکثر گمان گذرتا تھا کہ یہی عارضہ مجھ کو تو نہیں ہو گیا ہے۔ مگر کہتا تھا کہ نہیں ہم ایسے اچھے آدمی ہیں۔ ہم کو ایسا خراب عارضہ کیا ہوگا۔ اب یہی عارضہ سلمان کو ہو گیا ہے۔ دو برس سے انہوں نے ہم کو خط نہیں لکھا ہے۔ یہی سلمان تھے کہ آکسفورڈ سے ہر ہفتہ خط لکھتے تھے۔ اور اب دو دو برس نہیں لکھتے۔ حالانکہ تب بیس برس کے تھے۔ دلچسپیاں زیادہ رہی ہونگی۔ اور اب تو بقول غالب کے وہی زمردیں کاخ' وہی طوبیٰ کی ایک شاخ' چشم بد دور وہی ایک حور تب بھی ہم کو یاد نہیں کرتے۔ تو یہ عارضہ نہیں تو اور کیا ہے۔۔۔۔۔ تمہارے خط سے معلوم ہوا تھا کہ میرا پہلا خط دلچسپ تھا۔ یہ خط مولوی صاحب کا سبق ہو گیا ہے۔ دلچسپی کیا ہوگی' اس لئے چند اشعار اپنی بیاض سے لکھ کر بھیجے دیتا ہوں۔

---

۲۰ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۱۵۸ تا ۱۷۰

کہاں ہیں آدمی دنیا میں پیدا
خدائی صدقے کی انساں پر سے (میر تقی میر)
دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
اس سے الجھاؤ تری کاکل پیچاں میں نہیں (حالی)
سنگِ جفا سے شیشہ دل توڑ تاڑ کے
بس اٹھ چلے نہ کھیل کو پیارے بگاڑ کے (قیس)
لڑنے کو اس سے رات میں غصے میں لڑ لیا
پر جب وہ اٹھ چلا تو کلیجہ پکڑ لیا (مرزا احمد ایرانی)
صورت بھی پیاری پیاری ہے باتیں بھی خوب ہیں
پھر بھی یہ ڈر لگا ہے کہ بیداد گر نہ ہو (امیر مینائی)
لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے (مصحفی)
لیا ہم نے بوسہ رخ تو نہ بدگماں ہوا اے جاں
کوئی پھول دیکھ لیتے تو اسے بھی پیار کرتے (اکبر)
اے فغاں دیکھنا سمجھ لینا
دے کے دل پھر لیا نہیں جاتا (فغاں)
آج در بند کئے جاتے ہیں زندانوں کے
اور بگڑیں گے مزاج آپ کے دیوانوں کے
سئے جاتے ہیں کفن آپ کے دیوانوں کے
تار داماں کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے
وحشیوں کا ترے اتنا تو پتہ چلتا ہے
استخواں ملتے ہیں گوشے میں بیابانوں کے
شام ہی سے وہ یہ کہتے ہیں ستانے کے لئے
موتی ٹھنڈے ہوئے جاتے ہیں مرے کانوں کے
شاعری کے لئے توہین کا باعث ہو رشید
تم نہ بیٹھا کرو مجمع میں سخندانوں کے (پیارے صاحب رشید)
لوٹ لے جی بھر کے حسرت لذتِ آزارِ عشق
اس ستمگر کا یہ رنگِ آشنائی پھر کہاں (حسرت)''[۲۱]

---

[۲۱] ''گویا دبستاں کھل گیا''، صفحات ۱۸۱ تا ۱۸۵

مندرجہ ذیل خط ہما بیگم کو لکھ رہے ہیں جس میں زمینداری کی بدحالی کا ذکر ہے اور اپنی کتاب ''پردے کی بات'' کا موازنہ ہما بیگم کی کتاب سے کیا ہے۔ پکی بولی کا ذکر ہے شعر کا استعمال ہے' لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔ میں زندہ ہوں اور اچھا ہوں۔ فی الحال کوئی مرنے کی امید بھی نہیں ہے۔ زمینداروں کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے باوجود فلسفیانہ نظر رکھنے کے پھر بھی زندگی بدمزاہ ہو جاتی ہے۔۔۔۔ گرمیاں بہت پڑنے لگی ہیں۔ صبح کو دوائیں بانٹ لیتا ہوں اس کے بعد پھر کوئی کام نہیں ہوتا۔ کام میں کرتا ہی کب تھا۔'' جما گھر گھر گھما چرخہ کیسے کاتوں' والی بات ہے۔۔۔۔ جب میں ہسپتال میں تھا تو مولوی نصیر صاحب مجھ کو دیکھنے آئے۔۔۔۔ دو دن کے بعد میں انکا شکریہ ادا کرنے گیا۔۔۔۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی بھی آ گئے۔ تمہاری کتاب کی تعریفیں کرنے لگے۔ میرا دل خوش ہوا۔ اس کے بعد حال کھلا کہ وہ تعریف اس وجہ سے کی گئی تھی کہ میرے اوپر اعتراض کیا جائے۔ فرمانے لگے کہ اسی کے مقابلے میں آپ نے ''پردے کی بات'' لکھی ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ اس کے بعد کہا کہ آپ کی صاحبزادی نے یہ کتاب آپ کی تربیت کے اثر سے تو نہیں لکھی ہوگی میں نے کہا میری تربیت ایسی کہاں تھی۔ قصہ مختصر جو جو وہ مجھ پر چوٹیں کرتے تھے میں بلا ارادہ انکسار و خاکساری برتتا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ اس کتاب پر دیباچہ میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ بہرحال امام حسن علیہ السلام نے میری مدد کی اور نرمی اور آشتی میری بڑھتی گئی۔۔۔۔ ان کے مقابلے میں مولوی نصیر انسان کی صورت' انسان کی سیرت' انسانی کمزوریوں کی رواداری۔

زن گفت کہ ہجوی نمایم ہستم
تو نیز چنا نکہ می نمائی ہستی

مجھ کو یہ شخص خدا کا اچھا بندہ معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔ محلے میں بس ہم ہی دو آدمی رہ گئے یا میر نعمت ہیں۔ مگر وہ پکی بولی بولتے ہیں۔'' ۲۶ چودھری صاحب میجر سید ابو جعفر کے نام تحریر کردہ ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں:

''۔۔۔۔ نہ جانے کتنے نیاز نامے کتنے عقیدت نامے جناب کے نام لکھ چکا ہوں۔ جو قلم اور کاغذ کے شرمندہ نہیں ہوئے۔۔۔۔ جس رسالے کی خبر آپ کو بھائی بدرل نے دی ہے۔ اس کے لکھنے کی آرزو ہمیشہ سے تھی مگر کچھ بنتا نہ تھا۔ آخر کار لکھ ہی گیا۔ مگر جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر نہ ملی۔ میں چاہتا تھا یہ رسالہ ایسا ہو جیسا میر تقی میر بتا گئے تھے۔ یعنی'

جی میں جو آوے کہو پیارے
ایک ہونا نہ در پے آزار

---

۲۶ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۱۸۵ تا ۱۸۷

۔۔۔۔آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ حدیث وتفسیر کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ جی کے دیکھے جاڑا جوڑی وہی بر بیا ہن آوے۔ حضرت! احادیث وتفسیر ہی کے دکھوں تو یہ رسالہ لکھا گیا ہے۔

زبانیں بحث میں الجھی ہیں حیرت دل پہ چھائی ہے
حدیثوں میں مذاہب ہیں حوادث میں خدائی ہے
خوب لڑوایا بہم دل کھول کر
راویوں نے مار ڈالا قوم کو

قرآن سمجھنے کے لئے احادیث ضروری ہیں لیکن اسی قدر جتنی ضروری ہوں۔ یہ نہیں کہ بجائے دال میں نمک کے نمک میں دال ڈالی جائے اور واقعی ہوا ہے، یہی کہ ہمارے علماء منبر پر سے یا چوکی پر سے اگر ایک آیت پڑھتے ہیں تو پچیس احادیث پڑھتے ہیں۔ فرقہ بندی کی دل آویزی سے واقف ہیں۔ لہٰذا وہی کرتے ہیں جس میں قدر زیادہ منزلت زیادہ ہونے سے زیادہ ہاتھ آتے اور حلوے کا کونڈا گزشتہ سال سے زیادہ بڑا ساتھ جائے۔

مرے قران پڑھنے سے نہ ہوں یوں بدگماں حضرت
مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہئے

اگر معلوم ہو جائے کہ آپ کا رجحان تشیع کی طرف ہے یا سنیت کی طرف یا تصوف کی طرف یا وہابیت کی طرف تو جس طرح کا مال چاہئے حاضر ہے۔ آپ کی دعا سے ہر طرح کا مال گودام میں بھرا پڑا ہے۔۔۔۔۔ستر برس کا ہوں ہر وقت کتاب کا کیڑا رہا۔ مگر چونکہ بنیاد اچھی نہیں تھی اس لئے اوپر کی عمارت بودی رہی۔ صرف ونحو سے نابلد۔ لیٹن نہیں جانتا، فرنچ نہیں جانتا، کتاب لکھنا صرف اسی کو زیبا ہے جو موضوع پر حاوی ہو۔ ہم نے دوسروں کے اقتباس، تیسروں کی کتابیں پڑھ کر کتاب لکھی۔ کاش کہ یہ جرات نہ کرتے۔۔۔۔۔ جب آپ کا کوئی خط دیکھا ہے، جب دولتِ ہم کلامی نصیب ہوئی ہے۔ تب کچھ نہ کچھ اس فقیر کی جھولی میں پڑ گیا ہے۔ کبھی منوہر کا نگولی عبرت دلا گئے کبھی ''بھلا یہ کون دھرم ہے'' نئے نئے گوشے پیش نظر کر دئے۔ کبھی جناب صاحب اا امر علیہ السلام کی راہ کی مشکلات آئینہ ہو گئیں، کبھی تلسی داس نے جناب امیر علیہ السلام کے کلام کی تفسیر کر دی۔۔۔۔۔ کبھی اس بڑھاپے میں دوشاخہ لکڑی سے ڈھارس ہوگئی کہ بڑھاپے میں بھی کام چلا جائے گا۔ قصہ مختصر جب موقع ملا تو آپ کے قدموں کی خاک سے کچھ نہ کچھ موتی ہی رول لئے۔

یارب اماں دہ تا باز بیند
چشم محباں روئے حبیباں

بھائی بدرل کو خط لکھنے کا عارضہ ہے اور میں کوتاہ قلمی کی اقلیم کا بسنے والا ہوں۔ لیکن اگر کوئی آپ کا ایسا خط لکھنے والا ہو تو دین ودنیا کا کام چھوڑ کر اسی پر کمر باندھ لیتا ہوں۔ ''مارک ٹوین'' جب انگلستان آئے تو بڑی آؤ بھگت ہوئی ہر جگہ ذکر ہوئے آنکھیں

دیں۔گروسرز کلب کی اسپیچ ان کی بہترین تھی۔مارک ٹوین نے کہا بیرل کا ایسا گدگری کرنے والا بھی تو کوئی نہ تھا۔'' ۶۳

چودھری محمد علی کے خطوں میں تشبیہیں ومحاوروں کا استعمال تحریر کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔مثلاً یہ خط انہوں نے ہما بیگم کو لکھا ہے:

''قربانت شوم!

سن رہا ہوں کہ تمہارے دشمنوں کے حرارت آ گئی۔تمہاری بیماری میں میری وہی کیفیت ہوتی ہے جو میر تقی میر کی برسات میں پرانے گھر کو دیکھ کر ہوتی تھی۔

تر تنک ہو تو سو کھتے ہیں ہم'' ۶۴

اس خط سے چودھری محمد علی کی ادبی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔کس خوبصورتی سے وہ اپنی دلی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں کہ بیٹی کی بیماری سے انہیں کتنا دکھ ہے۔''گویا دبستاں کھل گیا'' میں ہر قسم کے خطوط آپ کو مل جائیں گے۔گویا یہ ایک آئینہ ہے جس میں دیکھنے والے کو اس کے مزاج کے مطابق اس کی تصویریں دکھاتا ہے۔اور یہی چودھری محمد علی ردولوی کی اردو خطوط نگاری میں عظمت کی دلیل ہے۔اور بڑے بڑے نقادوں نے انکی عظمت کو سراہا ہے۔اور مختلف انداز سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

اسرار الحق مجاز ردولوی کا انتقال ۵ردسمبر ۱۹۵۵ء کو ہوا۔چودھری صاحب نے پرسے کا خط ان کے والد سراج الحق کے نام لکھا جس پر تاریخ تو درج نہیں مگر یقیناً یہ دسمبر ۱۹۹۵ء کی ہی کسی تاریخ میں تحریر کیا گیا ہوگا۔''گویا دبستاں کھل گیا'' میں تو یہ خط شامل نہیں مگر اسے صہبا لکھنوی نے ''مجاز ایک آہنگ'' میں شائع کیا ہے۔پرسے کے اس خط میں چودھری صاحب کا مخصوص اندازِ تحریر نمایاں ہے: ''۔۔۔۔خدا آپ پر رحم فرمائے۔اور جو زخم آپ کے حکم خدا سے لگے ہیں ان کے بدلے میں خدا آپ کو اجر دے۔۔۔۔بڑے بڑے اولیائے رب العالمین نے یہ دعا کی ہے کہ مشیت پر راضی رہنے کی توفیق عطا ہو۔۔۔۔جب دن زندگی کے باقی ہوں' آپ بھی یہی دعا کیجئے۔۔۔۔دانا اور بینا خدا بخشش کے بہانے مقرر کرتا ہے۔یقیناً آپ دونوں آدمیوں کو جنت الماویٰ میں جگہ دے گا۔۔۔۔پوسٹ کارڈ مجبوراً لکھ رہا ہوں' کیونکہ دبیز ہے۔پتلا کاغذ بار بار جگہ سے کھسک جاتا ہے اور پوسٹ کارڈ کے بھی اور کے دونوں سرے ایک آدمی پکڑے رہتا ہے' تب لکھ سکتا ہوں۔۔۔۔دعا گو: مفلوج' محمد علی عفی عنہ'' ۶۵

۸۔ چودھری محمد علی ردولوی کے غیر مطبوعہ خطوط:

چودھری محمد علی ردولوی کے غیر مطبوعہ خطوط جو دستیاب ہوئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

یہ خط شاہ آفاق احمد کے نام ہے یہ صاحب درگاہ شریف شاہ مخدوم عبدالحق قدسیؒ کے سجادہ نشیں جناب شاہ حیات احمد کے فرزند ہیں۔شاہ آفاق احمد چودھری محمد علی سے عمر میں بہت چھوٹے تھے مگر ان کا شمار چودھری صاحب کے عزیز ترین

---

۶۳ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۱۹۱ تا ۱۹۴ ۶۴ ایضاً' صفحہ ۳۶ ۶۵ ''مجاز ایک آہنگ'' صفحہ ۹۲۴

دوستوں میں ہوتا ہے۔ وہ ان کو اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ کبھی کبھی شاہ آفاق احمد کو ردولی سے باہر جانا پڑتا تھا۔ چودھری صاحب انکی جدائی برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ ایک بار شاہ آفاق احمد الہ آباد گئے چودھری محمد علی ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

''۱۹/اکتوبر ۱۹۵۸ء ۔ ۵ بجے شام

آفاق بیٹا دعائیں قبول کرو!

اس وقت تمہارے دولفافے آئے۔ عموماً صبح کو میرے اتنے حواس ہوتے ہیں کہ خط لکھوں۔ مگر تم کو شاید ہر وقت لکھ سکتا ہوں۔ کیوں اگر غلط سلط بھی لکھ جاؤنگا تو اعتراض کا ڈر نہ ہوگا نہ میرے اوچھے پن پر اور عنانیت کو دھکا لگے گا۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر میں مافی الضمیر نہ ادا کر سکا تب بھی یقیناً تم معنیٰ لگا کر دل کی بات سمجھ جاؤ گے۔ تم جانتے ہو۔ تیسرے پہر کو میرا دل جب سے فالج گرا ہے ہمیشہ گھبراتا ہے۔ آج بھی وہی حال بنا ہے۔ بھائی بدرل حسب دستور آئے ہیں۔ میاں کھدن جو آج بھی وہی حال بنا ہے۔ بھائی بدرل حسب وسطور آئے ہیں۔ میاں کھدن جو آج پانچ دن کے بعد آئے تھے۔ ان سے کہنے لگے کہ آج میچ دیکھنے آپ نہیں گئے آج تو اچھا میچ تھا۔ بس بھائی بدرل اٹھ کر کھڑے ہوئے کھدن پہلے ہی سے جانے کو تیار تھے فوراً چلے گئے۔ میاں کھدن تو آنے کو کہہ گئے ہیں۔ تمہارے خط کے بعد یوں جی بہل گیا تھا۔ اب تو تم سے باتیں کر رہا ہوں اس لئے کیوں نہ بہلتا۔ قیصر کو اندر سے بلا بھیجا تھا۔ تمہارے خطوط ان کو پہلے ہی بھیج دیئے تھے۔ نوشاد بھلے مانس ہیں بیٹھے مغرب کے وضو کی تیاری کر رہے ہیں۔ کل قیصر تمہارے گھر دن کو گئی تھیں۔ ندیم ماشاءاللہ بالکل اچھا ہے اور بحمداللہ ہمہ وجوہ خیریت ہے۔

احمد میاں صاحب کو یقین دلا دیجئے گا کہ اول تو خود موصوف کی خوبیاں' دوسرے تمہارے اور ان کے تعلقات' پھر ان کے احسانات کا' اگر سعید سوا اسکول کے الہ آباد بھر میں کس گھر اور طرح رہ سکتا ہے۔

موصوف کا گھر ہے کچھ موصوف کا روحانی تصوف ہے کہ مجھ کو ان سے بجائے تکلف ہونے کے دل ان کی طرف کھچتا رہتا ہے۔ میرا تسلیم کہنا اور کہہ دینا کہ دعا کے وقت مجھ کو نہ بھول جائیں۔ بچارے روز بہ روز معذور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تو بہت دنوں سے نہیں آئے مگر میاں بدرل کے یہاں صبح کے وقت جاتے تھے' اب شاید وہ بھی رک جائیں۔ سہیل میاں تیسرے دن لازمی آتے ہیں اور دل سے آتے ہیں۔ نواب صاحب بغیر تمہارے کیا کریں آکر۔ ایک دن آئے تھے مگر قدرداں نہ ہونے سے چلے گئے۔

قیصر بہت بہت دعائیں کہتی ہیں۔ محمد میاں صاحب کی خدمت میں بھی سلام ممنون۔

تمہارا دعاگو

محمد علی عفی عنہ

مندرجہ ذیل خط چودھری محمد علی ردولوی نے اپنی پیاری بیٹی ہما بیگم کے نام یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء کو تحریر کیا تھا:

ہما پیاری دعا!

جو خط اور جیسا خط پہنچ جائے اس کو غنیمت جانو اور تعجب مت کرو۔ علاوہ صبح کے خط بہت دنوں سے نہیں لکھ سکتا تھا۔ اب تو اللہ میاں نے آنکھوں کے ذریعے سے گناہوں کی بخشش انشاءاللہ تعالیٰ شروع کی ہے۔ شکراً شکراً شکراً، عفواً، عفواً، عفواً، یا اللہ یار باہ یا سیداہ۔ تکلیف کر کے چند ایک خطوط ذیل کے پتہ پر بھیج دو۔

عبدالعزیز انصاری صاحب ایم۔اے، ایل ایل بی

عمار منزل، میرس روڈ۔ علی گڑھ

یہ میرے دوست اور تمہارے چچا اور فی الحال سعید کے گارڈین ہیں۔ صفحہ ۶۰ پر پہلا شعر گاندھی کی تاریخ کا رہ گیا ہے۔ جس پر درست۔۔۔۔ حسب ذیل شعر شروع صفحہ پر لکھ دیا کرنا۔

گاندھی مرحوم حق آگاہ مرد

خود بخفت و ہندرا بیدار کرد

طفیل صاحب سے میں نے شخصیات نمبر جو اب نکلا ہے، وہ میں نے مانگا تھا اور کہا تھا کہ اس کی قیمت ہما بیگم ادا کر دینگی۔ بی وہ دام ان کو بھیج دو اور جس طرح سے کہو تم کو ادا کر دوں۔ یہ درخواست میں نے پہلے بھی کی تھی۔ معلوم نہیں تم کو وہ خط پہنچا یا نہیں۔

ہماری حالت ہر حال میں قابلِ شکر ہے۔

۲ر نومبر۔ آج دیوالی کی تعطیل تھی اس لئے ٹکٹ نہیں ملا۔ اب انشاءاللہ تعالیٰ کل جائے گا۔ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوں مگر کتابوں کی ہوس نہیں جاتی۔

جس نمبر میں تم نے میرا حال لکھا تھا وہ تو ہے، مگر جس نمبر میں میری ایک کہانی تھی ''دور کا نشانہ'' وہ نہیں ملتا۔ بھلا تم اس کو بھیج سکتی ہو۔ بی بی یہ خیال نہ کرنا کہ میں تمہارے دام مارلونگا۔ اگر خدا نے چاہا تو گلے گلے پانی میں دونگا اور اس کی امید ہے کہ تم مجھ کو معاف کر دوگی۔

اچھا بی بی خدا حافظ اب نہیں لکھا جاتا۔

تمہارا دعا گو تمہارا فدائی تمہارا باپ

عفی عنہ

یہ خطوط ہما بیگم کے چھوٹے صاحبزادے سید علی کاظم کے توسط سے دستیاب ہوئے۔

باب چہارم

چودھری محمد علی ردولوی کی افسانہ نگاری

۱۔ اردو افسانہ نگاری کا پس منظر:

اردو ادب میں جس طرح ناول کی ابتداء ہو جانے کے بعد بھی داستان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہی۔ اسی طرح ناول کے عین فنی عروج کے زمانے میں مختصر افسانہ پیدا ہوا۔ افسانے کی پیدائش کا دن وہ دن تھا جب ہمارا ناول آہستہ آہستہ فلسفہ، منطق اور نفسیات کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ ''امراؤ جان ادا'' اور ''خواب ہستی'' کی تخلیق کا دور افسانہ کی پیدائش کا زمانہ ہے۔ مختصر افسانہ کے ابتدائی دور میں واضح طور پر داستان کی خوبصورت و دلکش روایت کا عکس نظر آتا ہے۔ پریم چند کے افسانوں کے کئی مجموعے مثلاً ''سوزِ وطن'' ''پریم پچیسی'' اور ''پریم تبیہ'' ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں ''خارستان'' اور ''گلستان'' سلطان حیدر جوش کے اکثر اصلاحی افسانے اور نیاز فتح پوری کے افسانوں کے مجموعے ''نگارستان'' وغیرہ میں اس روایت کی جھلک نظر آتی ہے۔

اردو افسانہ کی تاریخ میں ۱۹۳۵ء کا سال بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ اس وقت تک افسانہ نے تمام فنی مراحل طے کر لئے تھے۔ اور اس منزل پر پہنچ کر ہمارے بہت سے افسانہ نگاروں نے ایسے افسانے لکھے جو ایک طرف تو اس لئے اہم ہیں کہ ان میں مشرقی زندگی کی روایتوں اور فن کی نزاکتوں کا عنصر ہے۔ اور دوسری جانب مغربی فن آہستہ آہستہ ہمارے افسانہ کے اسلوب کو متاثر کر رہا تھا۔ ان افسانوں کے ذریعے ایک باغیانہ انداز اردو افسانہ کی روایت میں داخل ہوا۔

پہلے قسم کے افسانوں کی نمایاں مثال پریم چند کا افسانہ ''کفن'' ہے اور دوسری طرح کے افسانوں کا نمونہ ''انگارے'' کے نام سے چھپا۔ کفن اور انگارے کے بعد ترقی پسند تحریک نے افسانہ کو بڑی تیزی سے پروان چڑھایا اور اسے اس قابل بنا دیا کہ آنے والے دس سالوں میں اس کی بعض تخلیقات دنیائے ادب کی بہترین افسانوی تخلیقات کی ہمسری کے قابل ہو گئیں۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ ہمارے افسانوی ادب کے عروج کا زمانہ ہے۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، علی عباس حسینی، اوپندر ناتھ اشک، احمد علی، اختر انصاری، سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری، حجاب، منٹو، راجیندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، ممتاز مفتی، ممتاز شریں، ابراہیم جلیس، حاجرہ مسرور، شفیق الرحمان، قراۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، تسنیم، سلیم چھتاری وغیرہ نے پڑھنے

والوں کے ایک وسیع حلقے میں مقبولیت حاصل کی اور اپنے مخصوص انداز میں افسانہ کے فن کو نئی جہت بھی دی۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں مجموعی طور سے تین اہم خصوصیات نمایاں ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ان افسانہ نگاروں نے افسانہ اور زندگی کی حقیقتوں میں گہرا ربط پیدا کیا ہے۔ خاص طور سے علی عباس حسینی' اختر اورینوی' سہیل عظیم آبادی' احمد ندیم قاسمی اور دیوندر ستیارتھی کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کی آمیزش کے علاوہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے الگ الگ دیہاتوں کی مصوری نمایاں ہے۔

حیات اللہ انصاری' اختر انصاری' غلام عباس' عصمت چغتائی' تسنیم' سلیم' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' قراۃ العین حیدر' حسن عسکری اشک' بیدی شہری زندگی کے افسانہ نگار ہوتے ہوئے بھی زندگی کے ایسے پہلوؤں کو اپنے افسانے کا موضوع بناتے ہیں جو ان کے مشاہدے سے بہت قریب ہیں۔ کرشن چندر نے بہت کچھ لکھا ہے مگر سب سے زیادہ کشمیر کے بارے میں لکھا ہے۔ اس دور کے افسانوں کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ لکھنے والوں کے مزاج اور شخصیت کا عکس انکی تحریر میں جھلکتا ہے۔

اس دور کے افسانوں کی تیسری اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کے افسانہ نگار اسلوب اور فن میں نئے نئے تجربات کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کو دوسروں کی اچھی چیزوں کو اپنا لینے کا فن آتا ہے۔ اس طرح یہ نئے دور کا افسانہ موضوع کے تنوع کے اعتبار سے اسلوب کے نئے پن کے لحاظ سے فکر' تخیل اور احساس کی کونہ گونی کے نقطہ نظر سے پچھلے دور کے افسانوں سے بہت مختلف نظر آتا ہے۔ اس میں جدت اور روایت کا بہت خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس میں ایک خاص عہد کی سیاسی زندگی اور معاشی و معاشرتی نتائج کی بڑی واضح تصویریں ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی زندگی میں ایک زبردست سیاسی اور معاشرتی انقلاب آیا' ملک تقسیم ہوگیا۔ کچھ عرصے تک لوگوں پر اضطرابی کیفیت طاری رہی اور انسان ایک ناقابلِ بیان بحران کا شکار رہا۔ ظاہر ہے ان حالات میں اکثر قلم کار کے قلم خاموش ہو گئے۔ اور وہ ایک عرصے تک کچھ نہ لکھ سکے۔

۲۔ چودھری محمد علی ردولوی کے معاصر افسانہ نگار:

چودھری محمد علی کے افسانوں پر تبصرہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کے عہد کے افسانہ نگاروں پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے تاکہ محمد علی کے افسانوں کی قدر و قیمت کا صحیح تعین کیا جا سکے۔ ان کے افسانوں کا تعلق اردو ادب کے پہلے دور سے ہے۔

افسانوں کی ابتداء ناول کے فنی ارتقاء کے زمانے میں ہوئی۔ ناول اور افسانے سے پہلے اردو ادب میں داستانوں کی صنف تھی۔ داستانوں کی رنگین اور دلکش روایات کے ساتھ افسانوں اور ناولوں نے پروان چڑھنا شروع کیا۔ داستانی روایات کے یہ نقوش ہمیں سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، پریم چند، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری وغیرہ کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ یلدرم کے افسانوں میں قدرت کے حسین و پر کیف مناظر کی رعنائیوں کو محبت اور رومانی جذبات کا پس منظر بنانے نیز حسنِ فطرت اور انسانی جذبات میں باہمی ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا رجحان داستانی فن کی ہی روایت ہے۔ پریم چند کے یہاں رومان پرور اور پر بہار فضا، کرداروں کا مزاج، ان کی سیرت اور جذبات، انداز گفتگو اور اس میں شاعرانہ اسلوب، حقائق کی فتح پر افسانہ کا انجام و اختتام داستانی رنگ کے عناصر ہیں۔

نیاز فتح پوری کے افسانوں میں موضوع کی ہیجان انگیز اور نشاط آفرین ترتیب و تشکیل اور کرداروں کے پر جوش رومانی عمل اور ردِ عمل کا اظہار دراصل داستان کے طرب انگیز اسلوب کا ہی غماز ہے۔ سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں ایک خاص اقدار کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو مطمئن کرنے کی کوشش داستان کی روایت کا پرتو ہے۔ تخیل کی پیدا کردہ رومانی دنیا کے تجربات و مشاہدات، حقیقی دنیا کی پیچیدگیاں اور زندگی کے نشیب و فراز داستان اور ناول میں کہانی کا پس منظر بنتے تھے۔ اور اس پس منظر میں پیش آنے والے واقعات مسائل کی کثرت، فطرت اور اس کے حسن کی رنگینی، کردار کی سیرت باہم پیوستہ ہوتے تھے۔ لیکن افسانہ کہانی میں وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا۔ اور کہانی میں وحدت کی اہمیت ہی نے افسانے کو داستان اور ناول سے جدا کیا۔

افسانہ کی دنیا قائم ہونے کے بعد مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، ل احمد اکبر آبادی، محشر عابدی، مسرور علی ذوقی، طالب باغپتی، کوثر چاند پوری، فضل حق قریشی، عظیم بیگ چغتائی، حیات اللہ انصاری، علی عابد حسینی وغیرہ نے افسانوں کو ترقی دی۔ زندگی کی حقیقتوں کا حامل بنایا اور فن کی رعنائیوں اور جدت طرازیوں سے سجایا۔ ان سب نے تخیل کے بجائے مشاہدے کو اور شعریت کی جگہ غور و فکر کو اہمیت دی۔ مذکورہ بالا تمام افسانہ نگار چودھری محمد علی کے معاصر تھے۔

۱۹۳۵ء سے افسانہ نے داستانی انداز کی سادگی اور رنگین فضا سے بلند ہو کر زندگی سے قرب پیدا کیا اور فنی ارتقا کی تکمیلی منزلیں طے کرنا شروع کیں۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے بھی اردو افسانے کو وہ قوتِ پرواز دی کہ یہ صنف دنیا کی بہترین افسانوی تخلیقات کی ہم سری کرنے کے قابل ہو گئی۔ مغربی اثرات اور دوسری زبانوں کے ترجموں سے بھی نئے نئے چراغ روشن ہوئے۔

۳۔ چودھری صاحب کے افسانوں کے اسلوب اور موضوعات:

چودھری محمد علی کی افسانہ نگاری کا دور دراصل اردو ادب کے ابتدائی زمانے کے افسانہ نگاروں کا عہد ہے۔ ان کے افسانے اس وقت منظر عام پر آئے جب افسانہ نگاری نے اردو ادب میں ایک مستقل صنف کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور یہ فن کافی ترقی کر چکا تھا۔ ہر قلم کار کی تصنیف اور تخلیقات پر اس کی افتادِ طبع اور فکر کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کی تخلیق اسکی اپنی طبیعت، رجحانات، خیالات، افکار و نظریات کا ہی پرتو ہوتی ہیں۔

چودھری صاحب کی ذات میں مغربی آزاد خیالی اور مشرقی وضعداری نہایت خوش اسلوبی سے جمع ہو گئی تھیں۔ ان کا تعلق اس دور سے تھا جب مغربی تہذیب کے اثرات مشرقی تہذیب و تمدن پر تیزی سے غالب آ رہے تھے۔ اور ان اثرات سے بچنا ناممکن سا نظر آ رہا تھا لیکن چودھری محمد علی ان لوگوں میں سے ایک تھے کہ جنہوں نے مغربی تہذیب اور اس کے خیالات و افکار کو صرف اس حد تک آنے دیا، جہاں تک ان کی تہذیب اور اپنے ادب کی عمدہ روایات پامال نہ ہوں۔

ایک فنکار جس ماحول میں سانس لیتا ہے اس کا اپنا ایک حلقہ ہوتا ہے اور اسی کے سہارے وہ اپنے فن کی تخلیق کرتا ہے۔ چونکہ چودھری محمد علی صوبہ اودھ کے ایک بہت ہی پیارے قصبہ ردولی کے رہنے والے تھے، جس کی اپنی ایک تاریخ ہے اور جس کا تفصیلی تذکرہ باب اول میں کیا جا چکا ہے۔ چودھری صاحب کے افسانوں میں اودھ کا قصباتی ماحول اور اس کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ انہوں نے انسان اور گرد و پیش کو خاص طور پر اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، جہاں انسان اپنی زندگی کے لمحات بسر کرتا ہے۔ ان کے اکثر افسانوں میں قصبات کی فضا پائی جاتی ہے، جہاں پر رہ کر انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا اور زندگی کو ہر زاویہ سے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ انہوں نے اپنے تصور کی باریک بینی کو اپنے اظہار کی توانائی کی مدد سے افسانوں کا روپ دیا۔ ان کے افسانوں میں نہ تو تصنع ہے اور نہ ہی اصلاح و تبلیغ، اور نہ انہیں پروپیگنڈے کے کسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ انکے افسانوں کا موضوع خاص اودھ کی قصباتی فضا اور اس کی روزمرہ کی وہ زندگی ہے جس ماحول میں انہوں نے اپنی زندگی کے تقریباً ستر برس گزارے ہیں۔ یہ ایک فطری تقاضہ تھا کہ وہ اپنے فنی کارناموں میں اس فضا کا عکس پیش کریں۔ ان کے بیشتر افسانے انسانی نفسیات اور خصوصاً جنسی پہلوؤں کے بیش بہا دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کی تصویر کشی بھی انہوں نے نہایت واضح انداز میں کی ہے۔ حقیقتاً وہ تصویر کشی کے لئے بھی زندگی کا وہی پہلو چنتے ہیں جس میں کوئی نفسیاتی خصوصیت پائی جاتی ہو۔

قرۃ العین حیدر ''داستان طراز'' کے عنوان سے ایک مضمون ''سوغات'' نمبر ۹ میں چودھری محمد علی ردولوی کے انداز تحریر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

''۔۔۔ ہمارا عوامی کلچر تھا جو ہم نے اپنے دیہاتوں اور اپنے قصبہ جات میں دیکھا تھا۔ اور جن کی بنیادیں انسانیت پرستی کی ان روایات پر رکھی گئی تھیں۔ اسی تہذیب اور ان اقدار کے ایک نام لیوا چودھری محمد علی ہیں۔۔۔ ضلع بارہ بنکی (اودھ) کے مشہور قصبہ ردولی کے رہنے والے ہیں۔ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ یہ بھی انیسویں صدی کے آخر والی اس نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔۔۔ محمد علی اس نئی نسل میں تنہا نہیں تھے۔ میرے والد اس کے ایک فرد تھے۔۔۔ پریم چند اور محمد علی دونوں کے یہاں پرانے ماحول اور پرانی اقدار سے جذباتی لگاؤ اور ذہنی وابستگی موجود ہے''۔[۱]

چودھری محمد علی ردولوی کی طرزِ تحریر پر صلاح الدین احمد نے ''ادبی دنیا'' میں ایک مضمون ''محمد علی ردولوی (ایک مطالعہ)'' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں وہ چودھری صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''۔۔۔ محمد علی اگرچہ اپنے افسانوں اور خاکوں کی بنیاد بیشتر محسوساتِ خارجی ہی پر رکھتے ہیں اور جو کچھ اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہی کچھ عین مین ہمیں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن اپنے موضوع کی طرف ان کی پیش قدمی خالصتاً داخلی اور نفسیاتی ہوتی ہے۔۔۔ محمد علی حقیقت پرستی اور خیال آفرینی کا ایک بے رحمانہ امتزاج پیش کرتا ہے۔۔۔ اس لئے اس کا پیش کردہ امتزاج فنی ادب میں ایک نہایت صحت مند معیار کا درجہ رکھتا ہے اور اس معیار پر بہت کم فن کاروں کی تخلیقات پوری اترتی ہیں''۔[۲]

دراصل اودھ کی معاشرت پر چودھری صاحب کا خاص مطالعہ رہا ہے۔ انہوں نے اپنے بہت سے افسانوں کے موضوعات اور کردار اسی معاشرے اور ماحول سے منتخب کئے ہیں۔ چودھری صاحب کے نواسے سید علی کاظم' چودھری محمد علی کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''چودھری صاحب کا اسلوب بیان نہایت پرکشش ہے جسے بڑے بڑے ادیبوں نے سراہا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں ان کی طبیعت کی شوخی جابجا جھلکتی نظر آتی ہے۔۔۔ ان کی تحریروں میں مصوری کے کمالات بھی ہیں اور تاروں کے کہکشاں کی خوبصورتی اور جھلملاہٹ بھی' ان کا اسلوبِ بیان ایک لہلہاتا ہوا گلشن ہے جو رنگ و بو سے دمک رہا ہے۔ چودھری صاحب افسانے نہیں لکھتے ہیں بلکہ قارئین سے بے تکلفی سے گفتگو فرماتے ہیں۔ انکی کہانیوں میں دوستانہ ماحول کی کارفرمائی ہے۔ کردار حقیقی ہیں' خیالی نہیں ہیں۔ واقعات اور مشاہدات کے خاکوں میں رنگ بھرنے اور ان کو دلچسپ انداز سے پیش کرنے میں چودھری صاحب کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ان کی تقریباً تمام کہانیاں کسی حقیقی واقعہ پر مبنی ہیں۔ ان کہانیوں میں گہرا نفسیاتی مطالعہ خاص طور سے نمایاں ہے۔۔۔ ان کے قصے کہانیوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک اعلیٰ ادیب کا

---

[۱] ''سوغات''، نمبر ۹۔ صفحات ۳۱۶ تا ۳۱۹ [۲] ''ادبی دنیا'' خاص نمبر صفحات ۱۴۳ تا ۱۴۴

طرز و امتیاز ہوا کرتی ہیں۔'' [۳]

جس انداز سے چودھری محمد علی کے نواسے نے انکے اسلوب پر تبصرہ کیا ہے اور ان کی تحریر کی جو خصوصیات بتائی ہیں وہ ایک بہترین ادیب کی خصوصیات پر مبنی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ چودھری صاحب نے جو کردار پیش کیے وہ حقیقی ہیں اور ان کرداروں سے جو کام لئے ہیں وہ بھی حقیقی زندگی کی عکاسی کر رہے ہیں۔ چودھری صاحب کو اپنے قلم پر عبور حاصل تھا وہ جو کچھ معاشرے میں دیکھتے تھے' محسوس کرتے تھے' اس کی ہو بہو تصویر الفاظ کے جامے میں قلم و روشنائی کے ذریعے کاغذ پر اتار دیتے تھے۔ انہیں انسانی نفسیات کا گہرہ شعور تھا۔ انہوں نے اس کے ایک ایک پہلو کی اپنی کہانیوں اور افسانوں میں بڑی باریک بینی سے عکاسی کی ہے۔ چودھری محمد علی اپنے دور کے ہی نہیں بلکہ موجودہ دور کے بھی بہترین ادیب ہیں چونکہ انکی تحریروں میں جدیدیت کی بو ہے اس لئے وہ ہر دور میں کامیاب رہیں گے۔

چودھری محمد علی کے اسلوب نگارش پر ماہنامہ فروغ اردو میں جو کہ جنوری ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا' سید احتشام حسین رضوی نے ''لکھنؤ کے موجودہ ادیب' چودھری محمد علی ردولوی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس میں وہ اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کر رہے ہیں:

''چودھری محمد علی کے افسانوں اور خاکوں میں جنسی نفسیات سے عالمانہ واقفیت اور غیر معمولی مشاہدے کا پتہ چلتا ہے۔۔۔۔ سستے جنسی ادب نے اس علمی موضوع کو اس قدر خراب کر دیا ہے کہ سنجیدگی سے اس پر قلم اٹھانا ایک نازک مسئلہ بن گیا ہے' لیکن چودھری محمد علی نے اپنے اندازِ بیان کی لطافت اور شگفتگی سے اس موضوع کو دلکش اور باوقار بنا دیا ہے۔۔۔۔ طرزِ تحریر کی یہ نادرہ کاری انہیں ایک منفرد ادیب بناتی ہے''۔ [۴]

سید احتشام حسین رضوی نے چودھری صاحب کے اسلوب پر جس انداز سے تبصرہ کیا ہے وہ سو فیصد درست ہے اس لئے کہ ان کی تحریر میں جگہ جگہ ادبی انداز جھلکتا ہے۔ جنسی موضوع جو کہ انتہائی نازک مسئلہ بن چکا تھا اس پر قلم اٹھانا اور اس موضوع کو دلکش و باوقار بنا دینا ایک سحر کار ادیب ہی کا کام ہے اور یہ سحر کار ادیب چودھری محمد علی ردولوی ہیں۔

۴۔ افسانوں کی زبان کا تجزیہ' قدرتِ بیان' محاورے کا استعمال:

چودھری محمد علی کے افسانوں کے مجموعے ''گناہ کا خوف'' جو کہ چودہ افسانوں پر مشتمل ۱۵۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مجموعے کے سن طباعت کا صحیح پتہ نہ چل سکا اور نہ ہی چودھری صاحب نے کہیں پر بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر ان کی

---

[۳] کشکول محمد علی شاہ فقیر' صفحات ق تا ر

[۴] ''ماہنامہ فروغ اردو'' لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۵۵ء' صفحہ ۲۷

تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ ۱۹۳۶ء کے آس پاس کا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے ''گناہ کا خوف'' کے دیباچے میں کچھ اس طرح لکھا ہے۔

''۔۔۔۔مجھ کو ستاون برس کچھ مہینوں کی عمر میں یہ دریافت ہوا ہے کہ خلوص اور یگانگی پیدا کرنے کی سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ دوسرے کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے اور اپنی نج کی زندگی کا حال بیان کرکے اس کے دل میں جگہ پیدا کرے''۵

چونکہ چودھری صاحب ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۵۷ برس کی عمر کے مطابق یہ مجموعہ ۱۹۳۹ء کے ہی آس پاس کا ہوسکتا ہے۔

مذکورہ بالا کتاب ''گناہ کا خوف'' کا پہلا افسانہ ''امیری کی بو'' بہترین کہانی ہے۔ اس کے بارے میں صلاح الدین اپنے تاثرات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کر رہے ہیں:

''یہ کہانی اس قابل ہے کہ اسے اردو کی پاکیزہ ترین کہانیوں میں ایک امتیازی مقام دیا جائے''۶

''امیری کی بو'' اودھ کی مٹتی ہوئی شرافت کا ایک دردناک مرثیہ ہے۔ چودھری صاحب نے اس افسانے میں ایک مخصوص تمہید لے کر اپنے موضوع کی وضاحت کی ہے تاکہ قاری کو کہانی سمجھنے میں پریشانی نہ ہو اور جب پڑھنے والا کہانی کو شروع کرے تو وہ افسانوی فن سے مسحور ہو کر اپنے پورے شعور کے ساتھ اس کے تاثر میں ڈوب سکے۔ چودھری محمد علی نے اس افسانے میں اس حقیقت کو پیش کرنا چاہا ہے کہ زوال پذیر دور میں بھی کچھ عرصے تک ایسے نشانات ملتے ہیں جن سے عروج ماضی کا اظہار ہوتا ہے۔

حمیدہ بانو بیگم کی زندگی ان کے والدین نے بے جا لاڈ و پیار میں برباد کردی ہے۔ جب وہ کنواری تھیں تو بڑی بڑی جگہوں سے پیام آتے تھے مگر ماں باپ نے ہر رشتے کو حقارت سے دیکھا اور حسب نسب کے لحاظ سے بھی کوئی رشتہ پسند نہ آیا۔ اور آخرکار ایک غریب گھرانے کے لڑکے سے حمیدہ بانو بیگم کی شادی اس شرط پر ہوئی کہ وہ ہمیشہ ماں باپ کی نظر کے سامنے رہیگی۔ لیکن ایک ذرا سی بات پر ناچاقی ہوگئی اور نتیجہ یہ نکلا کہ حمیدہ بانو بیگم کے شوہر اپنی سسرال سے خفا ہو کر چلے گئے۔ اس کے بعد کہانی ایک دوسری کروٹ لیتی ہے۔ حمیدہ بانو کے والدین کا انتقال ہو جاتا ہے اور اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ دانے دانے کی محتاج ہو جاتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ مکان چھوڑنا پڑتا ہے بلکہ سب اثاثہ بھی چھن جاتا ہے اور نوکر چاکر بھی نظریں پھیر لیتے ہیں۔ غربت کی زندگی کو چھپانے کے لئے وہ اپنی خاندانی عظمت اور روایات کا اظہار کس طرح کرتی ہیں

---

۵ ''گناہ کا خوف'' 'کشکول' صفحہ ۳۰۳

۶ ''ادبی دنیا'' خاص نمبر صفحہ ۱۴۹

اسے چودھری محمد علی نے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔

''۔۔۔۔حمیدہ بانو بیگم صاحبہ سے نہ صرف مکان چھوٹا نہ فقط اثاثہ چھن گیا' نہ یہ کہ نوکر چاکر بھی چلتے پھرتے نظر آئے' بلکہ رفتہ رفتہ سلائی پر بسر ہونے لگی'' ۷

افسانہ نگار نے حمیدہ بانو بیگم کی زندگی کے اس تضاد کو پیش کیا ہے جس میں غربت کے باوجود وہ اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔عیش و آرام سے پرورش پانے والی ایک رئیس زادی کی غربت کی داستان سنانے کے بعد افسانہ نگار حمیدہ بانو بیگم کے کردار کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں جس کا تعلق اس کی خاندانی عظمت و روایات سے تھا۔لکھتے ہیں کہ:

''۔۔۔۔خیرات کے کھانے سے بھی حمیدہ بانو بیگم صاحبہ جب تک کسی غریب کو دے نہ لیتی تھیں خود نہ کھا سکتی تھیں۔یہی وجہ تھی کہ باوجود غریبی کی فلاکت کے ارد گرد کی غریب عورتیں ان کی گزشتہ ثروت کو بھولی نہیں تھیں۔۔۔۔برادری کی خوش حال عورتوں پر بھی ان کا رعب تھا اور کسی کی جرائت نہیں ہوتی تھی کہ ان کو کم نگاہی سے دیکھے۔۔۔۔اور برادری میں جو جگہ ان کی ہمیشہ سے تھی وہ آج بھی باقی تھی۔چاہے گھر میں فاقہ ہو۔۔۔۔مگر عزیزانہ برتاؤ میں کبھی فرق نہیں آنے دیتی تھیں۔شادی بیاہ میں نیوتہ ڈالی ان کے گھر سے دوسروں سے پہلے پہنچتی تھی۔چھٹی میں بچے کے کپڑے ان کے گھر سے ایسے آتے تھے کہ ہر عورت کی نگاہ ان پر پڑتی تھی۔نئی نویلی دولہن کو دودھ ملیدہ سب سے پہلے بھیجتی تھیں۔اور ان سب باتوں کے بعد ایک ایثار ایسا تھا جو ہر شخص میں نہیں ہوتا۔یعنی برادری میں کسی کے یہاں کوئی تقریب ہو تو تمام کام یہ اپنے ذمہ لے لیتی تھیں۔۔۔۔غمی کے موقع پر۔۔۔۔بین ایسے کرتی تھیں کہ بڑے سے بڑا غم نویس شاعر دنگ رہ جائے۔۔۔۔ہمیشہ باپ کے بین کرتی تھیں۔۔۔۔''لکھیا بابا فقیرن بیٹی تمہاری راہ پر سے صدقے ہوتی''۔۔۔۔آواز کی نرمی' الفاظ کی مناسبت' کم سن منہ چھڑانے والیوں کا یہ حال ہوتا تھا کہ آنسوؤں سے خود منہ دھوتی تھیں۔۔۔۔ہر شخص سے صاف دل سے ملتی تھیں لیکن اسی کے ساتھ کسی نئی دولت والی نے اگر ان کے حفظ مراتب میں ذرا سی بھی کمی کی تو اللہ دے اور بندہ لے۔بھری محفل میں وہ کھری کھری سناتی تھیں۔۔۔۔سات پشتوں کا شجرہ بیان کر دیتی تھیں'' ۸

اب آگے اس کہانی میں چودھری صاحب قصبات کے رسم و رواج کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''۔۔۔۔قصبات میں ابھی تک خدمتی قومیں مثل نائی' دھوبی' درزی وغیرہ کے جو پشتوں سے خاندان میں لگے چلے آتے ہیں۔۔۔۔شادی یا دوسری خوشی کے موقوں پر جوڑے باگے' نقد وجنس پانا اپنا حق سمجھتے ہیں' اور لڑ کر لیتے ہیں۔ایسے موقعوں پر ان کا دعویٰ مسکرا کر تسلیم کیا جاتا ہے۔۔۔۔سینکڑوں برس کی مشق سے کچھ ایسا انتظام بن گیا ہے کہ ''پرجوں'' اور

---

۷ ''گناہ کا خوف'' ' کشکول' صفحہ ۳۱۶

۸ ایضاً ' صفحات ۳۱۸ تا ۳۲۰

''جھمانوں'' کے درمیان میں حقوق اور فرائض میں کبھی اختلاف ہوتے دیکھا نہیں۔ ایک روز۔۔۔۔حمیدہ بانو بیگم صاحبہ نے۔۔۔۔نائن کو بلوا بھیجا وہ آئی تو مگر دیر میں۔حمیدہ بیگم صاحبہ کے غصے کا پارہ پانی ابلنے کا درجہ طے کر چکا تھا۔صورت دیکھتے ہی برس پڑیں''۹

نائن کے دیر سے پہنچنے پر حمیدہ بانو بیگم اور نائن کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے وہ بھی ایک معرکہ کی چیز ہے۔اس مکالمہ سے ان دونوں کی خاندانی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔اس گفتگو میں چودھری صاحب نے روز مرہ اور محاوروں کا استعمال بھی خوب کیا ہے۔ نائن کے چلے جانے کے بعد وہ اپنی بیٹی سے جو گفتگو کرتی ہیں اس سے انکے خاندانی وقار اور روایات کا پتہ چلتا ہے۔ نائن اور حمیدہ بانو بیگم کے مابین جو مکالمات ہوتے ہیں وہ کچھ یوں ہیں:

''۔۔۔۔صورت دیکھتے ہی برس پڑیں۔خدا کی شان اب پر جوں کے بھی یہ دماغ ہو گیا کہ بلاؤ تو آتے نہیں۔ موئی چڑیلوں کے جہاں ہاتھ گلے میں دو چیزیں ہو گئیں بس اپنے آپے سے باہر ہو گئیں۔۔۔۔نائن: میری مجال پڑی ہے کہ آپ بلا دیں اور میں نہ آؤں۔آپ کے گھر سے یہ ہڈیاں پلی ہیں۔۔۔۔آپ کے دشمن غریب ہوں۔آج بھی آپ ہی کے یہاں سے پیٹ پلتا ہے۔تن ڈھکتا ہے۔ دیر اس وجہ سے ہوگئی کہ دوپٹہ چیتھڑا ہو گیا تھا۔۔۔۔ میں نے کہا لاؤ جلدی جلدی سی لوں تو نکلوں۔۔۔۔دیکھئے نا اتنا گانٹھا ہے کہ پتلا ہو گیا ہے۔۔۔۔ موا جو سر ڈھانکو تو کمر کھلتی ہے۔کمر ڈھانکو تو سر ننگا ہو جاتا ہے۔حمیدہ بیگم: تو یہ کہو نا'لو دوپٹہ ہم دیتے ہیں۔بیٹی سعیدہ اپنا دوپٹہ ہم کو دو اور تم کامدانی والا دوپٹہ نکال کر اوڑھ لو۔سفید دوپٹہ تم پر اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔تم نہ دو گی تو ان غریبوں کو کہاں سے ملے گا۔لو ابھی یہ دوپٹہ دیتی ہوں۔ابھی ایک ہی دھوب پڑا ہے۔۔۔۔نائن ادھر نکلی ادھر بیٹی نے کہا۔اماں دوپٹہ آپ نے دے دیا۔کامدانی کا دوپٹہ اوڑھ لیں گے تو پوت کے پیجامے پر کیا اوڑھیں گے۔۔۔۔ماں: ہوگا صدقہ کیا۔کون چیز ہے خدا دے گا بیٹی۔۔۔۔بٹیا تم نے دیکھا ہی کیا ہے ایسے ایسے دوپٹہ تو ہم دے دیا کرتے تھے۔خیر ہوگا وہ بھی زمانہ تھا یہ بھی زمانہ ہے۔مگر کیا ہمارے دن پھریں ہی گے نہیں۔بارہ برس کے بعد تو گھورے کے دن پھرتے ہیں۔اور دے نہ دیتی تو کرتی کیا۔دیکھتی نہیں تھیں۔بچاری ننگی تھی۔نہ تمہاری نوکر۔نہ چاکر مگر ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔بٹیا سن لو یہ ہی دنیا سے ساتھ جائے گا اور کچھ نہیں''۱۰

اس کے بعد یہ افسانہ اپنے نقطہ عروج پر پہنچتا ہے۔ چودھری صاحب حمیدہ بانو بیگم کی غربت و افلاس اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے صبر و تحمل' قناعت اور اعلیٰ ظرفی کا ذکر کرتے ہیں۔ایک ڈومنی کی لڑکی شبو جس کی عمر تقریباً پانچ چھ سال ہوگی' اس کی خاندانی خصوصیات' باتیں بنا کر' تعریف و خوشامد کر کے اور انسانی نفسیات کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنا مطلب

۹۔''گناہ کا خوف''،کشکول'صفحات ۴۲۰ تا ۴۲۱ ۱۰۔ ایضاً'صفحات ۴۲۱ تا ۴۲۳

نکالنے کا ذکر ہے۔ان تمام واقعات کی منظر کشی کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

''۔۔۔۔صبح کا وقت ہے۔۔۔۔ گھر میں اتنا پیسہ نہیں جو چائے بنے۔اسی وجہ سے باہر کا دروازہ ابھی نہیں کھلا ہے کہ چائے کا وقت نکل جائے۔۔۔۔ پاس پڑوس سے کوئی آ ہی جائے تو کیا کہے گا کہ ان کے یہاں آج چائے نہیں بنی۔۔۔۔سعیدہ اٹھیں اور آگ جلائی دیگچی میں پانی چڑھا دیا۔آٹا گوندھا۔اتنے میں کوٹھری سے ایک ہانڈی ہاتھ میں لئے ماں کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔۔۔۔اے لیجئے امی جان دال بھی تو نہیں ہے۔۔۔۔اوہو گا چٹنی سے کھالیں گے۔تم نے دھنیا بوئی تھی دیکھو کیسی ہری ہری لگی ہے۔۔۔اتنے میں ایک بچے کی آواز آئی۔اے اللہ ذری دروازہ کھول دیجئے۔۔۔۔ ایک لڑکی پانچ چھ برس کی کرتہ پائجامہ پہنے۔۔۔۔داخل ہوئی اور بہت جھک کر سلام کر کے۔۔۔۔بیٹھ گئی۔۔۔۔اتنے میں شبو چھوٹی بیگم کی طرف باورچی خانہ میں چلیں' پاس ہی دھنیا کی کیاری تھی۔اسی کے کنارے ایک مکو کا درخت اگا تھا۔لال لال مکو سے کھنگنا بنا تھا۔مکو توڑ توڑ کر کھانے لگیں' جب صاف کر چکیں تو دھنیا کی طرف مخاطب ہوئیں۔نہایت یکسوئی سے توڑ توڑ کر مٹھی میں اور مٹھی سے لے کر کرتے میں جمع کرتی چلی گئیں۔حمیدہ بیگم صاحبہ تاسف کی مسکراہٹ سے' اور سعیدہ غصہ کی نگاہ سے دیکھا کیں۔مگر منہ سے کوئی نہ بولا۔۔۔۔بی شبو دھنیا کھسوٹ چکیں تو بولیں۔

چھوٹی بیگم آپ کے سائے میں پروان چڑھیں۔پھلیں پھولیں آباد ہوں' ہم تو اس گھر کے ہمیشہ نمک خوار ہیں۔ آج پہلے پہل فصل میں دھنیا کی چٹنی آپ کے صدقے میں کھائیں گے۔اور اپنے گھر چلی گئی۔

سعیدہ نے روکھی روٹی لا کر ماں کے سامنے رکھ دی۔بیگم صاحبہ نے ہنس کر کہا۔شبو ہے پکی ڈومنی' بچہ ہے تو کیا ہوا۔ بیٹی ذری نمک ہی پیس لو'' [۱۱] شبو کی حرکت اور صبر و تحمل کی پیکر' خاندانی رکھ رکھاؤ اور اس کی عظمتوں کا بھرم رکھنے والی حمیدہ بانو بیگم اور ان کی بیٹی سعیدہ کے دردناک مکالمات کے بعد یہ کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

اس افسانے میں چودھری صاحب نے اودھ کی معاشرت جو کہ ان کا موضوع خاص ہے اسے پیش کیا ہے اور خاص طور سے قصباتی ماحول' وہاں کے امراء و روسا اور عام لوگوں کا رہن سہن کا انداز۔دونوں طبقوں کے لوگوں میں ایک خاص قسم کی دوری اور اقتدار چلے جانے کے باوجود سفید پوشی و وضع داری کا بھرم۔یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔اس میں کچھ کردار ایسے بھی ہیں جو اسی نسل کے ساتھ ختم ہو گئے۔بحیثیت مجموعی اس افسانے کی زبان اور انداز بیان روزمرہ کی عام بول چال کی زبان ہے پوربی زبان کے اثرات ہیں مگر لہجہ پوربی نہیں ہے کرداروں میں آپس میں جو گفتگو ہوتی ہے وہ لکھنؤ کی پکی [۱۲]

---

[۱۱] ''کنا دکا خوف'' 'کشکول' صفحات ۴۲۳ تا ۴۲۶

[۱۲] اردو دلی میں بولی جانے والی پوربی زبان کچی بولی اور لکھنؤ کی شستہ زبان پکی بولی کہلاتی تھی۔

بولی میں ہوتی ہے جبکہ زیادہ تر کردار قصباتی ہیں اور پوربی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔

چودھری صاحب کا یہ افسانہ جو ''امیری کی بو'' کے عنوان سے ہے پوری کہانی سچی اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں یہی انداز تھا امیر لوگوں کا جب زمین داری چلی گئی تھی سب کچھ چھن گیا تھا مگر انکی وضعداری باقی رہی تھی۔ وہ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے ہر تکلیف برداشت کر لیتے تھے مگر اپنے خاندانی وقار پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔ گھر میں کھانے کو چاہے کچھ بھی نہ ہو مگر جب کھانا پکتا تھا تو باورچی ہی پکاتا تھا۔ اسی طرح گھر میں اناج نہیں ہے تو بھی چولہا جلا دیا جاتا تھا اور دیگچی میں صرف پانی ہی بھر دیتے تھے تاکہ باہر سے آنے والے کو یہ نہ پتہ چل سکے کہ فلاں کے گھر کھانا نہیں پکایا جائے نہیں بنی۔ یہ وضعداری تو درمیانی طبقے میں بہت زیادہ تھی۔ اور آج بھی اردو دلی میں ایسے گھرانے ہیں جہاں یہ رسمیں نبھائی جاتی ہیں۔

چودھری محمد علی نے ایک ایسے مقام پر پہنچ کر افسانے لکھنا شروع کئے جہاں وہ اپنے اندر خاصہ علمی شعور پیدا کر چکے تھے' تجربات اور مشاہدات نے ان کی فکر میں غیر معمولی پختگی پیدا کر دی تھی۔ زبان و بیان پر انہوں نے خاصہ عبور حاصل کر لیا تھا۔ وہ ہر طرح کی کیفیت اور صورتحال کو بیان کرنے میں مہارت رکھتے تھے' انہوں نے زبان اور الفاظ کی نسبت میں بھی ایک انفرادی بلکہ خودسرانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ انہیں بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اپنے قلم کی پختگی کا احساس تھا اسی لئے صلاح الدین احمد نے انہیں ''اردو کا اولین فطرت نگار'' کہا ہے۔

چودھری صاحب اپنے افسانوں میں نفسیاتِ انسانی کے بعض نازک ترین پہلوؤں کو بھی بے نقاب کر جاتے ہیں۔ جبکہ بنیادی طور پر وہ فلسفی نہیں بلکہ خالص افسانہ نگار ہیں۔ وہ کسی مقصد یا نظریہ کی تبلیغ کے لئے ہمیں کہانی نہیں سناتے بلکہ اپنے کسی تخیل پارے کو پھیلا کر افسانے کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک خالص آرٹسٹ ہیں۔ جب تک ادب میں خالص فن کی قدریں باقی ہیں ایسے ہی فن پاروں کو عظمت و عزت کے وہ مقامات حاصل رہیں گے جو فطری طور پر ان کا حق ہیں۔ چودھری محمد علی کے اکثر افسانوں میں اودھ کے قصبات کی فضا پائی جاتی ہے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت گزارا۔ ان افسانوں میں سے ''امیری کی بو'' کے علاوہ چند اور کے نام یہ ہیں: ''گھر کی صحبتیں اور کلب'' ''نیک کام'' ''دوا'' وغیرہ۔

چونکہ چودھری صاحب نفسیاتِ انسانی کا گہرا علم رکھتے تھے اور فطرتِ انسانی کی جزئیات تک کا انہیں شعور تھا۔ انسانی احساسات اور ان کی پیچیدگیوں کی تصویر کشی کرنا ان کا مرغوب مشغلہ تھا۔ ان کے افسانوں ''آنکھوں کی زبان''۔ ''دھوکا''۔ ''تیسری جنس''۔ ''میزوکزم'' اور ''مس ہیلن'' میں پائی جانے والی کنواری مس ہیلن' گنجیفہ کھیلنے والی رنڈی اور مچھلی والی سے روزآنہ مار کھانے والے انسپکٹر صاحب بڑے مضبوط کردار ہیں۔ یہ جنسی نفسیات کے انتہائی نادر نمونے ہیں جو براہِ راست انسانی زندگی سے لئے گئے ہیں۔ ان میں کوئی خیالی رنگ نہیں پایا جاتا۔ اور نہ کسی قسم کی لذت آفرینی کی کوشش کی

گئی ہے۔ ''مرزا منش''۔ ''میٹھا معشوق''۔ ''زندگی کا مقصد''۔ ''خوش مذاقی کے اندھے'' یہ نادرِ روزگار کرداروں پر مبنی کہانیاں ہیں۔ چودھری محمد علی نے کسی اصلاحی خیال سے یہ افسانے نہیں لکھے بلکہ اپنی روز مرہ زندگی میں ایک مٹتی ہوئی معاشرت کے جونمونے ان کے سامنے آئے اسے انہوں نے ادب کے عجائب گھر میں مقید کر دیا۔

''نیلم کا نگ'' اور ''گناہ کا خوف'' چودھری محمد علی ردولوی کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان افسانوں کو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ''گناہ کا خوف'' بقول صلاح الدین ''سماج کی ظواہر پرستی پر ایک لازوال طنز ہے'' یہ کہانی حقیقی رنگ کے پسِ منظر پر ابھری ہے۔ اس کہانی کا خاص کردار عبدالمغنی ہے' جو بہت چالاک' مقدمہ بازی کے فن میں ماہر اور جال بننے میں یکتائے روزگار ہے۔ اس کردار میں جہاں پر بھی خیر کا پہلو نظر آتا ہے وہ ظاہر پرستی پر مبنی ہے۔

''نیلم کا نگ'' دراصل ''مسیح کے اس قول کی بازگشت ہے کہ میں انسان سے مایوس نہیں ہوں''۔ اس میں حسنو کی بیوی کا کردار ان نفسیاتی حقائق کو پیش کرتا ہے جس سے وہ گذر رہی تھی۔ حسنو کی بیوی کا تعلق ایک فقیر گھرانے سے ہے۔ چودھری صاحب نے شروع میں اس کا ماحول بہت گندہ' مکروہ اور پست دکھایا ہے اور اسی وجہ سے وہ گندے روپ میں سامنے آتی ہے۔ مگر جب پے در پے اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹتا ہے اور وہ حادثات کا شکار ہوتی چلی جاتی ہے تو پھر وہ اپنے برے کاموں سے توبہ کر کے اچھائی کی طرف راغب ہوتی ہے۔ اس کی زندگی یکسر بدل جاتی ہے۔ اسے پاکیزہ ماحول مل جاتا ہے۔ ایک اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ اس کی زندگی کا محور بن جاتا ہے۔ دونوں افسانوں کے کردار حقیقی زندگی کے پسِ منظر پر ابھرے اور اپنے اندر خوشی اور تفکر کے بے شمار نادر نمونے لئے ہوئے ہیں۔

چودھری محمد علی نے ''امامن مہری'' کی زبان سے روزمرہ کے مسائل پر پانچ انشائیے ایسے بھی لکھے ہیں جنہیں اردو کی انشائے لطیف میں شمار کیا جاتا ہے۔ ''امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات'' پانچ عنوانات پر مشتمل ہیں: ''ایمان داری بہترین دور اندیشی ہے''۔ ''رکھ رکھاؤ''۔ ''تیہا' طنطنہ' جوشا' غصہ' جذبہ''۔ ''کام کاج'' اور ''خیر خیرات''۔ چودھری صاحب زندگی کو ایک ہی وقت میں داخلی اور خارجی دونوں نقطہ ہائے نظر سے پرکھتے ہیں۔ وہ اپنی خارجی محسوسات کو اپنے خیالات کا جامہ اس چابکدستی سے پہنا دیتے ہیں کہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ یہ لباس اسی کردار کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

چودھری محمد علی نے زبان اور الفاظ کی نسبت بھی ایک انفرادی رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ ایک خاص قسم کی ذہنی سوچ کو وہی الفاظ دینے کی کوشش کرتے ہیں جو ان پر وارد ہوئے۔ انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ ادب میں رواج پائیں گے یا نہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ادبی زبان میں مقامی یعنی پوربی زبان کی پیوندکاری کی ہے' گویا:

بقول انور سدید:۔ ''ادبی زبان سے انہوں نے حسنِ تعمیر کا اور مقامی زبان سے اظہار صداقت کا ثبوت دیا ہے'' ۱۳

۵۔ اردو کے افسانوی ادب میں چودھری صاحب کی قدر و قیمت کا تعین:

جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ چودھری محمد علی ردولوی نے افسانے وغیرہ لکھنے کا سلسلہ اپنے عہد شباب کے ختم ہونے کے بعد شروع کیا۔ اس لئے ان کی تحریر میں تجربات و مشاہدات' اظہارِ حقیقت' مختلف علوم کے حصول کے بعد پیدا ہونے والی بالیدگی اور پختہ عمر پر پہنچ جانے والا ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔ ایک ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم النفس سے واقف ہو۔ اور جو ادیب جتنا زیادہ اس علم سے واقف ہوتا ہے اتنی ہی عمدہ وہ حیاتِ انسانی کی تصویر کشی کر سکتا ہے۔ چونکہ چودھری محمد علی کو علم النفس کے موضوع سے خاصی دلچسپی تھی اس لئے اس کا اظہار ان کے افسانوں اور دیگر تحریروں میں بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کردار نگاری میں نہایت سمجھداری سے کام لیتے ہیں۔ وہ نفسیات کے ایک بہت بڑے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ جنسیاتی مسائل کی نہایت ہی اعلیٰ تشریح کرنے والے بھی ہیں۔ وہ جنسیات سے کسی قسم کی حقارت اور نفرت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ بہت ہی اطمینان سے اپنے افسانوں میں اس کی معمولی اور غیر معمولی' نارمل اور ایب نارمل کیفیتوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات کے انتخاب میں جنس عادتاً ایک اہم حصہ لیتی ہے۔ اور جب وہ اپنے کسی مطالعے پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد لذت کوشی نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی مسئلہ کا مکمل جائزہ لینے کے بعد روز مرہ زندگی میں رونما ہونے والے جنسی عوامل کو وہی مقام دینا ہوتا ہے جن کے وہ صحیح طور پر حق دار ہوں۔ اردو زبان میں بے عیب جنسی افسانے و کہانیاں لکھنے میں چودھری صاحب کا ہم پلہ کوئی دوسرا ادیب مشکل سے ہی ملے گا۔

چودھری محمد علی کی جنسی موضوعات سے اس حد تک واقفیت تھی کہ انہوں نے اس کی پرت در پرت حقیقتوں اور دل کی چوریوں کو بھی حیرت انگیز طور پر بیان کیا ہے۔ اس کی عمدہ مثال ان کا افسانہ ''دھوکہ'' ہے۔ چودھری محمد علی اپنے کرداروں کی تصویر کشی کے لئے زندگی کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جن میں کوئی نفسیاتی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ان کی یہ صلاحیت ''نیلم کا نگ''۔ ''گناہ کا خوف''۔ ''امیری کی بو'' نامی افسانوں میں نظر آتی ہے۔ ان افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے چودھری صاحب نے نفسیاتِ انسانی یا جنس کے متعلق کسی حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے ہی قلم اٹھایا ہے۔

انسویں اور بیسویں صدی کے سنگم پر ہماری اردو زبان میں کچھ ایسے باکمال لوگ نمودار ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی صلاحیتوں سے اردو کی حدود کو وسعت دی اور لوگوں کو پہلی بار نہ صرف بہترین نثر سے لطف اندوز ہونے اور فائدہ اٹھانے کا موقع دیا بلکہ ادب کی لازوال خدمات انجام دیں۔ ان میں سے ایک نام چودھری محمد علی کا بھی ہے۔ وہ حقیقت پرستی اور خیال

۱۳؎ اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش

آفرینی کا امتزاج پیش کرتے ہیں۔ اپنے مشاہدے اور صداقت سے کبھی آنکھیں نہیں چراتے اور اپنے بیان میں تخیل کی گرفت مضبوط رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا پیش کردہ امتزاج فنی ادب میں اعلیٰ معیار کا درجہ رکھتا ہے۔ اور یہ مقام بہت کم قلم کاروں کو میسر ہوا ہے۔

بقول قرۃ العین حیدر:۔ ''محمد علی ردولوی کی قدر ہمیں بحیثیت فنکار اس وقت کرنی پڑتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہایت ایمانداری سے انسانیت پرستی کی اقدار کو سنبھالے اور اونچا اٹھائے رکھتے ہیں۔۔۔۔ محمد علی کنتی کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن کو نئے لکھنے والے بھی اپنا رفیق سمجھتے ہیں اور جنہوں نے غیر مشروط طریقے سے ادب کی نئی تحریک کا شروع سے ساتھ دیا ہے۔ اردو افسانے میں جو طرزِ بیان' برجستگی' شوخی اور بانکپن' محمد علی اپنے ساتھ لائے۔۔۔۔ وہ اتنا انوکھا اور منفرد ہے کہ کوشش کر کے بھی اس کی طرح کی دو سطریں نہیں لکھی جا سکتیں۔ اندازِ بیان اتنا فطری ہے کہ جب دفعتاً یہ احساس ہوتا ہے کہ قصہ گو یہ واقعہ اپنے مخصوص انداز میں خود اپنی زبان سے نہیں سنا رہا تھا بلکہ یہ لکھی ہوئی تحریر ہے' تو عجیب سا لگتا ہے۔۔۔۔ چودھری محمد علی کے یہاں قصے اور ان کے کردار خیالی یا فرضی نہیں ہیں۔ مولوی ابراہیم' راجہ پرتھی پال سنگھ' بی بی ناجو' بھمن تنبولی' امامن مہری' میر یوسف' حسو کی بی بی' یہ سب اصلی' سچ مچ کے لوگ ہیں۔ داستان طراز نے واقفیت کا رنگ قائم رکھنے کے لئے ان کے نام بھی نہیں بدلے۔۔۔۔ ان میں سے اکثر کا تذکرہ خود بھی گھر کے لوگوں سے سن چکی ہوں۔ لیکن ان کو قصے کے پیرائے میں پیش کرنا محمد علی کا کمال ہے۔ یہ ہماری رچی ہوئی عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان کی کمزوریاں' ان کی نیکیاں' ان کی معصومیت' اس بہتی ہوئی دنیا میں یہ حکایتیں' لگتا ہے جیسے کسی اور سیارے کے قصے ہیں۔ وہ سیارہ جو کہیں کھو گیا ہے۔ یہ حکایتیں جزئیات نگاری کا شاہکار ہیں''۔[۱۴]

قرۃ العین حیدر نے جس انداز سے چودھری محمد علی ردولوی کی طرزِ تحریر پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے' وہ اپنی جگہ پر بہت اہمیت کا حامل ہے۔ چودھری صاحب واقعی اس خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ اردو کے افسانوی ادب میں ان کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ گو کہ داستانوی رنگ جگہ جگہ جھلکتا ہے مگر یہ ان کا قصور نہیں بلکہ ان کے دور میں کچھ اسی قسم کی تحریریں ہوا کرتی تھیں۔ اور بھلا ایک قلم کار پر اس کے دور کا اثر کیسے نہ ہوگا؟

چودھری محمد علی کے بعض افسانے جیسے نیک کام' عمدہ کتاب' اندر سبھا کی امانت وغیرہ میں اودھ کی تہذیب کی ان اقدار اور وضعداریوں کا بھی ذکر ہے جو زمانے کے تغیر سے مٹتی جا رہی ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایسے کردار ملتے ہیں جو دوست نوازی' وضعداری' افلاس' بے نیازی اور استغنا وغیرہ جیسی خصوصیات کے آخری چراغ محسوس ہوتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ کسی روز یہ چلتے پھرتے مجسمے سایوں میں بدل جائیں گے۔ مرزا منش' میٹھا معشوق' خوش مذاقی کے اندھے' زندگی کا مقصد

---

[۱۴] سوغات (نمبر ۹) صفحات ۳۱۹ تا ۳۲۲

ان ہی نادر روزگار لوگوں کی مرقع نگاری ہے۔ چودھری صاحب نے یہ افسانے کسی خاص مقصد کے تحت نہیں لکھے بلکہ اپنی روز مرہ زندگی میں ایک مٹتی ہوئی معاشرت کے نمونے اردو کے افسانوی ادب میں آنے والی نئی نسل کے لئے محفوظ کر دیئے ہیں۔ اب یہ ان نسلوں پر منحصر ہے کہ وہ ان پر آنسو بہائیں گی اور عبرت یا تفریح حاصل کریں گی۔

بقول صلاح الدین احمد: ''۔۔۔۔ چودھری محمد علی کا سا پیرایہ بیان ہمارے عہد کے کسی افسانہ نگار کو نصیب نہیں ہوا۔ حقیقت پروری اس پر نثار' دل نوازی اس پر تصدق ہے۔ اور ان کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس کے لئے انہیں کوئی اہتمام یا تکلف نہیں کرنا پڑتا۔ فطرت ایک درق روشن کی طرح ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ اور اس کے جو اسرار ان کی نگاہِ انتخاب میں سما جاتے ہیں' وہ انہیں بے محابا اپنا لیتے ہیں۔ محمد علی کسی موضوع کو سامنے رکھ کر اس کی تعمیر کے لئے اپنے تخیل سے مسالہ نہیں مانگتا۔ بلکہ زندگی اپنی بوقلموں کیفیتوں کو لئے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے۔ اور فنکار جب کبھی اس کا جی چاہتا ہے اور جو کچھ اس کا جی چاہتا ہے اس کے دامنِ دولت سے مٹھیاں بھر بھر کر لے لیتا ہے۔ تو یہ ہے محمد علی زندگی کا ایک زیرک ناظر' اردو کا ایک صاحبِ طرز ادیب' اور ہماری زبان کا اولین فطرت نگار'' [۱۵]

جس انداز سے صلاح الدین احمد نے چودھری محمد علی کی طرز تحریر کی تعریف کی وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ ان کے ایک ایک لفظ میں صداقت کی جھلک نظر آتی ہے۔ چودھری محمد علی ردولوی کو اردو کے افسانوی ادب میں وہی مقام ملنا چاہئے جو پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم یا سلطان حیدر جوش کو ملا تھا۔ ان میں ہر ایک اپنے لحاظ سے اس فن میں یکتا ہے۔ اور داستانوی جھلک کسی نہ کسی انداز سے ہر ایک کے یہاں نظر آتی ہے۔

بحیثیت مجموعی چودھری محمد علی ردولوی اردو کے افسانوی ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انکی طرز تحریر کو بڑے بڑے نقادوں نے سراہا ہے۔ نقص تو ہر تحریر میں ہوتا ہے مگر دیکھنا یہ چاہئے کہ معیار کے لحاظ سے تحریر کتنی اہمیت کی حامل ہے۔ چودھری صاحب کے افسانے معیاری ہیں' چونکہ وہ قصبہ ردولی میں رہے ہیں اس لئے قصے کا سارا مواد ردولی کے گرد گھومتا ہے اور زیادہ تر ان کے افسانوں میں صرف ردولی اور گرد و پیش کا ماحول نظر آتا ہے۔ وہاں کے غریب و امیر' ہندو مسلم' اونچی نیچی ذات کے افراد' فقیر' مولوی' ملا' سادھو' پنڈت' پنواری' زمیندار' ہروا ہے' تنبولی' کنجڑے' قصائی' حکیم' ڈاکٹر' انسپکٹر' نائی' دھوبی' بھنگی' جولاہے' رنگریز' باورچی' بہشتی' میراثی' مہری' طوائف وغیرہ کو اپنے کرداروں کا موضوع بنایا ہے اور انکی زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انکے یہ کردار دراصل حقیقی زندگی کے چلتے پھرتے کردار ہیں۔ ایسے لوگ' ان کے رسم و رواج اور ان کا رہن سہن آج بھی ردولی کے چند خاندانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۵۔ ''سوغات'' (نمبر ۹) صفحہ ۳۱۳

باب پنجم

چودھری محمد علی ردولوی بحیثیت انشائیہ نگار

۱۔ انشائیہ کی تعریف:

کسی بھی صنفِ ادب کی تعریف کا تعین کرنے کی دو اہم وجوہات ہوتی ہیں۔ نمبر۱: اس صنف کے بڑے بڑے اصحابِ قلم کی تخلیقات اور نمبر۲: متعلقہ نقادانِ فن کی آراء۔ انشائیہ کے خدوخال واضح کرنے کے لئے انشائیہ نگاروں اور اس صنفِ ادب کے نقادوں کی آراء کا مختصر جائزہ پیش کرنا اشد ضروری ہوگا۔ انشائیہ کی تعریف مختلف لوگوں نے بڑے متفرق انداز سے کی ہے۔ انشائیہ کی تعریف سے قبل ہمیں اس کی اصل کا پتہ لگانا چاہئے۔ انشاء عربی کا لفظ ہے' اس کے مختلف معنی نکلتے ہیں۔ نمبر۱: کچھ بات دل سے پیدا کرنا۔ نمبر۲: عبارت کا تجزیہ۔ نمبر۳: علم' معنی' بیان' صنائع و بدائع' خوبی عبارت' طرزِ تحریر وغیرہ۔ نمبر۴: وہ کتاب جس میں خط و کتابت سکھانے کی غرض سے ہر قسم کے خطوط جمع ہوں۔ لفظ انشاء سے انشاء پردازی بنا تو اس کے معنی ہوئے: طرزِ تحریر' عبارت آرائی' خط یا عبارت لکھنے کا ڈھنگ' عبارت کی خوبی' مضمون نگاری' مضمون نویسی وغیرہ۔

بقول سید محمد حسنین: ''انشاء کا مادہ ''نشا'' (نش ء) ہے' جس کے لغوی معنی پیدا کرنا ہے۔۔۔۔ انشاء کی توانائی دراصل خیال کی تازگی' تومندی سے ظاہر ہوتی ہے۔ انشائی قوت سے بات میں معنویت پیدا ہوتی ہے اور خیالات کی لہریں نکلتیں ہیں''[۱]

بقول سلیم اختر: ''انشاء کے جو بھی معنی ہوں' انشائیہ صرف اور صرف Essay کا مترادف ٹھہرتا ہے''[۲]

بقول وحید قریشی: ''انشاء کا لفظ ابتداء میں ایک دفتری اصطلاح تھا' اس کا اطلاق سرکاری فرامین اور مکتوبات کے رف ڈرافٹ پر ہوتا تھا''[۳]

۱۔ ''انشائیہ کی بنیاد'' ڈاکٹر سلیم اختر صفحہ ۱۴۷ ۲۔ ایضاً' صفحہ ۱۴۸

۳۔ ''اردو کا بہترین انشائی ادب'' ڈاکٹر وحید قریشی صفحہ ۱۲

نظیر صدیقی نے ''شہرت کی خاطر'' کے دیباچہ میں انشائیہ کی تعریف اس طرح کی ہے: ''انگریزی ادب میں لفظ Essay سنجیدہ اور ہلکے پھلکے دونوں قسم کے مضامین کے لئے استعمال ہوا ہے''۔ ۴

بقول ڈاکٹر وزیر آغا: ''انشائیہ کا کام تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنا ہے۔۔۔۔اس کے علاوہ وہ کوئی مکمل نقطہ نظر پیش کرنے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ اس کا کام ایک عام چیز کے کسی انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف آپ کو متوجہ کرنا اور آپ کو ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دینا ہے''۔ ۵

ایک اور جگہ پر وحید قریشی نے انشائیہ کی تعریف اس طرح کی ہے ''ذہن کو یک لخت ایک نئی دنیا میں ڈالنا اس ادب پارے کا کام ہے۔۔۔۔انشائی ادب کا اختصار اس کا بنیادی وصف ہے''۔ ۶

بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی: ''انشائیہ کا مفہوم اردو میں تقریباً وہی ہے جو انگریزی میں Essay کا ہے۔۔۔۔انشائیہ مضمون نگاری کا وہ جز وہے جس میں مصنف اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات کو پیش کرتا ہے'' ۷

بقول مشکور حسین یاد: ''میں انشائیہ کو ادب کا ایک ایسا خودرو پودا کہتا ہوں کہ جب وہ شاخوں میں پھیلتا ہے تو ادب کی مختلف اصناف کی نمائندگی کرتا ہے۔ گویا ہر صنفِ سخن اس پودے کی ایک منفرد شاخ کی مانند ہے۔ دراصل میرے اور دیگر احباب کے اندازِ فکر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ انشائیوں کو ایک صنفِ سخن سمجھتے ہیں اور میں انشائیہ کو اصناف کا سرچشمہ'' ۸

بقول لطیف ساحل: ''انشائیہ ایسے Essay یعنی مضمون کی ایسی قسم ہے جو خوش طبعی کو ذکاوت اور ذکاوت کو خوش طبعی سے ملا دے'' ۹

ایک اور جگہ پر مشکور حسین یاد نے انشائیہ کی تعریف اس طرح کی ہے ''انشائیہ کی تعریف لفظوں میں نہیں ہوا کرتی۔

---

۴ ''شہرت کی خاطر'' نظیر صدیقی، صفحہ ۳

۵ ''تنقید و احتساب'' وزیر آغا صفحات ۲۴۸ تا ۲۴۹

۶ ''اردو کا بہترین انشائی ادب'' ڈاکٹر وحید قریشی، صفحہ ۲۲

۷ ''ادب کا تنقیدی مطالعہ'' ڈاکٹر سلام سندیلوی، صفحات ۲۰۳ تا ۲۰۴

۸ ''انشائیہ کیا ہے؟ (مذاکرہ امروز ۔۲۰ مئی ۱۹۸۳ء) بحوالہ ''اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش'' لطیف ساحل، صفحہ ۱۸

۹ ''اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش' لطیف ساحل'' صفحہ ۲۲

انشائیہ کی تعریف یا تو انشائیہ پڑھنا ہے یا انشائیہ لکھنا ہے'' [۱۰]

بقول ڈاکٹر اختر اورینوی: ''انشائیوں میں مزاح کا عنصر بھی ضروری ہے۔ ایک انشائیہ نگار مزاح کے ترکش کا ہر تیر استعمال کرسکتا ہے۔ مگر سلیقہ شرط ہے'' [۱۱]

بقول عبدالماجد دریا آبادی: ''انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسنِ انشاء ہے۔ یہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ انشائیہ وہ ہے جس میں بجائے مغز و مضمون کی اصل توجہ حسنِ عبارت پر ہو'' [۱۲]

بقول محمد ارشاد: ''پرسنل Essay انشائیہ اس مضمون یا (Essay) کو کہا جاتا ہے جو پرسنل (شخصی) کی صفت سے متصف ہو۔ جس طرح عربی گھوڑا گھوڑا ہی ہوتا ہے لیکن بعض مخصوص اوصاف کی بنا پر جو صرف عربی گھوڑے میں موجود ہیں، گھوڑوں کی دیگر انواع سے ممیز کیا جاتا ہے، لیکن ان مخصوص اوصاف کی بناء پر وہ اپنی جنس سے خارج نہیں ہو جاتا۔۔۔۔ ہر انشائیہ مضمون ہی ہوتا ہے اسی طرح جس طرح عربی گھوڑا گھوڑا ہی ہوتا ہے'' [۱۳]

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ: ''مضمون نگاری Essay writing کا ترجمہ ہے اور Essay کا ترجمہ مضمون کیا جاتا رہا ہے۔ آج کل Essay کو انشائیہ اور مضمون لطیف بھی کہہ دیتے ہیں'' [۱۴]

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی: ''انشائیہ مضمون نگاری کا ایک مخصوص انداز ہے۔۔۔۔ انشائیہ کا موضوع عام طور پر علمی اور تحقیقی نہیں ہوتا۔ ایک داخلی آہنگ بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کی حدیں غنایت سے جا ملتی ہیں'' [۱۵]

بقول رشید امجد: انشائیہ انسان اور انسان کے متعلقات سے بحث کرتا ہے۔ اس لئے اس میں انسانی زندگی کے سارے ہی

---

[۱۰] ممکنات انشائیہ، مشکور حسین یاد، صفحہ ۱۳۸

[۱۱] ''مہر نیم روز ۱۹۷۷ء'' بحوالہ انشائیہ کی بنیاد، ڈاکٹر سلیم اختر، صفحات ۱۸۷ تا ۱۸۸

[۱۲] ماہنامہ ''ادیب'' علی گڑھ کے انشائیہ نمبر مئی ۱۹۵۹ء، (ایک مذاکرہ) بحوالہ جدید اردو انشائیہ نگاری از اکبر حمیدی، صفحہ ۲۳

[۱۳] اردو انشائیہ نگاری، از بشیر سیفی، صفحہ ۲۴

[۱۴] ''صنف نثر'' بحوالہ ''اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش'' از لطیف ساحل، صفحہ ۱۴

[۱۵] ''اوراق'' انشائیہ نمبر ۱۹۷۲ء ''انشائیہ کے ابتدائی نقوش'' از لطیف ساحل، صفحات ۱۴ تا ۱۵

پہلو سمٹ آتے ہیں''۱۶

بقول جابر علی سید: ''لفظ انشاء کا لفظی مفہوم تخلیق ہے اور فرانسیسی Essay کا مفہوم بھی کم و بیش تخلیق ہی ہے اسی بناء پر کہ Essay ذہنی کوشش و کاوش سے لکھی ہوئی تحریر ہے۔ To Essay بطور فعل تخلیقی کوشش کرنا ہے اور بطور اسم اس کاوش کا تحریری نتیجہ ہے''۱۷

بعض مغربی ادیبوں نے انشائیہ کی تعریف بڑے اچھے انداز میں کی ہے۔ انگریزی انشائیہ نگار Maurice Hewlett نے انشائیہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''انشائیہ ایک ایسے پڑھے لکھے پیٹ بھرے انسان کی خود کلامی ہے جو پینتالیس کے لگ بھگ ہے''۱۸

بقول ڈاکٹر جانس: (It is a loose sally of mind) یعنی انشائیہ ذہن کی ایک ترنگ ہے۔۱۹

بقول سرجان ڈرنک واٹر: ''شاعری میں جو حیثیت غنائی نظم (Lyric) کو ہے وہی حیثیت نثر میں مضمون (یعنی انشائیہ) کو حاصل ہے''۲۰

بقول ہاوسٹن پیٹرسن ("Great Essays" کے مرتب): ''Essay کا مطلب تحریر کا ایک ایسا چھوٹا سا ٹکڑا ہوگا جس میں کسی بھی موضوع سے بحث کی گئی ہو۔ مگر شخصی، غیر رسمی اور غیر مصنوعی انداز میں Essay مفکرانہ ہوگا لیکن سنجیدہ نہیں۔ وہ فلسفہ سے قریب ہوگا لیکن فلسفے کی طرح باقاعدہ نہیں۔۔۔۔ وہ ہمیں مصنف کی رائے سے اتفاق کی ترغیب دے سکتا ہے لیکن وہ ہمیں اتفاق رائے پر مجبور نہ کرے گا۔ Essayist چاہے اور جو کچھ بھی ہو وہ ہمارا دوست اور لفظوں کا فنکار ہوتا ہے''۲۱

بقول آلڈس ہکسلے: ''سب سے تسلی بخش Eassy وہ ہیں جن میں قلم کار اپنی ذات سے لے کر کائنات تک، مجرد سے لے کر محسوس تک اور خارجی سے لے کر باطنی دنیاؤں تک کے مراحل طے کر جائے''۲۲

---

۱۶ ''جدید اردو انشائیہ'' از اکبر حمیدی، صفحہ ۵۱
۱۷ ''فنون'' مارچ، اپریل ۱۹۷۷ء بحوالہ انشائیہ کی بنیاد، سلیم اختر، صفحہ ۱۴۹
۱۸ ''انشائیہ کے ابتدائی نقوش'' لطیف ساحل، صفحہ ۱۶ ۱۹ ایضاً، صفحہ ۱۰ ۲۰ ایضاً، صفحہ ۱۱
۲۱ ''جدید اردو انشائیہ'' اکبر حمیدی، صفحہ ۶۰ ۲۲ ایضاً صفحہ ۶۰

بحیثیت مجموعی انشائیہ کی مندرجہ بالا جملہ تعریفوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انشائیہ دراصل Essay یعنی مضمون کی ایک مخصوص قسم ہے۔ یہ صنف انگریزی ادب سے اردو میں آئی اور انگریزی Essay کے مترادف ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ انشائیہ Essay کی عمومی شکل کے متبادل نہیں بلکہ Essay کی ایک خاص نوع کے متبادل ہے۔ جسے اس کے منفرد اسلوب کے ذریعے پہچانا جا سکتا ہے۔

۲۔ انشائیہ نگاری کا پس منظر مغرب میں:

انشائیہ نگاری انگریزی ادب سے اردو ادب میں آئی اور اس کے اصول و قواعد بھی مغرب سے ہی لئے گئے ہیں۔ انگریزی ادب میں اس صنف کو Essay یا Light Essay کہا جاتا ہے۔ انگلستان میں بیکن نے انگریزی ادب میں انشائیہ لکھنے کی ابتدائی کی۔ انیسویں صدی میں انگریزی Essays اپنی نکھار پر آئے اور بیسویں صدی میں یہ فن اپنے عروج پر پہنچا۔

فرانسیسی ادب میں Essay کے وجود میں آنے کا ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ ہے۔ مونتین (Montaigne) نامی ایک فرانسیسی ادیب نے ۱۵۷۱ء میں اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور دنیا کی ہمہ ہمی سے کنارہ کش ہو گیا۔ تو اس نے اپنے فرصت کے لمحات کا مصرف یہ نکالا کہ وہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں اپنی عقل و فراست اور ذہن کی رسائی کا امتحان لے۔ اس تصور کے تحت وہ مختلف عنوانات پر اپنے غیر مربوط خیالات کو بے محابہ سپرد قلم کرنے لگا۔ اپنی اس آزمائش کو اس نے (Assai) کا نام دیا۔

پیٹر رویسٹ لینڈ نے لکھا ہے کہ : ''Essay کا لفظ سب سے پہلے ۱۵۸۰ء میں ''ایسے آف مونتین'' کے ضمن میں منظرِ عام پر آیا اور مونتین کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ پہلا مصنف ہے جس نے بطور انسان کسی چیز کو محسوس کیا'' ۲۳

مفکرین کی رائے معلوم کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مغرب میں انشائیہ کا موجد و بانی فرانسیسی ادیب ''مونتین'' ہی تھا۔ مونتین کی انشائیہ نگاری کا ستارہ ہر دور میں چمکتا ہی رہا ہے اور اسے ہر زمانے میں پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ میسر آتا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ میں مونتین کی اولیت کے باوجود اسے حتمی، مثالی یا حرفِ آخر قرار نہیں دیا گیا۔

انگریزی ادب میں انشائیہ کو جنم دینے میں مونتین نے مثال تو فراہم کی ہے مگر خود اس کے انشائیے اس صنف کے مثالی نمونے شمار نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے کہ انشائیہ کے ارتقا اور اس کی روایت میں مونتین کی معاونت ابتدائی

---

۲۳ پیٹر ولیسٹ لینڈ ''انشائیہ کیا ہے؟'' بحوالہ انشائیہ اردو ادب میں، انور سدید، صفحہ ۱۱۸

نوعیت کی ہے۔

برکن ہیڈ (Birken Head) نے لکھا ہے کہ : ''اس آزمائشی ابتداء سے انگریزی انشائیہ کا تمام سلسلہ پھوٹتا ہے''۔ انگریزی انشائیہ میں اولین مقام بیکن (۱۶۲۶ء۔۱۵۶۱ء) کو حاصل ہے' جس کے انشائیوں کا مجموعہ مونتین کے انتقال کے پانچ سال بعد ۱۵۹۷ء میں شائع ہوا۔ اور اس سے علم و دانش کا جو سرچشمہ پھوٹا اسے نہ صرف عبد آفریں قرار دیا گیا بلکہ اس کے لئے ایک خاص اصطلاح Baccnian Wisdom بھی وضع کی گئی جو آج تک مستعمل ہے۔ ارل آف برکن ہیڈ نے لکھا ہے کہ ''بیکن کے انشائیے قامت کے اعتبار سے چھوٹے تھے لیکن ان میں دانش کا وسیع ذخیرہ موجود تھا''۔ ۲۴

بیکن نے مونتین سے انشائیہ کی ہیئت تو حاصل کر لی تھی مگر اپنے مضامین پر فرانسیسی مزاج کا اثر نہیں آنے دیا۔ مونتین سے لے کر ایڈیسن تک انشائیہ نے جتنا کچھ تخلیقی سفر طے کیا ہے اس میں چارلس لیمب (۱۸۳۴ء۔۱۷۷۵ء) ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے جو دور سے ہی نظر آ جاتا ہے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں کہ : ''انشائیہ کی روح اور جان اپنے کمال پر اس کے یہاں ملتی ہے'' ۲۵

ڈی لوکس نے لکھا ہے کہ : ''لیمب انگریزی نثر نگاروں میں شاید سب سے زیادہ زیرک' شیریں اور انسان دوست ادیب تھا'' ۲۶

۳۔ اردو انشائیہ کا پس منظر:

اردو انشائیہ کی اصطلاح ایک مخصوص صنف ادب کے لئے استعمال ہوتی ہے جس کا ایک خاص داخلی مزاج ہے۔ انشائیہ نگار اختصار سے کام لیتا ہے اور عموماً غیر رسمی انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ ذاتی تجربات و انفرادی محسوسات کے اظہار کو اولیت دیتا ہے۔ انشائیہ میں موضوعیت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جدید انشائیہ میں جو تازگی پائی جاتی ہے اسے قدیم انشاء پردازی کا نکھرا ہوا روپ کہہ سکتے ہیں۔ انشائیہ میں بات سے بات پیدا کرنے کا رجحان فکری سطح پر ہے۔ اس میں ذہن ایک بات سے دوسری بات کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اردو کی قدیم انشاء پردازی میں بھی انشائیہ کی خصوصیات موجود ہیں۔ انشائیہ نگار انشائیہ میں عموماً ذاتی تاثرات و تجربات بیان کرتا ہے۔ انشائیہ کی ایک اور خوبی موضوع کی مخفی مفاہیم کو اجاگر کرنا ہے۔

---

۲۴ ''انشائیہ اردو داب میں'' از انور سدید' صفحہ ۱۲۳ ۲۵ ایضاً' صفحہ ۱۳۳ ۲۶ ایضاً' صفحہ ۱۳۳

قدیم انشاء پردازی کو جدید انشائیہ کی کسوٹی پر پرکھنا یا اسے انشائیہ کہنا مناسب نہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی قدیم انشاء پردازی کے بعض نمونوں میں انشائیہ کے کچھ اوصاف منتشر حالت میں موجود ہیں۔ لہذا اردو انشائیہ کے تدریجی ارتقا میں ان کا ذکر ناگزیر ہے۔ اردو ادب کے بہت سے ناقدین کا خیال ہے کہ انشائیہ کا پودا بھی مغرب سے ہی آیا اور سرسید احمد خاں نے اسے سب سے پہلے اردو ادب سے متعارف کرایا۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے لکھا ہے کہ : ''اردو ادبیات میں مضمون نگاری انگریزی ادبیات کے زیر اثر انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور سرسید احمد خان اردو میں اس صنف کا باقاعدہ آغاز کرنے والے تھے''۔ ۲۷

نیاز فتح پوری کا بھی یہی خیال ہے کہ : ''اس فہرست میں سب سے پہلا نام سرسید مرحوم کا نظر آتا ہے''۔ ۲۸

بقول خواجہ محمد زکریا : ''میں سرسید احمد خان کو پہلا انشائیہ نگار سمجھتا ہوں اور اگر انشائیے کے لئے تحریر کی غیر معمولی سنجیدگی کو معیار سمجھا جائے تب بھی سرسید احمد خان کے کئی مضامین انشائیے کی ذیل میں آ جاتے ہیں''۔ ۲۹

پروفیسر جمیل آذر نے ایڈیسن اور اسٹیل کے ''پیریوڈیکل ایسیز'' (Periodical Essays) کا حوالہ دیتے ہوئے خیال ظاہر کیا ہے کہ : ''ان مضامین پر شخصی چھاپ کا رنگ زیادہ تھا۔ سرسید احمد خان نے ایسے ہی مضامین سے متاثر ہو کر اردو ادب میں باقاعدہ مضمون نویسی کی داغ بیل ڈال دی''۔ ۳۰

مندرجہ بالا ناقدین کے علاوہ سید ظہیر الدین مدنی، نظیر صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی بھی یہی رائے ہے کہ سرسید احمد خان ہی اردو میں اس صنفِ ادب کے باقاعدہ آغاز کرنے والے تھے۔ مگر بعض ناقدین نے اختلاف بھی کیا ہے۔ اور کچھ محققین نے اس کا سراغ قدیم اردو نثر میں لگایا ہے۔

بقول ڈاکٹر جاوید وشسٹ : ''اردو انشائیہ کی ابتداء قطب شاہی دربار کے تاریخی معرکے سے ہوئی''۔ ۳۱ جاوید وشسٹ مزید لکھتے ہیں کہ ''ملا وجہی عالمی ادب کے پہلے انشائیہ نگار مونتین اور انگلش Essay کے موجد بیکن کا ہم عصر تھا اور عالمی سطح پر بھی وجہی کا تیسرا نمبر تھا۔ یعنی پہلے نمبر پر فرانسیسی انشائیہ، دوسرے نمبر پر انگلش ایسے اور تیسرے نمبر پر اردو انشائیہ''۔ ۳۲

---

۲۷ بحوالہ ''اردو میں انشائیہ نگاری''، بشیر سیفی، صفحہ ۸۰

۲۸ بحوالہ ''انشائیہ اردو ادب میں''، انور سدید، صفحہ ۱۴۶ ۲۹ ایضاً صفحہ ۱۴۶ ۳۰ ایضاً، صفحہ ۱۴۶

۳۱ ایضاً، صفحہ ۳۳ ۳۲ ایضاً، صفحہ ۳۴

خواجہ احمد فاروقی نے ماسٹر رام چندر کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ : ''انہوں نے اردو کو مضمون یعنی ''ایسے'' سے روشناس کرایا'' ۳۳

بقول ڈاکٹر سیدہ جعفر : ''مضمون نگاری کے ارتقا میں سرسید کے مضامین ایک توسیع ہیں آغاز نہیں۔ ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں۔ جنہوں نے شعوری طور پر اردو ادب میں اس صنف کی ابتداء کی۔۔۔۔ سرسید احمد خان کے مضامین اس ابتداء کا نکھرا ہوا ترقی یافتہ روپ ہیں'' ۳۴

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا بھی یہی خیال ہے کہ ماسٹر رام چندر اردو کے اولین مضمون نگار ہیں۔

جن محققین نے انشائیہ کا سراغ قدیم نثر میں لگایا ہے انہوں نے جزو کو کل پر فوقیت دی ہے اور اپنے فیصلے کی اساس انشائیہ کی بعض غیر مرتب صورتوں پر رکھی ہے۔ تاہم یہ بھی سوچنے والی بات ہے کہ ان ادباء کے سامنے مغربی انشائیہ کے مثالی نمونے موجود نہیں تھے' اس کے برعکس سرسید احمد خان نے مضمون نگاری کا آغاز شعوری طور پر کیا۔ اور اس کے ساتھ اخلاق کو خوش طبعی سے جلا دینے اور خوش طبعی کو اخلاق سے زندہ کرنے کا مقصد بھی وابستہ کیا۔ یہ وہی مقصد تھا جو ایڈیسن اور اسٹیل کے پیشِ نظر تھا۔

ماسٹر رام چندر مضمون نگاری میں سرسید احمد خان کے پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مضمون نگاری میں اصلی اہمیت سرسید احمد خاں کو ہی حاصل ہے۔ اس لئے کہ اردو نثر اور مضمون نگاری کی ترویج و ترقی میں نمایاں کام سرسید احمد خان کا ہی ہے۔ انہوں نے ہی اردو میں باقاعدہ مضمون نگاری کی تحریک شروع کی۔ اردو نثر اور اردو ادب کی ترقی کے لئے کام کیا' قدیم مقفیٰ طرزِ نگارش کو ترک کیا اور انگریزی نثر کی طرز پر اردو میں سادہ نویسی کی تحریک کا آغاز کیا۔ مختلف موضوعات پر مختصر مضامین و مقالات لکھ کر اردو دانوں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ اس لئے سرسید احمد خان ہی صحیح معنوں میں جدید اردو نثر اور مضمون نگاری کے بانی کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ مضمون نگاری کو باقاعدہ صنفِ ادب کا رتبہ سرسید نے ہی عطا کیا۔

---

۳۳ ''انشائیہ اردو ادب میں'' انور سدید' صفحہ ۱۵۲

۳۴ ''اردو میں انشائیہ نگاری'' بشیر سیفی' صفحہ ۸۱

ڈاکٹر سید عبداللہ نے سرسید کے گنتی کے چند مضامین کو Essay کہا ہے۔ شاید انہوں نے ان مضامین کو انشائیہ کے زمرے میں لیا ہے۔ اور ان مضامین کی جو خوبیاں بتائی ہیں وہ انشائیہ کی خوبیاں ہیں۔ وہ مضامین جن کو انشائیہ کہا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

سرسید کے مضامین ''تعصب'' ''تعلیم و تربیت'' ''کاہلی'' ''اخلاق'' ''ریا'' ''مخالفت'' ''بحث و تکرار'' ''سویلائزیشن'' ''اپنی مدد آپ'' ''خوشامد'' ''گزرا ہوا زمانہ'' ''امید کی خوشی'' ''رسم و رواج کے نقصانات'' ''انسان کے خیالات'' ''آزادی رائے'' ''تربیت اطفال'' ''سراب حیات'' ''خودغرضی و قومی ہمدردی'' ''آخری پرچہ تہذیب الاخلاق'' وغیرہ میں ان کا اختصار قدرِ مشترک ہے جو ایک باقاعدہ مضمون کا بنیادی وصف ہے۔

سرسید احمد خان کی مضمون نگاری کا جائزہ لینے کے بعد اگر ان کے قریبی ساتھیوں کے نثری اسلوب پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو بہتر ہوگا۔ ان کے قریبی ساتھیوں میں نواب محسن الملک' نواب وقار الملک' مولوی چراغ علی' مولوی ذکاءاللہ اور مولانا الطاف حسین حالی' ڈپٹی نذیر احمد' شبلی نعمانی وغیرہ کے نام لئے جاتے ہیں۔ سرسید کے ان رفقاء کے چند مضامین میں انشائیے کے بعض اوصاف منتشر حالت میں موجود تھے۔ مگر چونکہ وہ دور ہی مقصدیت اور اصلاح پسندی کا تھا اس لئے انشائیے کی اکائی وجود میں نہ آسکی۔ سرسید کے ساتھیوں میں مولوی ذکاءاللہ کے مضمون ''آگ'' کو جزوی طور پر انشائیہ کہہ سکتے ہیں۔

محمد حسین آزاد کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ اپنے منفرد اسلوب کی بناء پر اردو ادب میں وہ ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیف ''نیرنگِ خیال'' کے تقریباً تمام مضامین' جانسن اور ایڈیسن کے انگریزی مضامین کا ترجمہ ہیں۔ ''نیرنگِ خیال'' کے مضامین کو انشائیہ کے قریب کہنے میں تو بعض ناقدین ادب متفق ہیں مگر خالص انشائیہ نہیں۔ چونکہ ان مضامین میں عدم تکمیل کے بجائے تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔

چونکہ یہ اصلاحی دور تھا اور سرسید احمد خان اور ان کے ساتھیوں کے پیشِ نظر مسلمانوں کی اصلاحِ احوال کا واضح مقصد تھا اس لئے وہ خالص انشائیے کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ پھر بھی سرسید کے بعض مضامین مثلاً ''گزرا ہوا زمانہ'' ''امید کی خوشی'' ''امید'' اور کسی حد تک ''کاہلی'' ''خوشامد'' اور ''بحث و تکرار'' میں جزوی طور پر انشائیہ کا انداز جھلکتا ہے۔ گو کہ یہ مضامین انگریزی انشائیہ کی تقلید میں ہی لکھے گئے تھے اور انشائیہ نما مضامین انشائیہ کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے مگر انہیں اردو انشائیہ کے اولین خام نمونوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ انشائیہ کے موضوعات اور اسلوب کی وسعت:

انشائیہ کے موضوعات کے سلسلے میں ہمیں دو اہم باتوں پر غور کرنا چاہئے۔ نمبر۱: انشائیہ کے ابتدائی دور میں اس کے موضوعات کیا کیا تھے؟ دورِ متوسطین میں انِ موضوعات میں کیا تبدیلی ہوئی اور پھر دورِ آخر میں ان میں کیا کیا اضافہ ہوا؟ نمبر۲: انشائیہ کا سلوب ابتداء میں کیا تھا؟ دورِ متوسطین میں اس کا رنگ کس طرح بدلا اور آخر میں انشائیہ کے اسلوب نے کیا کیا صورتیں اختیار کیں؟

انشائیہ کی حد مقرر کرنا مشکل کام ہے اس لئے کہ یہ موضوع مقصد اور اسلوب کے اعتبار سے بہت وسیع ہے۔ اس میں مختلف قسم کے موضوعات داخل ہو گئے ہیں اور انشائیہ نگار کسی بھی موضوع کا انتخاب کر سکتا ہے۔ انشائیہ نگاری اپنے ابتدائی دور میں کہاوت اور ضرب المثل کی شکل میں ملتی ہے۔ چینی اور عربی زبان میں کہاوتیں ملتی ہیں اور کہاوتوں کو انشائیہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا مگر پھر بھی ان میں انشائیہ کے جراثیم موجود ہیں۔ اور اس طرح سے انشائیہ کے موضوعات میں کہاوتیں اور ضرب المثل بھی شامل ہو سکتی ہیں۔

انشائیہ میں فلسفہ بھی داخل ہے۔ مونتین نے اپنے انشائیہ میں کبھی کبھی فکری تاثرات بھی شامل کئے ہیں اور ان کا وہ جگہ جگہ حوالہ دیتا ہے۔ مختلف لطیفے بھی بیان کرتا ہے۔ جبکہ اس کا خاص اسلوب بہت ہلکا پھلکا ہے۔ اور بہت ہی سیدھے سادھے انداز میں اپنے تجربات کا اظہار کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ اپنے اصل اسلوب سے ہٹ بھی جاتا ہے۔

بیکن کے انشائیے فلسفیانہ خیالات کے ہیں ان کے انشائیہ کی خاص بات یہ ہے کہ وہ افادی پہلو کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔ اور ہر مسئلہ کو دنیاوی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ لاک کے انشائیے پر بھی فلسفے کی گہری چھاپ ہے وہ مختلف مسائل کو فلسفیانہ انداز سے دیکھتے ہیں۔ اور ان کا حل بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ براؤن بھی فلسفہ سے متاثر ہیں وہ اپنے انشائیے میں فلسفیانہ نظریات پیش کرتے ہیں۔ خاص طور سے وہ دنیا کی بے ثباتی اور مدت سے بحث کرتے ہیں۔

انشائیہ میں صرف فلسفہ داخل نہیں ہوا بلکہ اس میں اخلاقی قدریں بھی شامل کی گئی ہیں۔ بہت سے انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیوں کے ذریعے انسانی اخلاق کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح انہوں نے انشائیہ میں مقصدی اور افادی رنگ شامل کر دیا ہے۔ اس قسم کے انشائیہ نگاروں میں ڈرائیڈن، ایڈیسن اور اسٹیل کے نام سرِ فہرست ہیں۔ خاص طور سے ایڈیسن اور اسٹیل نے ''اسپیکٹیٹر'' مشترکہ طور پر نکال کر عوام کے اخلاقی معیار کو بلند کیا۔ گولڈاسمتھ کے انشائیے میں زندگی کے عام مشاہدات پائے جاتے ہیں۔ ان کا اسلوب آزادانہ ہے۔ اس طرح ان کے انشائیے دوسرے انشائیہ نگاروں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہیں۔

انشائیہ میں طنز و مزاح بھی شامل کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ انشائیہ نگار ایک ذاتی اور انفرادی اسلوب اختیار کر سکتا ہے۔ سوفٹ کے انشائیے طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ چارلیس لیمب کے انشائیے میں ہمیں اس کے ذاتی تجربات ملتے ہیں ان کے انشائیے میں المیہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس میں مزاح کا عنصر بھی شامل ہے۔ ہیڈلٹ کے انشائیے علمی اور ادبی نقطہ نظر سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیے کو قدیم اور جدید ادب کے حوالوں سے بوجھل کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک طرف گہرے اور عمیق خیالات ملتے ہیں تو دوسری طرف زندگی کے تجربات بھی پائے جاتے ہیں۔

کارلائل کے انشائیے دیگر انشائیہ نگاروں سے کچھ الگ ہیں اسے ماضی سے دلچسپی ہے اور ہر قدیم بات کو پسند کرتا ہے اور جدیدیت سے نفرت کرتا ہے۔ اور اسی لئے وہ سائنسی ترقی کو اہمیت نہیں دیتا۔ میکالے کارلائل کے برخلاف سائنس کا پوجاری ہے اور سائنس کے حیرت انگیز کرشموں کا قائل ہے۔ وہ روحانیت کی فضا میں سانس لینے کے بجائے مادیت پسند ہے۔ اور اسی لئے اس کے انشائیے کا تعلق دنیا کی مادی ترقی سے ہے۔ رسکن کے انشائیے ایک نئے پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیے میں جمالیاتی نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ وہ ہر جگہ حسن ہی کو تلاش کرتے ہیں۔ اور زندگی کو حسین بنانا چاہتے ہیں۔ وہ پاکیزہ زندگی کے قائل ہیں۔

جدید دور میں ''چسٹرٹن'' ایک مشہور انشائیہ نگار ہے۔ مگر وہ جدید دور کا ہوتے ہوئے بھی قدامت پرست ہے۔ اس کا مزاج بڑی حد تک کارلائل سے ملتا جلتا ہے۔ اس کو جدید دور کی تہذیب میں خامیاں نظر آتی ہیں۔ اور ان خامیوں کو دور کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ گارڈنر کے انشائیے حیات و کائنات کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے موضوعات اہم بھی ہوتے ہیں اور معمولی بھی مگر اس کے تقریباً ہر مضمون میں گہرائی پائی جاتی ہے۔

مغرب میں جو انشائیے لکھے گئے ان میں سے چند مشہور مصنفین کے موضوعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انشائیے کا کوئی ایک خاص موضوع نہیں ہے۔ انشائیہ میں فلسفہ بھی ہے اور اخلاق بھی، ہنسی بھی ہے اور آنسو بھی، اس میں حیات و کائنات کا تجزیہ بھی کیا جا سکتا ہے اور ماضی اور حال کا ذکر بھی، اس میں مادی اثرات بھی پائے جاتے ہیں اور روحانی جذبات بھی۔ غرض انشائیے میں ہر قسم کے موضوعات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

جس طرح سے انگریزی ادب میں خالص انشائیے بہت کم ملتے ہیں اسی طرح اردو ادب میں بھی اصلی انشائیے کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ اردو ادب میں مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کی اصل بنیاد

سرسید ہی نے ڈالی ہے مگر سرسید سے پہلے انشائیے کے خام نمونے ہم کو ملتے ہیں۔ ملا وجہی کی ''سب رس'' میں تصوف، حسن و عقل کے بارے میں کچھ باتیں ملتی ہیں ''سب رس'' میں تو انشائیہ کا انداز پایا جاتا ہے مگر چونکہ ''سب رس'' کے موضوعات کا ذکر فلسفیانہ انداز میں ہے اس لئے ان موضوعات کو انشائیہ کے زمرے میں نہیں لایا جا سکتا۔ کچھ محققین ادب کا یہ خیال ہے کہ انشائیہ کا تعلق نہ فلسفہ سے ہے نہ اخلاق سے اور نہ اس کو ماضی پرستی سے کوئی لگاؤ ہے۔ دراصل انشائیہ میں تو ذاتی تجربات بیان کئے جاتے ہیں۔ ''نوطرزِ مرصع'' کو بھی انشائیہ کے زمرے میں نہیں لایا جا سکتا۔ عطا حسین تحسین نے اس میں بعض جگہ پر خود نوشت کے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ مگر اس کا اندازِ بیان تصنع و آورد سے بھرا ہوا ہے جو انشائیہ کے اسلوب کے خلاف ہے۔

''فسانہ عجائب'' میں جو طرزِ بیان اختیار کیا گیا ہے وہ انشائیے کا انداز نہیں ہے رجب علی بیگ سرور نے اپنا زورِ قلم صنائع و بدائع پر صرف کر دیا ہے۔ انشائیہ کا اسلوب ایک حد تک غالب کے خطوط میں بھی ملتا ہے۔ چونکہ غالب کا انداز بیان سادہ اور تصنع و آورد سے پاک ہے۔ اس میں غالب کی شخصیت کے بھرپور نقوش ملتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ اردو انشائیہ کے کچھ نمونے سرسید احمد خان کی تحریر میں ملتے ہیں۔ ''بحثِ و تکرار'' ''امید کی خوشی'' وغیرہ میں سرسید کی اپنی ذات کا عکس پایا جاتا ہے۔

محمد حسین آزاد کو بھی انشائیہ نگار کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے ''نیرنگ خیال'' میں انشائیہ کا انداز پایا جاتا ہے۔ ان کے تخیلی رنگ میں کچھ فلسفیانہ جھلک ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کے مضمون ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' کو ایک کامیاب انشائیہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ''کراچی سے بصرے تک'' میں بھی انشائیہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے مضامین ''دیا سلائی'' ''آسمان کی آوازیں'' ''سیم لا'' ''گلاب تمہارا'' ''کیکڑا ہمارا'' ''تجھینگر کا جنازہ'' وغیرہ کو انشائیہ کی صف میں جگہ ملتی ہے۔ اس میں خواجہ حسن نظامی کی شخصیت جھلکتی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین ''نذیر احمد کی کہانی'' ''ایک وصیت کی تعمیل'' انشائیہ نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض مضامین انشائیہ کے قریب ہیں اس لئے کہ انہوں نے اس میں اپنے ذاتی تجربات کو بڑے ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے مضامین ''کرشمہ قدرت'' ''چڑیا چڑے کی کہانی'' ''فطرت کی بزم نشاط'' ''حکایت بادہ تریاک'' انشائیہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے بعض مضامین اردو انشائیہ کے بہترین نمونے ہیں ''امتحانات'' اور ''بجرد'' میں انشائیہ کی جھلک نظر آتی ہے۔

پطرس بخاری کا مضمون ''لاہور کا جغرافیہ'' انشائیہ کے زمرے میں آتا ہے۔ جن انشائیہ نگاروں کا اوپر تذکرہ کیا گیا

ہے ان کے انشائیوں میں مکمل طور سے انشائیہ نگاری کی خصوصیات نہیں پائی جاتی ہیں۔ مگر اس صنف کے لئے اس قدر سختی برتنا بھی مناسب نہیں ورنہ پھر انشائیہ کا دربار ہی ختم ہو جائے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ انشائیہ کی جانچ میں لچک پیدا کی جائے تاکہ اردو انشائیہ تہی دامن نہ ہو جائے۔ موجودہ دور کے بدلتے ہوئے رجحانات کے پیشِ نظر تھوڑی بہت ترمیم مناسب ہے۔ مگر انشائیہ کو تنقیدی مضامین اور مقالہ سے الگ رکھنا چاہئے تاکہ وہ اپنا وقار قائم رکھ سکے۔

۵۔ چودھری محمد علی ردولوی کی انشائیہ نگاری:

پچھلے اوراق میں انشائیہ اور انشائیہ نگاری کے بارے میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔ اب چودھری صاحب کی تحریروں میں انشائیہ کا رنگ دیکھنا ہے اور یہ معلوم کرنا ہے کہ کس حد تک انکی تحریریں انشائیہ کے زمرے میں آسکتی ہیں، چونکہ وہ کوئی بڑے انشائیہ نگار نہ تھے۔ ان کی تمام تصانیف کا جائزہ لینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے لکھنؤ سے طبع ہونے والے جریدے ''اودھ پنچ'' کے مختلف شماروں میں ''امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات'' کے عنوان کے تحت یکے بعد دیگرے پانچ مضامین شائع کئے، جنہیں انشائیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں انشائیہ کا تصور اتنا واضح تو نہ تھا اور وزیر آغا نے اپنی کتاب ''انشائیہ کے خدوخال'' میں جس طرح انشائیہ کا تصور پیش کیا ہے اگر اس پیمانے پر جانچا جائے تو شاید یہ کل طور پر اس پیمانے پر پورے نہ اتر سکیں۔ چودھری محمد علی کی کہانیوں، افسانوں اور مضامین کو سید علی کاظم نے جب ''کشکول'' کے عنوان سے مرتب کیا اور اس میں ''تعارفِ مصنف'' کے عنوان سے صلاح الدین احمد نے جو خیال آفریں مضمون تحریر کیا اس میں رقمطراز ہیں۔

''کہانیوں کے علاوہ محمد علی نے امامن مہری کی زبان سے روزمرہ کے سماجی مسائل پر پانچ طنزیے ایسے بھی لکھے ہیں جنہیں اردو کی انشائے لطیف میں ایک نہایت ممتاز مقام ملنا چاہئے'' ۳۵

ان مضامین کو چودھری صاحب نے مجتمع کر کے اپنی کتاب ''گناہ کا خوف'' میں دوبارہ شائع کیا۔ اس کتاب کے دیباچے میں وہ خود اپنے ان مضامین کے بارے میں رقمطراز ہیں: ''ایڈیٹر اودھ پنچ مرحوم نے ان مضامین پر کہا تھا کہ تو نے ایک نئی چیز لکھی ہے جس میں کسی اور کا حصہ نہیں ہے۔۔۔۔ خیر نئی چیز تو کیا ہے کیونکہ ان مضامین کے لکھنے کا خیال میرے دل میں (Barry Pain) کی ایک کتاب سے پیدا ہوا تھا۔ مگر جس انداز سے میں نے اس کو نقشِ اول سے علیحدہ کیا ہے اس پر داد طلب ہوں'' ۳۶

---

۳۵ ''کشکول''، چودھری محمد علی ردولوی، صفحہ ۲۸ ۳۶ ایضاً، صفحہ ۴۰۹

چودھری صاحب نے ان پانچ مضامین کو ''ایمان داری بہترین دور اندیشی ہے'' ''رکھ رکھاؤ'' ''تیہا' طنطنہ جوشا' غصہ' جذبہ'' ''کام کاج'' اور ''خیر خیرات'' کے عنوانات سے شائع کیا ہے۔ان میں قدر مشترک ''امامن مہری'' کا کردار ہے جس کا تعلق اودھ کے انتہائی نچلے طبقے سے ہے۔اس کا تعلق امراء اور زمینداروں کے ملازمین میں سے ہے۔مہری ان گھروں میں صفائی کرنے اور اوپری کام کاج کرنے والی ملازمہ کو کہتے ہیں۔اس ملازمہ نے کوئی فلسفہ نہیں بگھارا ہے بلکہ مذکورہ بالا موضوعات پر اپنے جاہلانہ دماغ سے کام لے کر اور اپنے ماحول اور گرد و پیش سے متاثر ہو کر خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اگر وزیر آغا کی کتاب ''انشائیہ کے خدوخال'' میں متعین کردہ انشائیہ کے حدود اور محاسن کے تحت ان مضامین کا جائزہ لیا جائے تو کچھ مضائقہ نہ ہوگا۔اس کتاب کے ابتدائی باب میں ''انشائیہ کیا ہے؟'' کے عنوان کے تحت وہ تحریر کرتے ہیں کہ ''ایک چیز جو انشائیہ کو دوسری اصناف ادب سے ممیز کرتی ہے' اس کا غیر رسمی طریق کار ہے۔دراصل انشائیہ کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لئے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں رد و قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لئے زندگی کی پیچیدگی اور گمبھیرتا سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرے اور اپنے شخصی ردِ عمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقہ احباب میں شامل کر لے'' ۳۷

چودھری محمد علی نے ان مضامین میں خود کو امامن مہری کے روپ میں پیش کیا ہے۔ہر جگہ واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے اور انتہائی غیر رسمی طریقہ کار اختیار کیا۔مثلاً: ''میں لئے آتی تھی ترکاری اس میں سے بودیں ٹیک کے مولوی صاحب کی پگڑی پر گریں جھلا کے کہنے لگے۔''ہا کمبخت نجس کر دیا''۔مجھے جو تیہا آیا ٹوکری مولانا کے سر پر اوندھا دی۔مولانا ٹھٹھے پر سے اکھڑ گئے' لگے نیلے پیلے دیدے نکالنے' میں سوچی کہ آج چپ رہی تو کل مولوی کا ہواؤ زیادہ بڑھ جائے گا۔میں بھی آنکھیں غریر کے کھڑی ہوگئی اور کہنا شروع کر دیا۔''اجی مولوی صاحب آپ ہی تو کہتے ہو کہ غصہ حرام ہے اور آپ ہی یہ جبہ (جذبہ) یہ جوشا (جوش)' چڑھ آیا کہ گال بندر کے۔۔۔۔ہو گئے۔زری آئینہ لے کے دیکھو تو منہ لال بھبھوکا ہو رہا ہے جیسے کسی نے اینٹا (اینٹ) مارا۔پانی ہی تو تھا کوئی موت تو تھا نہیں جو تمہاری۔۔۔۔آسمان کو چڑھ گئی''۔بس میرا اتنا کہنا تھا کہ مولوی کا وضو ٹوٹ گیا' لگے منو بلائی بننے۔بڑے آئے وہاں سے مولوی بن کے۔دیکھا جو تیہا نہ دکھاتی تو ماری پڑتی'' ۳۸

غور طلب بات یہ ہے کہ امامن مہری نے اودھ کے نچلے طبقے کی زبان میں انتہائی غیر رسمی طریق کار اختیار کرتے ہوئے تیہا یعنی غصہ کے فوائد اور نقصانات پر کس طرح روشنی ڈالی ہے لیکن اپنے نقطہ نظر سے۔یہاں کسی قسم کے دلائل سے قطعاً

---

۳۷ ''انشائیہ کے خدوخال'' وزیر آغا' صفحات ۹ تا ۱۰

۳۸ ''کشکول'' صفحات ۵۱۹ تا ۵۲۰

کام نہیں لیا گیا۔ کوئی سنجیدہ گفتگو نہیں کی گئی بلکہ نچلی سطح کی سوچ کو مدِنظر رکھتے ہوئے غصہ کے اثرات واضح کئے گئے ہیں۔
ایک دوسرے مضمون میں امامن مہری یوں کہتی نظر آتی ہیں:

''نجبن اس دن سے لوہا مان گئی۔ جب مجھے دیکھتی ہے ہنستی ہے۔'' افوہ ری بڑھیا تیری ہڈیاں لوہا لاٹ ہیں''۔ لوہا لاٹ نہ ہوتیں تو آج چلنے پھرنے دوڑنے دھونے میں جوانوں پر کیوں کرورہتی۔ کام کاج نہ بیاری دکھی کو مانے نہ آندھی پانی کو دیکھئے۔ وہ تو بے کئے ٹلتا نہیں۔ جولوگ استخارے دیکھ دیکھ کے بات ٹالتے ہیں وہ سدا البچار (لاچار) رہتے ہیں'' ۳۹

یہاں امامن مہری اپنی انتہائی عام اور سادہ زبان میں کام کاج کی اہمیت واضح کرتی ہیں۔ اپنے ذاتی مشاہدات بھی بیان کرتی جاتی ہیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کی مثالیں دے کر انتہائی غیررسمی طریقے سے مخاطب کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

مذکورہ بالا مضامین میں چودھری محمد علی نے دراصل امامن مہری کا روپ دھارا ہے لہٰذا اسی کی زبان استعمال کی ہے اسی کی طرح سوچا ہے اور اسی کے اندازِ فکر کو اپنایا ہے۔ انہوں نے امامن مہری کے قلب میں بیٹھ کر ان مختلف موضوعات پر پائے جانے والے مسائل جن کا تعلق صرف اس کی اپنی ذات سے ہے کسی دوسری خاتون سے بیان کیا ہے۔ بیان میں انتہائی غیررسمی طریق کار اختیار کیا گیا ہے۔ خیالات تو دراصل چودھری صاحب کے ہی ہیں اور قلم بھی انہی کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے نچلے طبقے کی ملازم خواتین کے مسائل کو محسوس کیا اور انتہائی چابکدستی سے اپنی ان ذہنی کیفیات پر سے ان مضامین کا سہارا لے کر پردہ اٹھایا اور زندگی کے بعض مظاہر کو ایک نئے زاویہ سے پیش کیا۔ لہٰذا ان مضامین کو انشائیہ کے زمرے میں شامل نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

وزیرآغا آگے چل کر انشائیہ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''بنیادی طور پر انشائیہ کے خالق کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔ اس کے لئے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا۔ کیونکہ طنز ایک سنجیدہ مقصد لیکر برآمد ہوتی ہے۔۔۔۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیہ میں طنز کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ محض ایک ''سہارے'' کا کام دیتی ہے'' ۴۰

''رکھ رکھاؤ'' کے عنوان کے تحت امامن مہری اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتی ہیں: ''کہو بڑی بی تم کچھ جوان جہان تو ہو نہیں جو تمہارا ڈیل ڈول تمہاری چال ڈھال تمہارے شہد بھرے رسیلے دیدے دیکھ کے راہ چلتو گبرو رنچھیں گے اور آبرو میں بٹا لگے گا۔ پھر اکیلی ہو کر کوئی بیٹی بیاہنے کو نہیں جو باہر نکلتے دیکھ کے دنیا تھوکے گی کہ بی منگلانی صاحب اب گلیوں کی خاک چھانتی پھرتی ہیں' لے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ دو پیسے کے پان منگانا ہیں تو بیچاری آس لگائے کنواڑا تاک رہی

---

۳۹ ''کشکول'' صفحہ ۵۳۲
۴۰ ''انشائیہ کے خدوخال'' وزیرآغا' صفحہ ۱۰

ہیں۔کوئی آئے تو منکائیں'' ۱؎

یہاں ہلکے پھلکے طنز سے امامن مہری نے رکھ رکھاؤ کے نقصانات واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔اس مضمون میں طنز کے تیر ونشتر کی بارش نہیں کی گئی اور نہ ہی یہ کوئی طنزیہ مضمون ہے۔ یہاں صرف طنز کا سہارا لے کر یہ بات سیدھے سادھے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ پختہ عمر کی بی مغلانی اگر برقعہ اوڑھ کر جا کے پان لے آئیں تو کیا مضائقہ ہے۔اب اس پرانی وضعداری کی کیا ضرورت ہے جو کسی زمانے میں باہر نکلنے میں حائل تھی۔ایک دوسرے مضمون ''خیر خیرات'' میں امامن مہری یوں کہتی نظر آتی ہیں:

''امیر امرا کو دیکھو آپ جا کے ہوٹل میں تھوتھو گوڑا ڈھیروں کا لا پانی ڈھکوس جاتے ہیں' تو کچھ نہیں۔ موئے بد مہری (سور) کے بچے خونستے ہیں تو کچھ نہیں۔ ہزاروں روپیہ گھوڑ دوڑ میں' تاش میں ہارتے ہیں تو کچھ نہیں۔ل ادھر کسی نے ہاتھ پھیلا کے کہا ''اللہ بھلا کرے'' بس لگے وکیل کی طرح جراں (جرح) کرنے اور سات پشتوں کا حال پوچھنے'' ۲؎ یہاں بھی انتہائی ہلکے طنز سے کام لے کر اس نکتے کی وضاحت کی گئی ہے کہ پیسے والے لوگ خود تو ہزار قسم کی فضول خرچیاں کرتے ہیں مگر کسی غریب کو خیرات دیتے ہوئے مختلف قسم کے آڑے ترچھے سوالات کی بوچھار کر دیتے ہیں اور دیتے دلاتے کچھ نہیں۔ تمام مضامین میں جا بجا ہلکے طنز کے نمونے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔مگر مضمون کے آخر میں قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے زندگی کے کسی مخفی گوشے پر روشنی کا ایک نیا پرتو دیکھا ہے۔ان مضامین کے بارے میں صلاح الدین احمد نے غالباً لفظ ''طنزیہ'' اس وجہ سے استعمال کیا ہے کہ شاید اس زمانے میں انشائیہ کا موجودہ تصور نہ تھا۔ یہ طنزیہ مضامین ہرگز نہیں ہیں۔ان میں طنز کے ساتھ ساتھ حظ اور مزاح کے عناصر بھی جا بجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں' مثلاً:

''ایک منشی جی مولوی گنج میں رہتے تھے' کہیں کچہری میں نوکر تھے ہمارے ہی ادھر سے روز کچہری جاتے تھے۔ ادھر سڑک کے مہتر نے ان کی جھلکی دیکھی اور ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔ ''کھدا سلامت رکھے' ہمارے ڈپٹی صاحب کو''۔منشی جی اتنا کہنے پر پھول کے کپا ہو جاتے تھے۔ کچھ دنوں بعد منشی جی نے محلہ چھوڑ دیا۔ دوسرے محلے میں اٹھ گئے۔ایک دن اچانک ہماری طرف سے جاتے تھے' جیسے ہی موڑ سے گھوسے ادھر سے آتا تھا مہتر بس لڑ ہی تو گئے۔مزا سنو کہ مہتر لئے جاتا تھا اپنا کھانا۔ٹکر جو لگی تو دال بہہ نکلی۔ چھوٹتے ہی کہنے لگا ''اجی اندھے ہو گئے ہو''۔ میں بولی ارے برجا یہ کیا' ڈپٹی صاحب ہیں۔کہنے لگا ایسے ڈپٹی بہت دیکھے ہیں۔کوئی اب وہ یہاں تو رہتے نہیں جو میں دباؤ سہوں'' ۳؎

۱؎ ''کشکول''، صفحہ ۵۱۰ ۲؎ ایضاً، صفحہ ۵۴۴ ۳؎ ایضاً، صفحات ۵۱۴ تا ۵۱۵

نہ یہ کوئی لطیفہ ہے اور نہ ہی قہقہہ لگانے کا سامان' بلکہ مزاحیہ پیرائے میں ایک واقعہ بیان کر کے یہ نکتہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ چڑھتے سورج کی پوجا تو سب کرتے ہیں مگر غروب شدہ آفتاب کو کون دیکھتا ہے؟ چودھری صاحب نے ان مضامین میں مزاح نگاری کے جواہر نہیں دکھائے بلکہ مزاح کا سہارا لیکر زندگی کے کئی مخفی گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ اور یہی ایک اچھے انشائیہ کی خصوصیت ہے۔ محض مزاح سے سطحیت پیدا ہوتی ہے اور بات لطیفہ گوئی' بذلہ سنجی سے آگے نہیں بڑھتی۔ مزاحیہ مضمون میں بات قہقہہ لگانے اور ہنسنے ہنسانے میں گم ہو جاتی ہے۔

وزیر آغا مقالے سے مقابلہ کرتے ہوئے انشائیہ کی مزید خصوصیات یوں بیان کرتے ہیں: ''انشائیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی ''عدم تکمیل'' ہے۔۔۔۔ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے لیکن اس مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں جن کا بظاہر موضوع سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔۔۔ انشائیہ کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچکیلا ہوتا ہے۔۔۔ انشائیہ میں ایک مرکزی خیال کے باوصف دلائل کا کوئی منضبط سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا'' ۴۴

''امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات'' کے زیرعنوان پانچوں مضامین کو کسی بھی صورت سے مقالے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نہ ان میں سنجیدگی ہے اور نہ مقالے کی سنگلاخی کیفیت موجود ہے۔ کوئی بھی مضمون ایسا نہیں جس میں موضوع زیر بحث کے تمام تر پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہو۔ اور تحلیل' تجزیہ اور دلیل سے کسی بنیادی نقطہ نظر کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہو کہ ایک مکمل و جامع صورت حاصل ہو گئی ہو۔ برخلاف اس کے ہر ایک مضمون تکمیل کی حد سے عاری ہے۔ امامن مہری نے اپنی بساط کے مطابق واقعات بیان کر کے اور ذاتی مشاہدات پر گفتگو کر کے موضوع زیر بحث پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں تحلیل' تجزیہ اور دلیل کی کوئی سنجیدگی نہیں ہے۔ عام گفتگو سے کام لیا گیا ہے' جہاں موضوع کی مرکزیت تو قائم ہے مگر جا بجا اس مرکزیت کا سہارا لے کر متعدد ایسی باتیں کہی گئی ہیں جن کا بظاہر موضوع سے کوئی گہرا تعلق نہیں' مثلاً:

امامن مہری ''ایمان داری بہترین دور اندیشی ہے'' کے عنوان کے تحت گفتگو کرتے کرتے ایک جگہ یوں گویا ہوتیں ہیں: ''آخر لوگوں کے کہنے سننے سے دوسرا نکاح کیا۔ پھونکا پڑے اس نکاح میں نگوڑا خصم دل کا زخم۔ ہر شے بدگمانی' آشنائی تو ناک پر رکھی رہتی۔ کسی سے ہنسو نہیں بولو نہیں۔ لے میں کوئی پردے کی بو بوتو ہوں نہیں۔ باہر نکلنے والی پچاس دوست دس ملاقاتی۔ سارا زمانہ تو امامن مہری کو جانتا ہے کس کس سے رکھائی (بے رخی) کروں' پھر جب انسان ملتا جلتا ہے تو ہنستا بولتا بھی ہے۔ دل لگی مزاخ (مذاق) سب ہی کچھ ہوتا ہے'' ۴۵

---

۴۴ ''انشائیہ کے خدوخال'' وزیر آغا' صفحہ ۱۱

۴۵ ''کشکول'' صفحہ ۵۰۵

بظاہر اس موضوع کا ایمان داری اور بے ایمانی سے کوئی تعلق نہیں ۔ چودھری محمد علی نباضِ فطرت ہیں ۔ انہیں معلوم ہے کہ عورت فضول کو ہوتی ہے' وہ گفتگو کرتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں ضرور کر جاتی ہے ۔ یہاں امامن مہری ایک جگہ ایمانداری کا پرچار کرتے ہوئے تلخ گفتگو کر جانے پر ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں اور دوسری ملازمت شروع کرنے کا جواز تلاش کرتے ہوئے یہ تمہید باندھتی ہیں ۔

اسی طرح ایک دوسرے مضمون میں ''خیر خیرات'' پر گفتگو کرتے ہوئے امامن مہری یوں لب کشا ہوتی ہیں: ''پھر اب تو جیل خانے کی ہوا کھانا بھی برائی نہیں ۔ وہی جو کہتے ہیں بھلا سا نام ہے مہاتما گندھی کی بدولت سینکڑوں اچھے اچھے بھلے آدمی جیل خانے گئے ۔ جیل خانہ سے نکلے تو اللہ دے بندہ لے جیسے نصیب کھل گئے ۔ اللہ اکبر اللہ اکبر کہتے لوگ پیچھے ہوئے جلوس نکلا ۔ کئی آدمی جن کو زمانے بھر میں کوئی پوچھتا نہ تھا' گھر بیٹھے روٹیوں سے لگ گئے کنچن برسنے لگا'' ۴۶ بظاہر اس موضوع کا ''خیر خیرات'' سے تو تعلق نہیں' بس رواروی میں یہ بات منہ پر آ گئی ۔ اسی طرح ہر مضمون میں جا بجا غیر متعلق باتیں کہی گئی ہیں ۔

متذکرہ انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چودھری صاحب نے موضوع کے صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے ۔ جو ان کے شخصی ردِعمل سے اثر پذیر تھے اور جن کی نکیلی کیفیت اس بات کی متقاضی تھی کہ ان کو قاری تک پہنچایا جائے لیکن اہم بات یہ تھی کہ یہ سارے مشاہدات انہوں نے انتہائی خوبصورتی سے ایک نجلی ذات کی ملازمہ کے اندر جھانک کر حاصل کئے ۔ یہاں صرف چند انوکھے پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے اور بہت سے دوسرے تشنہ اور نامکمل حالت میں رہ گئے ہیں ۔ چودھری صاحب نے کمالِ ہوشیاری سے ہر مضمون کو اس طرح ختم کیا ہے کہ قاری اس میں بکھرے ہوئے بہت سے اشارات کا سہارا لے کر خود بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔

انشائیہ کی ایک اور خصوصیت جو وزیر آغا نے بیان کی وہ اس کا اختصار ہے ۔ چودھری محمد علی ردولوی کی ''کشکول'' نامی کتاب میں تیسری بار طبع شدہ انشائیہ ۱۵ x ۹ سینٹی میٹر کے طول و عرض کے حامل چھوٹے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں ۔ پہلا انشائیہ ۱۰ صفحات پر' دوسرا ۹ صفحات پر' تیسرا ۱۰ صفحات پر' چوتھا ۱۴ صفحات پر اور پانچواں ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اور انہیں صفحات میں مختصر طریقے سے چودھری صاحب نے قاری کو تصویر کا ایک مخصوص رخ دکھایا ہے' یعنی نچلے طبقے کی ملازمہ کے جذبات اور احساسات ۔ اختصار کے باوجود مضمون کا پس منظر ہمیشہ شاداب رہا ہے ۔ چودھری صاحب کا ذہن بڑا زرخیز تھا

---

۴۶ ''کشکول'' صفحہ ۵۵۱

اوران کے پاس لکھنے کو یقیناً بہت کچھ تھا مگر انہوں نے ان مضامین کی محدود سی دنیا میں اما من مہری کی طرف سے سوچے گئے اپنے احساسات اور تخیلات کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے جو یقیناً ایک قابلِ قدر کاوش ہے۔

ایک اور خصوصیت جسے وزیر آغا نے انشائیہ کا بنیادی وصف تسلیم کیا ہے اس کی تازگی ہے۔ چودھری صاحب کے انشائیوں میں محض اظہار و ابلاغ کی تازگی نہیں ملتی بلکہ موضوع اور نقطہ ہائے نظر کا وہ انوکھا پن بھی ملتا ہے جو قاری کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا از سرِ نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔ زندگی کی چند انوکھی اور تازہ کیفیات کا احساس دلانے کی غرض سے چودھری صاحب اپنی انتہائی بلند تعلقہ دارانہ سطح سے نیچے اترے اور ایک نچلی ذات کی ملازمہ کے قلب میں داخل ہو گئے۔ اس سطح سے بلندی پر پائی جانے والی زندگی کے بظاہر اعلیٰ اور بلند مظاہر کی پستی کا تصور پیش کیا گویا ایک شریر آئینے میں سے ماحول کے چند بگڑے ہوئے مناظر دکھائے۔ ان مناظر کی تازگی آج بھی اس قدر برقرار ہے کہ سوائے پیسوں کے حساب کتاب، اشیاء کی قیمتوں اور چند مخصوص مناظر کے آج کے پڑھنے والے کے ذہن میں بھی سارا منظر اسی طرح کھنچ جاتا ہے، جیسے ابھی ابھی رونما ہوا ہو۔ اور اس طرح چودھری محمد علی ردولوی کے گذشتہ صدی کے پہلے نصف میں تحریر کردہ یہ مضامین آج بھی اعلیٰ نمونے اور بلند اقدار کے انشائیہ کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں وہ ساری خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں جن کی نشان دہی وزیر آغا نے اپنی کتاب ''انشائیہ کے خدوخال'' میں ایک اچھے انشائیہ کے لئے تحریر کی ہیں۔

۶۔ چودھری صاحب کے انشائیوں کے موضوعات:۔

جیسا کہ پہلے بھی تحریر کیا جا چکا ہے کہ چودھری محمد علی کوئی بڑے انشائیہ نگار نہیں تھے اس زمانے میں انشائیہ کا موجودہ تصور بھی نہ تھا۔ یہ تو چودھری صاحب کے بلند پایہ ذہن نے Barry Pain کی ایک کتاب سے متاثر ہو کر پانچ مضامین لکھ ڈالے جنہیں آج ہم بلند پایہ انشائیوں کی فہرست میں شامل کر لیتے ہیں۔ یہ مضامین ''فلسفیانہ خیالات'' کے عنوان کے تحت لکھے گئے مگر ان میں فلسفہ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ نہ ارسطو کا ذکر ہے نہ افلاطون کا تذکرہ اور نہ ہی بقراط کا۔ ایک نچلے طبقے کی جاہل ملازمہ کیا فلسفہ بگھار سکتی ہے؟ طنزیہ طور پر اس کے خیالات کو فلسفہ کا نام دیا گیا ہے۔ ایک بات اور بھی ہے کہ اس کے خیالات سن کر آپ کی فکری صلاحیت بیدار تو ہوتی ہے اور آپ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے چودھری صاحب نے انہیں ''فلسفیانہ خیالات'' کا نام دیا ہے۔

چودھری صاحب نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہ بہت چھوٹے چھوٹے موضوعات ہیں جو ہمارے روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ''ایمان داری'' ''وضعداری'' ''غصہ'' ''کام کاج'' ''خیر خیرات'' وغیرہ۔ ان میں خاص بات کیا ہے' کچھ بھی تو نہیں۔ عام طور پر ہم سب زندگی کے ان مظاہر کو ہر روز دیکھتے دیکھتے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ ہمیں ان کے بہت سے نکیلے کنارے نظر نہیں آتے اور یہ سب ہمارے ردِعمل کا قصور ہے۔ یہاں پر چودھری صاحب نے ہمیں ایک لمحہ کے لئے روک کر زندگی کے عام مظاہر کے ایسے تازہ پہلو دکھائے ہیں جنہیں ہماری نظروں نے اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا اور جو ہمارے لئے گویا موجود ہی نہ تھے۔ مثلاً:

''اے ہاں کوئی اونٹ چرانے سے رہا۔ یہی انگل دو انگل کی چیز۔ پھر اس کے لئے صندوق پٹارے کی کیا درکار ہے۔ میں کہتی ہوں اگر عورت دوہرے پنڈے کی بھاری بھرکم ہو تو شلوکے میں اللہ جھوٹ نہ بلوائے' گز دو گز کپڑا رکھ لے کیا مجال کوئی چرچ تو جائے مگر اس کے لئے سلیقہ چاہئے۔ اس طرح رکھے کہ دکھائی نہ دے' یا تو بغل کی طرف رکھے نہیں تو بٹن کھول کے کپڑا سینے پر لپیٹ کے اوپر سے شلوکا پہن لے'' ۴۷ یہاں چوری کرنے کے طریقے نہیں بتلائے جا رہے ہیں بلکہ یہ فلسفہ بیان کیا جا رہا ہے کہ ایک غریب ملازمہ کے لئے چھوٹی موٹی اشیاء چرانا ضرورت میں شامل ہے' لیکن اس کے اوپر ایمان داری کا بھرم قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ کتنی عام سی بات ہے مگر اس کے نکیلے کنارے کس خوبصورتی سے دکھائے گئے ہیں۔

چودھری صاحب کسی جامعہ کی فارغ التحصیل سند نہ رکھنے کے باوجود بڑا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ طبیعت نہ مانی سائنس کو بھی لے آئے مگر ایک جاہل عورت کے منہ سے کس طرح ادا کروایا ہے: ''مدرسے میں ایک لڑکا کتاب پڑھ رہا تھا' اس میں لکھا تھا' جس نے ریل نکالی وہ کھانا پکا رہا تھا۔ بھاپ کے زور سے ہنڈیا کی ڈھکنی جو اوچھلی تو اس کے دل نے کہا او فوہ بھاپ میں اتنی طاقت ہے' اے لو بس اتنی سی بات پر اس نے ریل بنا ڈالی۔ یہ سب عقل کا کھیل ہے عقلوند (عقلمند) کی دور بلا'' ۴۸

سیاست کو خاص طور پر مردوں کی زندگی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ پڑھے لکھے ملازم پیشہ افراد کے علاوہ نائی' دھوبی' بھنگی' پرچون فروش الغرض کوئی ایسا نہیں ہے جو روزمرہ کی سیاست میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ لہٰذا چودھری صاحب اس موضوع کو نہ بھلا سکے گو کہ عورتوں کو عمومی طور پر سیاسی موضوعات سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی مگر چودھری صاحب نے اس جاہل عورت سے بھی اس موضوع پر کچھ نہ کچھ کہلوا ہی دیا: ''پھر اب تو جیل خانہ کی ہوا کھانا بھی برائی نہیں وہی جو کہتے ہیں بھلا سا نام ہے

---

۴۷ ''کشکول'' صفحات ۵۰۲ تا ۵۰۳ ۴۸ ایضاً' صفحہ ۵۴۰

مہاتما گندھی کی بدولت سینکڑوں اچھے اچھے بھلے آدمی جیل خانہ گئے۔جیل خانہ سے نکلے تو اللہ دے بندہ لے جیسے نصیب کھل گئے۔اللہ اکبر اللہ اکبر کہتے لوگ پیچھے ہوئے جلوس نکلا۔کئی آدمی جن کو زمانے بھر میں کوئی پوچھتا نہ تھا گھر بیٹھے روٹیوں سے لگ گئے کنچن برسنے لگا''۶۹ (یہ اقتباس ۲۶ کے تحت پہلے بھی تحریر کیا جا چکا ہے)۔ یہاں کسی سیاسی پہلو پر تنقید یا تبصرہ کرنا مقصود نہ تھا بلکہ خیرات کا تذکرہ کرتے ہوئے روا روی میں مفت کی اس روزی کا تذکرہ آ گیا لیکن بہت ہی انوکھے انداز سے' اور ساتھ ہی ساتھ ایک اہم سیاسی مسئلہ بھی بیان کر دیا۔

مذہب ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے' لہذا اس موضوع پر بھی گفتگو کرنا لازمی ٹھہرا۔ چنانچہ امامن مہری ایک جگہ فرماتی ہیں: ''پڑوسی مولوی صاحب کو دیکھو باہر سے کسی نے پکارا' مولوی صاحب ذری باہر تشریف لایئے۔ مولوی صاحب نے اٹھائی تسی (تسبیح) آنکھیں بند کیں استخارہ دیکھا دو دانے آئے اب ایک ایک سے کہتے ہیں ''کہہ دو اس وقت نہیں ہیں''۔ جب اس نے کہا کہ اچھا کہہ دینا بندہ حسن آیا تھا نواب موہم علی خان (محسن علی خاں) کے یہاں سے عاقبتی جوڑا لایا تھا۔اے جوڑے کا نام سنتے ہی مولوی نے جھٹ کنٹھا اٹھایا اور دانے ادھر ادھر پھرا کے بول اٹھے' ٹھہرو بھئی میں آتا ہوں۔اس وقت سونے لیٹا تھا' لڑکے نے کہہ دیا گھر میں نہیں ہیں''۷۰ مذہب کو نشانہ تنقید نہیں بنایا جا سکتا مگر مذہب کے ٹھیکیداروں کی تو کردار کشی کی جا سکتی ہے۔لہذا کسی کام چور اور کاہل مولوی کی نفسیات یوں بیان کی گئی ہے۔

اسی طرح روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے بے شمار چھوٹے بڑے مسائل کو جو اس نچلی ذات کی عورت کو پیش آ سکتے ہیں چودھری محمد علی نے اپنا موضوع قلم بنایا ہے۔کسی کو لطیفہ کی صورت میں بیان کیا ہے تو کسی پر کوئی واقعہ تحریر کر دیا ہے' کسی پر طنزیہ گفتگو کی ہے' تو کسی کو مزاحیہ پیرائے میں لکھ دیا ہے۔گو کہ چودھری صاحب کوئی مستند شاعر نہ تھے مگر انہیں شعر و شاعری سے خاصہ شغف تھا لہذا ایک جگہ اس جاہل عورت سے اس کے ذوق کے مطابق ایک شعر بھی کہلوا دیا۔

عجب تیری قدرت عجب تیرے کھیل

چھچھوندر لگائے چنبیلی کا تیل ۷۱

تمام باتیں اس طرح تحریر کی گئی ہیں کہ انتہائی فطری محسوس ہوتی ہیں۔کہیں بھی ایسا نہیں لگتا کہ چھوٹے منہ سے بڑی بات کہلوائی گئی ہو۔ چھانٹ چھانٹ کر ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو اس طرح کے طبقے میں عام طور پر مستعمل ہیں۔

---

۶۹ ''کشکول'' صفحہ ۵۵۱ ۷۰ ایضاً' صفحات ۵۳۲ تا ۵۳۳ ۷۱ ایضاً' صفحہ ۵۳۷

۷۔ چودھری محمد علی کی انشائیہ نگاری کا اسلوب:

چودھری محمد علی کی سب سے بڑی کمزوری عورت تھی' لہذا انشائیہ تحریر کرتے ہوئے انہوں نے عورت کا ہی روپ دھارا ہے۔ لیکن اپنے طبقے اور اپنے برابر والی عورت کا نہیں بلکہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی غریب ملازمہ کا۔ شاید اس وجہ سے کہ نچلا طبقہ غریب ہے' محکوم ہے' دبا ہوا' پسا ہوا اور ستم رسیدہ ہے۔ اس کے احساسات زیادہ کرب ناک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایسے طبقے کے احساسات کی عکاسی کرنا زیادہ بہتر سمجھا۔ ان کے اسلوب کی بنیادی خصوصیت تو یہی ہے کہ انہوں نے ہر جگہ اسی کی زبان استعمال کی۔ چھانٹ چھانٹ کر اس کے روزمرہ کے عام الفاظ استعمال کئے جو شاید عام اردو داں طبقے کے لئے نافہم ہوں' مثلاً:

''گیگی بھی بی مگلانی ایسی تھیں کہ بچاری منہ سے دو رہونٹ کھولنا نہیں جانتی تھیں۔ سودے والے سے سودا لیا' اس نے ڈنڈی ماری اور چپکی کھڑی دیکھ رہی ہیں گویا للو (زبان) کو کوا لے گیا' یہ نہیں کہتیں کہ ایسے کے تیسے! تو نے یہ کون سی تول تولی ہے' کہنے کو اتنی بڑی سرکار میں رہیں مل عقل نہ آئی۔ بھاڑ میں جائے ایسا رکھ رکھاؤ۔ پھر وجاداری (وضعداری) یہ کہ بی ام صاحب کے نند وئی نے کئی مراتبے (مرتبہ) بلایا' بی مگلانی تم ہمارے ہیاں چلی آؤ۔ جیسے بھابھی صاحب کا گھر ویسے میرا گھر وہ اللہ کی بندی جم کا دیا ہوگئی' ایک نہیں ہزار نہیں نہ جانا تھا نہ گئیں۔ کہو کیا دے دیا رکھ رکھاؤ نے' بوڑھا پا ایڑیاں رگڑتے رگڑتے کٹا''۔۲؎ یہاں پر کسی بی مغلانی کے رکھ رکھاؤ سیدھے پن اور وضعداری کے اوصاف کو بیان کیا گیا ہے۔ اور مقصد رکھ رکھاؤ کے نقصانات کو واضح کرنا ہے۔

غصہ' جوش اور جذبہ کی کیفیات واضح کرنے کے لئے کچھ یوں نقشہ کھینچا گیا ہے: ''ایک تھی کبڑن ایک تھی کھنکن' دونوں میں ہوئی جھوم جھانا مار کٹائی' دونوں آم بیچ رہیاں تھیں۔ اتنے میں ایک جنا گاہک آیا' یہ کہتی تھیں میرے آم اچھے وہ کہتی تھی میرے آم اچھے لے بھئی یہ تو بزار ہے۔ سب چاہتے ہیں ہم گاہک توڑ لیں' اس میں لڑائی بھڑائی کا ہے کی۔ مل بات جب بڑھ جاتی ہے تو پھر جبے (جذبے) میں کچھ بھائی نہیں دیتا۔ بس چلو مقدمہ کھڑا ہوگیا۔ دونوں کا منہ مالم دیتا تھا بلیوں نے نوچا ہے سوچ پھول کے تو بڑا ہوگیا تھا۔ کسی کی کرتی نچ گئی تھی تو کسو کے لہنگے میں لبیر (شگاف) اور ڈوپٹے تو دونوں مرداروں کے گلہری کا گودڑ ہو گئے تھے' موتی باندھنے کی جگھوں (جگہ) نہ تھی''۔۳؎ یہ نقشہ کھینچنے کی غرض سے امامن مہری کے مونہہ سے ادا کی جانے والی زبان کس قدر موزوں اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۲؎ ''کشکول'' صفحات ۵۱۱ تا ۵۱۲

گفتگو میں روانی بھی ہے اور تسلسل بھی پایا جاتا ہے۔ کسی مخصوص موضوع کی وضاحت کے لئے جا بجا مختلف لوگوں کے حالات اور واقعات کا سہارا لیا گیا ہے مثال کے طور پر مذکورہ بالا واقعہ میں لڑائی کی منظر کشی کچھ اس طرح سے کی گئی ہے: ''کبڑیے کی مہریا (جورو) نے پہلے کھٹکن کا لہنگا پکڑ کے جھراٹا مارا' بیچ بجار میں بچاری ننگی ہوگئی۔۔۔۔ کبڑن کے باجو (بازو) پر بڑا سا چکتا (نشان) بنا ہوا تھا۔ گوری کنجڑن کنیا نے بھر زور چکٹ لگائی تھی۔ دونوں کے جھنڈے (بال) ویران چونی چوہیا کی دم' لٹیں پھر پھراتی ہوئی حق حیران'' ۴ۓ یہاں پر استعمال کئے جانے والے الفاظ نے عبارت کو دلچسپ بنا دیا ہے۔

کورٹ کچہری تو کم وبیش سب نے ہی دیکھی ہوتی ہے۔ اگر وہاں جانا نہ ہوا ہو تب بھی فلم یا ٹیلی ویژن میں ایسا منظر ضرور دیکھنے کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ امامن مہری کورٹ کچہری کا نقشہ کچھ اس انداز سے کھینچتی ہیں: ''نٹوں کی قلابازی' کٹ پتلی کا کھیل اتنا نہیں بھاتا جتنا مقدمے بازی میں جی لگتا ہے۔۔۔۔ نہ ٹکٹ کا جھگڑا بکھیڑا نہ تمبو قناتوں کا نجیڑا۔ پھر قسم قسم کی باتیں' گواہوں کی گھبراہٹ' منشیوں کے اینچ پیچ' تل پھوٹتے اپنے دوزخ بھرنے کی فقر (فکر) وکیلوں کا چکیا گھمر گھمر کر کے اپنی کالی کالی پشوازوں (عباؤں) کا گھمانا جیسے شیرازی قبوتر (کبوتر) ڈربے میں گونجتا ہے۔ تکھار تکھار کے گواہوں سے پوچھنا''۔ ۵ۓ یہاں ادا کئے جانے والے الفاظ بھی غور طلب ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جاہل عورت نے کورٹ کی کارروائی کو کس نظر سے دیکھا ہے۔

امراء اور رؤسا کی زندگی بغیر کسی کام کاج کے کس آرام سے گذرتی ہے؟ ذرا اس کا حال امامن مہری سے تو سنیئے: ''یہ تو امیر امراء کے لئے ہے کہ مزے سے مسند پر بیٹھے حکومت کرتے ہیں۔ بارہ بجے دن کو آرام کر کے اٹھے پیچوان بھرا رکھا ہے۔ دو گھونٹ پیئے پھر چوکی پر گئے قبضیت (قبض) کے مارے تین گھنٹے کا نکھے کونکھے۔ پھر دس گھڑے پانی سے آبدست لیا۔ چوکی پر سے آئے تو گھنٹہ بھر منہ دھویا۔ اے لو اتنے میں دسترخوان بچھ گیا۔ خاصہ نوش کیا۔ ہاتھ دھوئے گلوری کھائی۔ چوسر بچھ گئی۔ مصاحب جمع ہوئے' شاموں شام تک پو بارہ اور تین کانے ہوتے رہے۔ اتنے میں سواری لگ گئی' سوار ہو کے ہوا کھانے چلے گئے۔ گھومتے گھامتے آٹھ بجے رات کو آئے' شام کا دربار لگا۔ داستان قصے کہانیاں ہوئیں یا ناچ مجرا گانا بجانا ہوا کیا۔ بارہ بجے دسترخوان چنا گیا' خاصہ نوش کر کے آرام کیا۔ بھلا ہم غریبوں کو یہ دن کہاں نصیب'' ۔ ۶ۓ تعلقہ دار ہوتے

۳ۓ ''کشکول'' صفحات ۵۲۴ تا ۵۲۵ ۴ۓ ایضاً' صفحہ ۵۲۵ ۵ۓ ایضاً' صفحہ ۵۲۲
۶ۓ ایضاً' صفحہ ۵۳۰

ہوئے چودھری صاحب یقیناً اپنی اور اپنے جیسے دیگر رؤسا کی زندگی سے تو بخوبی واقف ہونگے۔لیکن انہوں نے یہاں اپنی زندگی کو امامن مہری کی نظروں سے دیکھا ہے اور بخدا بہت ہی صحیح طور پر دیکھا ہے۔خاص بات یہ ہے کہ جابجا محاورے بھی وہی استعمال کئے ہیں جو اس طبقے کی زبان کا خاصہ ہیں۔

چودھری محمد علی ردولوی کے تحریر کردہ ان انشائیوں کے اسلوب میں لطافت اور شگفتگی ایسی کہ مزاح کی بھرمار نہ ہونے کے باوجود بھی تحریر فرحت بخش محسوس ہوتی ہے۔چودھری صاحب نے ان مضامین کو اردو معلیٰ میں تحریر نہیں کیا۔اگر کوئی شخص یہاں استعمال کی جانے والی زبان سے زیادہ واقف نہ ہو تب بھی وہ اس کے لطیف اسلوب کی مخصوص حسن کاری سے متاثر ضرور ہوگا۔اور مضمون کو آخر تک پڑھنے پر مجبور ہوگا۔جیسا کہ اس سے پیشتر تحریر کیا جا چکا ہے کہ قاری کو ان مضامین میں لطافت، شگفتگی اور حسن لطیف کے علاوہ رمز و ایما، غیر رسمی انداز اور خوش طبعی وغیرہ کے نمونے ضرور ملینگے جن کے امتزاج سے ان کے اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے۔دورِ جدید کے نقاد انشائیہ کے اسلوب کو جس باریک بینی سے پرکھتے ہیں۔اس سے قطع نظر چودھری صاحب کے تخلیق کردہ یہ قدیم مضامین انشائیہ کے بہترین نمونے محسوس ہوتے ہیں۔

باب ششم

چودھری محمد علی ردولوی بحیثیت مزاح نگار

۱۔ مزاح نگاری کا پس منظر:۔

ادب کا تعلق انسانی زندگی سے ہے اور مزاح انسانی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس لئے انسانی معاشرے میں اس کا وجود انسانی تاریخ کے آغاز ہی سے ملتا ہے۔ کسی بھی زبان کے ادب میں اعلیٰ درجے کا مزاح اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک اس زبان کے بولنے والے اپنے ماحول کی خصوصیات اور اپنے سماج کے بارے میں اتنا شعور اور آگہی حاصل نہ کرلیں کہ اس کی کمزوریوں اور ناہمواریوں سے محظوظ ہوسکیں۔

اردو میں مزاح کے ابتدائی نقوش اس وقت ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں جب یہ زبان اپنی شناخت پیدا کرنے میں کامیاب ہوچکی تھی۔ اس کے بولنے والے شعور کی منزلیں طے کررہے تھے۔ یہ ادب کا ابتدائی دکنی دور تھا۔ مزاح کی تاریخ کا جائزہ لینے کے لئے اسے دو حصوں میں تقسیم کرلینا بہتر ہوگا۔ نمبر۱: بیسویں صدی کے آغاز سے قبل اور نمبر۲: بیسویں صدی کے آغاز کے بعد۔ بیسویں صدی کے آغاز سے قبل مزاح کے بارے میں دو نظریات پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک نظریہ تو یونان کے مفکر ارسطو اور سترھویں صدی کے انگریز مفکر تھامس ہابز کا ہے اور دوسرا نظریہ جرمن فلاسفر ایمانوئل کانٹ کا ہے جسے شوپنہار نے اپنے نظریے میں سمویا ہے۔ ارسطو کے نزدیک ہنسی کسی کمی یا بدصورتی کو دیکھ کر معرضِ وجود میں آتی ہے مگر ضروری ہے کہ کمی یا بدصورتی دردانگیز نہ ہو۔ سترھویں صدی عیسوی میں ہابز نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہنسی جذبہ افتخار اور احساس برتری کے سوا کچھ نہیں جو دوسروں کی کمزوریوں یا اپنی گذشتہ خامیوں سے تقابل کے باعث وجود میں آتی ہے۔ بنیادی طور پر ان دونوں نظریات میں کچھ خاص فرق نہیں ہے۔

ہنسی کے متعلق دوسرا نظریہ ایمانوئل کانٹ کا ہے جس کے مطابق کوئی چیز اس وقت نمودار ہوتی ہے جب کوئی چیز ہوتے ہوئے رہ جائے اور ہماری توقعات اچانک ایک بلبلے کے مانند پھٹ کر ختم ہوجائیں۔ تقریباً اسی دوسرے نظریے کا علمبردار شوپنہار ہے جس کے مطابق ہنسی تخیل اور حقیقت کے مابین ناہمواری کے وجود کو اچانک محسوس کرلینے سے جنم لیتی ہے۔ میکس ایسٹ مین نے ارسطو اور کانٹ کے ان بظاہر متضاد نظریات کی ایک اچھوتے انداز سے توضیح کی تھی اور بتایا کہ یہ دونوں نظریے اپنی اپنی جگہ ہنسی کو سمجھنے میں ہمارے معاون ہیں۔

مزاح کے بابت بیسویں صدی کے آغاز سے قبل جن مفکرین نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں Herbert Spencer ' Joseph Addison ' Alexander Bain اور Theodor Lipps کے نام خاصے اہم ہیں۔ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی پروفیسر سلی نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف An Essay on Laughter میں بیسویں صدی سے قبل کے دونوں نظریوں کو یکجا کیا اور چند نئے قابلِ قدر نکات بھی پیش کیے۔ اس سلسلے میں پروفیسر سلی نے مجموعی طور پر ہنسی اور مذاق کی قرابت پر خاصہ زور دیا ہے۔ وہ ہنسی کے محرکات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ ہنسی مسرت کے اس اچانک سیلاب سے وجود میں آتی ہے' جو کسی بیرونی دباؤ کے ہٹ جانے یا کسی غیر متوقع شے کی اچانک آمد سے پیدا ہوتا ہے جو ہمیں یکا یک زندگی کے ایک بلند مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ پروفیسر سلی کی اس کتاب کے فوراً بعد مزاح پر دو نہایت گراں قدر کتابیں منصۂ شہود پر آئیں جن کی بدولت مزاح کے مسئلے پر اس قدر روشنی پڑی جو اس سے پہلے کی تحقیقات سے کبھی نہیں پڑی تھی۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ہنری برگساں کی کتاب ''ہنسی'' Laughter اور سگمنڈ فرائڈ کی کتاب

(Wit and Its Relations to the Unconsciousness)

برگساں نے لکھا ہے کہ حرکت اور لچک انسانی زندگی کی خصوصیات ہیں' مگر جب یہ کسی مقام پر ٹھہراؤ' جمود اور میکانکی عمل کا نقشہ دکھائیں تو ہنسی کو تحریک ملتی ہے۔ مثال کے طور پر سرکس کا مسخرہ فرضی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دھڑام سے گر جاتا ہے تو ہم بے اختیار ہنس دیتے ہیں۔ برگساں کے نزدیک ہنسی خاص ذہنی عمل ہے اور ترحم کے جذبات کی ہلکی سے رو بھی اسے ختم کر دیتی ہے۔

سگمنڈ فرائیڈ نے مزاح کی چار قسمیں پیش کی ہیں۔ نمبر۱: بے ضرر لطائف' نمبر۲: افادی لطائف' نمبر۳: مضحک' نمبر۴: خالص مزاح۔ بے ضرر لطائف کا مقصد الفاظ اور افکار کی جادوگری سے سامانِ انبساط پہنچانا ہوتا ہے۔ افادی لطائف وہ ہیں جو طریق کار تو وہی اختیار کرتے ہیں جو بے ضرر لطائف کا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ کسی جنسی یا تشدد آمیز خواہش کی بھی تسکین کرتے ہیں۔ افادی لطائف ان جنسی یا تشدد آمیز خواہشات کو آزاد کرتے ہیں۔ مضحک سے حصولِ مسرت کے متعلق فرائیڈ کہتا ہے کہ یہاں مسرت قوتِ تخیل میں بچت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور آخر میں خالص مزاح کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس سے حصولِ مسرت کو قوتِ جذبات میں بچت کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہنسی کے بارے میں کئی اور نظریات بھی سامنے آئے ہیں۔ مگر اس ضمن میں فرائیڈ کے نظریات نے ہی اکثر و بیشتر بنیاد کا کام دیا ہے۔ فرائیڈ کے بعد مزاح کے مسئلے پر تین قابلِ قدر کتابیں شائع ہوئیں وہ یہ ہیں:

1- Y. T. Greeg - The Psychology of Laughter and Comedy.

2- Max Eastman - Enjoyment of Laughter.

3- Arthur Koestler - Insight and Outlook.

ان میں سے گریک اور آرتھر کوسٹلر کی کتابوں میں فرائیڈ کے نظریات ہی نے بنیادی کام سرانجام دیا ہے۔ گریک نے فرائیڈ کے نظریہ میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ایسٹ مین نے مزاح کی چار قسمیں بتائیں ہیں:

نمبر۱: اشیاء صرف اس وقت مزاحیہ رنگ اختیار کرتی ہے جب ہم خود مزاح کے موڈ میں ہوں۔

نمبر۲: جب ہم مزاح کے موڈ میں ہوتے ہیں تو خوشگوار چیزوں کے ساتھ ساتھ ناخوشگوار چیزیں بھی اچھی لگتی ہیں۔

نمبر۳: ہنسی کھیل کا رجحان بچپن کا امتیازی نشان ہے اور بچوں کی ہنسی' مزاح کو اس کے سادہ ترین انداز میں پیش کرتی ہے۔

نمبر۴: بالغوں میں ہنسی کھیل کا یہ رجحان کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔

مزاح کے تدریجی ارتقاء کو بقول وزیر آغا ایک طوفانی ندی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو آغاز میں پتھروں اور چٹانوں سے سر پٹکتی' شور مچاتی' جھاگ اڑاتی اور بالآخر ایک وسیع' کشادہ اور پرسکون دریا کی صورت اختیار کر لے اور پھر وسیع و بے پایاں سمندر میں مل کر ابدیت سے ہم کنار ہو جائے۔[1] ابتداء میں وحشی انسان کے پاس بلند بانگ قہقہوں کی کمی نہیں تھی' مگر اس کے مزاح میں وسعت و گہرائی کا فقدان تھا۔ اس کا مزاح اس طوفانی ندی کی طرح تھا جو معمولی پتھروں سے بھی ٹکرائے تو شور مچاتی ہے۔ صدیوں کے مد و جزر کے بعد انفرادی آزادی کے تصور نے اپنے پاؤں مضبوط کر لئے ہیں۔ فرد کے قہقہے یا تبسم میں نہ صرف گہرائی اور انفرادیت کی جھلک نظر آنے لگی ہے بلکہ اس کے مزاح میں پہاڑی ندی کی پرشور راگنی کے بجائے پرسکون دریا کی دھیمی لے سنائی دے رہی ہے۔ آج مزاح ایک ایسے مقام پر بھی جا پہنچا ہے جہاں اس نے یاس کے گلے میں باہیں ڈال دی ہیں۔

مزاح کی ایک اور قسم خالص Humour ہے جس کی توضیح Stephen Leacock نے ان الفاظ میں کی ہے کہ مزاح کیا ہے؟ یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔ یعنی مزاح نگار ناہمواریوں کے ردِعمل میں کوئی استہزائی کیفیت پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ ان سے محظوظ ہوتا ہے ان ناہمواریوں کی طرف اس کا زاویہ نگاہ ہمدردانہ ہوتا ہے' اور اپنے تجربے کا اظہار فنکارانہ انداز میں کرتا ہے۔ مزاح اور بزلہ سنجی کے درمیان یہ فرق ہے کہ مزاح ایک کیفیت ہونے کے باعث ادب پارے میں ایک ایسی برقی رو کی طرح سرایت کیا ہوا ہوتا ہے کہ ہم

---

[1] نقوش (ماہنامہ) طنز و مزاح نمبر جنوری' فروری ۱۹۷۱-۷۲ء

جس مقام سے بھی اسے چھوئیں یہ روہمیں محسوس ہوتی ہے۔

بزلہ سنجی کا نمایاں ترین عنصر مزاح ہے تاہم بزلہ سنجی کا رشتہ الفاظ کے ساتھ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ مزاح کے برعکس یہ علیحدہ کر کے بھی دکھائی جاسکتی ہے۔طنز بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور' حساس اور دردمند انسان کے ذہنی ردِعمل کا نتیجہ ہوتا ہے جسے ماحول کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختۂ مشق بنالیا ہو۔اس ردِعمل کے زیرِ اثر پیدا شدہ طنز اپنے ماحول کی سیاسی' سماجی اور معاشرتی بے اعتدالیوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے۔طنز کا استعمال محض تخریب پسندی کی علامت ہی نہیں ہے بلکہ طنز کے نشتر فرد یا سوسائٹی کو مہلک امراض سے نجات بھی دلاتے ہیں' اور یہی اس کا بہت بڑا تعمیری کارنامہ ہے۔رمز Irony کا کامیاب حربہ یہ ہے کہ مبالغہ کے برخلاف ایجاز و اختصار کا سہارا لے کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی جائے۔اس کا طریقہ کار یہی ہے کہ مخالف کے دلائل نظریات اور طریق استدلال کو بظاہر تسلیم کر کے یوں بیان کیا جائے کہ اس کے کمزور پہلو نمایاں ہو کر سامنے آجائیں۔

اردو ادب کی نشو نما میں انگریزی اور فارسی ادبیات کا نمایاں حصہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ مختصراً انگریزی اور فارسی کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کی اہم ترین خصوصیات کا جائزہ لیا جائے۔انگریزی ادب کی نمایاں ترین خصوصیت ''خالص مزاح'' کی ابتداء اور اس کا تدریجی ارتقاء ہے۔اس کی پہلی وجہ تو انگریزی فضا کا وہ گھریلو پن ہے جو اس ملک کی ہر شے پر ایک لطیف دھند کی طرح مسلط ہے۔دوسری وجہ انگریزی خاندان کی وہ انفرادیت ہے جو انگریزی فضا' انگریزی خاندان اور انگریزی ادب میں ایک ''مزاحیہ کردار'' کی صورت میں بھرپور انداز میں موجود ہے۔اور تیسری وجہ سکون و عافیت کی وہ فضا ہے جو بیرونی حملوں اور ملکی انقلابوں سے بڑی حد تک محفوظ رہی۔انگریزی ادب میں طنزیات و مضحکات کا آغاز چاسر سے ہوا۔چاسر کے اشعار میں بلند بانگ قہقہوں کے ساتھ ساتھ لطیف رمز کے بھی نمونے ملتے ہیں چاسر کے بعد انگریزی ادب میں اگلا اہم نام شیکسپیئر کا ہے۔شیکسپیئر ہمارے انگریزی ادب میں ایک روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔طنز مزاح کے ضمن میں اس کے یہاں ایک انفرادی رنگ نظر آتا ہے۔وہ عیوب جوئی' مضحکہ اڑانے اور محظوظ ہونے کے لئے کرتا ہے۔شیکسپیئر کے بعد ملٹن' ڈرائیڈن' پیپس (Pepys) اور بٹلر (Butlar) سامنے آئے۔یہ وہ دور تھا جس میں طنز اور رمز کی فراوانی ملتی ہے۔

سترھویں صدی تجدید کا زمانہ تھا یہ دور طنز کے لئے انتہائی سازگار تھا۔اٹھارویں صدی میں طنز' تحریف اور رمز کی دخل اندازی شاعری کے علاوہ دوسرے اصناف سخن میں بھی ہوئی۔اٹھارویں صدی کے ربع آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں چارلیس لیمب' جین آسٹن نے خالص مزاح کے نقوش نمایاں کرنے میں اہم حصہ لیا۔ان کے یہاں مزاح نسبتاً زیادہ

لطیف اور نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے بعد چارلیس ڈکنسن کے یہاں بے شمار ایسے کردار ملتے ہیں جو کسی نہ کسی ناہمواری کے باعث مزاحیہ رنگ اختیار کرتے ہیں۔ ڈکنسن کے ناولوں میں واقعہ سے پیدا ہونے والا مزاح کردار کے مزاح سے ہم آہنگ ہے اور یہی اس کا انفرادی انداز ہے۔ ڈکنسن کے ساتھ ہی تھیکرے کا نام بھی آتا ہے۔ اس کے مزاح کا مخصوص رنگ یہ ہے کہ وہ مسکراتا ہے' سنجیدہ ہو جاتا ہے اور پھر مسکراتا ہے اپنے شانوں کو جھٹکتا ہے اور زندگی کی بوالعجبیوں کو بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے۔ تھیکرے کے آرٹ میں بڑی حقیقت نگاری ہے۔ انیسویں صدی میں چارلیس ڈکنسن کے علاوہ پی کاک کے ناولوں میں بھی مزاح پایا جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں انگریزی ادب میں خالص مزاح کا رنگ دن بدن نکھرتا چلا گیا اور مزاح طنز کی نشتریت سے آزاد ہو کر ایک بالکل نئی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔

انگریزی ادب کے برخلاف فارسی ادب میں طنز و مزاح کی داستان کسی باقاعدہ تسلسل اور تدریجی ارتقاء سے عاری ہے۔ ایران میں طنز و مزاح کے فروغ نہ پانے کی وجہ اسلامی عہد کی ثقافت ہے' جس میں ہزل آمیز پیرائے اظہار کی گنجائش نہیں۔ اس کے علاوہ وہاں کی سماجی زندگی انتشار قتل و غارتگری اور بیرونی حملوں سے دوچار رہی۔ فارسی ادب میں جو کچھ مزاح پایا جاتا ہے وہ ہنگامی فرار کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں وسیع القلبی اور فراخ حوصلگی کا فقدان نظر آتا ہے۔ فارسی ادب میں مزاح کے تدریجی ارتقاء کے بجائے طنزیہ اور مزاحیہ انداز کے تذکرے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں طنز و مزاح کے پہلے دور پر یہی اثرات نظر آتے ہیں' طنز و مزاح کی پہلی ہجو کی رو ہے۔ اس سلسلے میں رودکی اور فردوسی کے نام قابل ذکر ہیں۔ فارسی زبان میں ہجو پانچویں و چھٹی صدی عیسوی میں نمودار ہوئی۔ ہجو یہ شاعری میں انوری اور سوزنی کے نام کافی اہم ہیں۔ ان کی ہجویات بیشتر فحش گوئی اور گالی گلوچ تک جا پہنچتی ہے۔ کمال نے ابتذال اور فحش گوئی سے گریز کر کے بچی ظرافت پیش کی ہے۔

فارسی میں طنز و مزاح کی دوسری رو زاہد سے چھیڑ چھاڑ اور رندی و سرمستی کی شاعری سے نمودار ہوئی اس سلسلے میں عمر خیام' سعدی' شیرازی اور خسرو کے نام کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ طنز و مزاح کی تیسری رو پیروڈی یا تحریف کی رو ہے اس سلسلے میں عبید زاکانی' ابو اسحاق' اطعمہ اور نظام الدین محبوب قاری یزدانی البساں کے نام ملتے ہیں۔ فارسی ادب میں مزاح کی آخری رو ۱۹۰۶' اور ۱۹۰۹ء کے انقلاب کے بعد نمودار ہوئی۔ اس رو کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر پہلی بار ایران کی سیاسی بیداری نے اپنے اثرات ڈالے۔ اس رو نے پہلی مرتبہ مغربی اثرات بھی قبول کئے۔

۲۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کی تعریف:۔

اردو زبان میں عام طور پر طنز و مزاح کے الفاظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں جبکہ انگریزی میں مزاح اور طنز دو الگ الگ اصناف ادب سمجھی جاتی ہیں۔ مزاح سے متعلق انگریزی زبان کا لفظ Humour دراصل لاطینی لفظ humere سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں مرطوب ہونا۔ بعد ازاں یہ لفظ ہجے کی تبدیلی کے ساتھ رطوبت کے علاوہ مزاح اور طبیعت کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا۔ خاص طور پر اگر مزاج غیر متوازن یا احمقانہ ہو۔ اور رفتہ رفتہ یہ لفظ مضحکہ خیز یہ ظریفانہ کا مترادف ہو گیا۔ ۲

طنز سے متعلق انگریزی لفظ Satire لاطینی لفظ Satyre سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں مختلف قسم کے پھلوں سے بھری ہوئی تشتری یا طباق۔ دوسری صدی قبل مسیح میں لاطینی طنز نگار لوسی لیس نے ایک صنف شاعری Satire اختراع کی تھی۔ یہ ہیکزامیٹر میں لکھی جاتی تھی، جس میں کسی کی عاداتِ بد اور حماقتوں کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا تھا۔ لوسی لیس کے بعد آنے والوں مثلاً ہورلیس، پرسیس اور جووئل نے بھی اسے کامیابی سے برتا۔ بعد میں اسے مختلف بحروں میں لکھا جانے لگا۔ اور وحدتِ خیال اور مضمون کی وحدت کی شرائط باقی نہ رہیں۔ گویا یہ ایک قسم کا طباق یا تشتری تھی جس میں مختلف النوع طنزیہ خیالات اور مضامین جن کے موضوع میں بوقلمونی ہوتی، مختلف بحروں میں پیش کئے جاتے تھے۔ اردو میں طنز کوئی صنف ادب نہیں بلکہ ایک ادبی اسلوب اور صفت ہے۔ لیکن مغرب میں اسلوب کے ساتھ ساتھ اسے صنف کے طور پر بھی برتا گیا۔ طنز کی تعریف: طنز کی متعدد تعریفیں ملتی ہیں۔ نمبر۱: طنز ایک ادبی اسلوب ہے جس میں کسی فرد، بنی نوع انسان یا مکتبہ فکر کی کمزوریوں، برائیوں اور بداخلاقیوں کو اصلاح کے خیال سے تضحیک اور تحقیر کا نشانہ بنایا جائے۔ نمبر۲: ایک ادب پارہ اصلاً نظم میں، جو لازماً حماقتوں اور برائیوں پر تنقید کرے۔ اس کے بنیادی ہتھیار رمز (irony)، طعنہ (sarcasm)، دشنام (invective)، بذلہ سنجی (wit) اور مزاح (humoure) ہیں۔ نمبر۳: ایک ادب پارہ جس میں عاداتِ بد، حماقتوں، ناانصافیوں وغیرہ کو تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ نمبر۴: ایسی تحریر جس کا مقصد عادتِ بد اور مکاری (humbug) پر روشنی ڈالنا اور مذاق (comedy) رمز وغیرہ کے ہتھیاروں کی مدد سے چوٹ کرنا ہو۔ نمبر۵: ایسی تنقید یا تعریض جس سے جذبہ، تفریح اور نفرت کو تحریک ہوتی ہو۔ نمبر۶: ایک نظم، جدید استعمال میں نثر، جس میں عادتِ بد اور حماقتوں کے لئے تضحیک کے جذبات پیدا کئے جائیں۔ ۳

۲۔ اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، رؤف پارکھ، صفحات ۹ تا ۱۰ ۳۔ ایضاً، صفحات ۱۳ تا ۱۴

مزاح کی تعریف: قدیم لغات میں مزاح کا مفہوم ''فقرہ' لطیفہ' ٹھٹھا' شوخی' چٹکلہ پن' ہزل' پھبتی' جگت' دل لگی اور تمسخر'' وغیرہ سے واضح کیا گیا ہے۔ ۴ مولانا الطاف حسین حالی بھی مزاح کا مطلب ''ہنسی' دل لگی اور ٹھٹھول بیان کرتے ہیں۔ ۵ ''پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانہ آزاد میں لکھا ہے کہ ''لغت میں مزاح کے معنی ہیں خوش طبعی کرنا اور اصطلاح میں ایرادِ معقولاتِ لطیفہ واستعمالِ تقلیاتِ ظریفہ بہ پابندی آداب وتہذیب کو کہتے ہیں۔ ۶ مشرق ہو یا مغرب مزاح کی بیشتر تعریفوں میں مزاح کا تعلق ہنسی سے ہی جوڑا گیا ہے۔ مزاح اور ہنسی لازم وملزوم تصور کئے گئے ہیں۔ گویا مزاح کی تعریفوں کا نچوڑ یہ ہے کہ ''کسی عمل' خیال' صورتِ حال' واقعے' لفظ یا جملے کے خندہ آور پہلوؤں کو دریافت کرنا' سمجھنا اور ان سے محظوظ ہونا مزاح ہے''۔ ۷

۳۔ اردو مزاح نگاری کا آغاز اور ارتقاء:۔

اعلیٰ درجے کا مزاح کوئی بے معنی ہنسی یا محض دل لگی نہیں۔ یہ گہرے سماجی شعور' رچے ہوئے ذوق' تہذیب ودانش' زبان پر عبور' اعلیٰ ذہنی' تنقیدی صلاحیتوں' تجزیے اور تفکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اردو میں مزاح کے ابتدائی نقوش اس وقت ابھرتے نظر آتے ہیں جب یہ زبان اپنی شناخت پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور طغولیت سے پختگی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ یہ ادب کا ابتدائی یا دکنی دور تھا' جب اس میں کہیں کہیں مزاح جھلکنے لگا تھا۔ بہمنی' قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار کے شعراء کے یہاں اکا دکا مزاحیہ اشعار مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ قطب شاہی دور کے شعراء مثلاً ملا وجہی' غواصی وغیرہ کے یہاں بھی ملتے ہیں اور نصرتی کی مثنویوں اور قصیدوں میں بھی کہیں کہیں مزاح کی جھلک ملتی ہے۔ عادل شاہی دور کے شاعر ملک خشنود کے یہاں گھوڑے کی ہجو میں چند اشعار ملتے ہیں۔ اردو میں مزاح کا آغاز نظم ونثر دونوں میں بیک وقت ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ادب کو جعفر زٹلی جیسی شخصیت مل گئی تھی جس نے نظم ونثر دونوں میں مزاح کے پھول کھلائے۔

جعفر زٹلی کو اردو نثر میں مزاح نگاری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ان کے بعد ہمیں شاہ حاتم کے یہاں ''نسخہ مفرح الضحک'' کے عنوان سے ایک مزاحیہ نثر پارہ ملتا ہے جو اردو میں مزاحیہ نثر کا قدیم ترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ عہد زوال کی

---

۴ اردو نثر کے میلانات' وحید قریشی' صفحات ۴۱ تا ۴۳

۵ کلیاتِ نثر حالی' جلد اول۔ صفحہ ۱۴۲

۶ فسانہ آزاد' جلد ۴ حصہ دوم' صفحہ ۳۵۳ ۷ ایضاً' صفحہ ۱۲

داستانوں میں ایک اہم تصنیف شاہ عالم ثانی کی ''عجائب القصص'' (۹۳-۱۷۹۲) اردو کی پہلی ایسی تصنیف ہے جس میں لفظ مزاح تمسخر کے معنی میں ملتا ہے' لیکن انتہائی سطحی اور بے جان حیثیت رکھتا ہے۔ اردو مزاح کی ابتدائی مثالوں میں جو انھارویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتی ہیں' اکثر میں لعن' طعن' تعریض' دشنام' تمسخر' چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک نظر آتی ہے۔

اردو کے ابتدائی دور میں خلیل خان اشک کی تحریر کردہ ''داستانِ امیر حمزہ'' میں ایک آدھ جگہ لفظی مزاح کی بھی مثال ملتی ہے' مگر اس کے کرداروں کا مزاح دراصل حرکات کا مزاح ہے' جس میں ذہانت اور بذلہ سنجی نہیں ہے۔ اس کے بعد کے دور میں رجب علی بیگ کے ''فسانہ عجائب'' (۲۵-۱۸۲۴) کا دیباچہ اور بعد ازاں داستان کی وجہ تصنیف کا بیان' مزاح اور طنز کے اچھے نمونے لئے ہوئے ہے۔ سعادت یار خان رنگین اردو کے بدنام شعراء میں شمار ہوتے ہیں مگر ''اخبار رنگین'' جو ان کی اردو نثر کا نمونہ ہے' ان کی بدنامی کا باعث بننے والے عناصر سے پاک ہے۔ یہاں رنگین نے جو واقعات قلم بند کئے ہیں وہ بذاتِ خود مزاحیہ نہیں' بلکہ ان پر کہاوتوں کی صورت میں کیا گیا تبصرہ مزاح پیدا کرتا ہے' گو کہ اس مزاح میں کچھ زیادہ توانائی نہیں ملتی۔ اس دور کی ایک اور تصنیف جو مزاح کے لحاظ سے خاص طور پر قابلِ توجہ ہے' وہ انشاء اللہ خان انشا کی ''دریائے لطافت'' ہے۔ اس میں مزاح مقصود بالذات نہیں' بلکہ اس کتاب میں کئی گروہوں' خطوں اور علاقوں کی اردو کے لب و لہجے' مخصوص الفاظ اور محاوروں میں پائے جانے والے فرق کو بیان کیا گیا ہے اور ان کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں جو انتہائی پر لطف اور دلچسپ ہیں اور لفظی مزاح پیش کرتے ہیں۔

اردو نثر میں مزاح کا ارتقاء:

اردو نثر فورٹ ولیم کالج کی تحریک کے زیرِ اثر بالخصوص اور کالج سے باہر کی تصانیف کی وجہ سے بالعموم اپنی تشکیل اور ارتقاء کے ابتدائی مرحلے سے گذر کر پختگی کی نئی منزل تک پہنچی۔ ایسے میں مرزا غالب کی شگفتہ طبیعت اور براق ذہن نے خطوط کی صورت میں اردو نثر میں مزاح کے نئے دور کی بنیاد رکھی' جس کے ذریعہ انہوں نے اردو نثر میں مزاح کو کئی درجے بلند کر دیا۔ ان کا مزاح ان کے پیش روؤں کے مزاح سے خاصہ مختلف تھا۔ یہ صورتِ حال بدحواسیوں یا مضحکہ خیز حرکات کا مزاح نہیں بلکہ وہ گفتگو اور تبصرہ کا مزاح ہے' جن کے لئے انہوں نے الفاظ سے خاصہ کام لیا ہے۔ ان کے مزاح میں چابکدستی اور فنکاری ہے' توانائی و بذلہ سنجی' شائستگی اور شستگی ہے۔

غالب کے فوراً بعد کے دور میں علی گڑھ تحریک کے لکھنے والوں کے نام اردو نثر میں نمایاں ہیں۔ ان میں سرسید احمد خاں کا ذکر سب سے پہلے آتا ہے۔ گو ان کے مضامین میں کہیں کہیں شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی، تضحیک اور تمسخر کی جھلکیاں موجود ہیں مگر مزاحیہ ٹکڑے شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں، انکی تحریر میں سنجیدگی زیادہ ہے۔ سرسید کے مقابلے میں ڈپٹی نذیر احمد مزاح کے زیادہ قریب ہیں۔ ان کے یہاں مزاح فی نفسہ مقصود نہیں بلکہ ضمنی طور پر آتا ہے۔ ان کے ناولوں، خطوں اور لکچروں میں مزاح کے بعض نہایت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ان کے مزاح کی خصوصیات میں سب سے گہرا رنگ طنز کا ہے۔ علی گڑھ تحریک کے خلاف پیدا ہونے والے ردِعمل نے اردو ادب پر ایک اثر یہ ڈالا کہ ایک مقصد اور نظریے کے تحت مزاح تخلیق کیا گیا۔ اس سلسلے میں لکھنؤ سے جاری ہونے والا ایک مزاحیہ جریدہ ''اودھ پنچ'' پیش پیش تھا۔ اردو مزاح میں سماجی، نظریات اور مسائل کی عکاسی کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کر چکے تھے۔ مگر اودھ پنچ نے اسے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت دے دی۔ اس کے نمایاں نثر نگاروں میں اس کے مدیر منشی سجاد حسین کے علاوہ نواب سید محمد آزاد، مچھو بیگ، ستم ظریف، اکبر الہ آبادی، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق اور احمد علی شوق قدوائی وغیرہ شامل تھے۔ شبلی نعمانی کی تحریروں میں طنز کا مجموعی حصہ اتنا کم بنتا ہے کہ انہیں باقاعدہ مزاح یا طنز نگار قرار دینا مشکل ہے۔ محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف ''آب حیات'' میں شعراء کے بڑے دلچسپ مرقعے کھینچے ہیں، لیکن ان کو بھی مزاح نگاروں کی فہرست میں شامل کرنا ممکن نہیں۔ الطاف حسین حالی کی اردو نما فارسی تحریر ''ال نامہ'' میں ہلکا سا مزاح نظر آتا ہے، اس کے باوجود حالی جیسے سنجیدہ اسلوب تحریر رکھنے والے نثر نگار کو مزاح نگار تصور کرنا مناسب نہیں۔ انیسویں صدی کے دیگر مزاح نگاروں میں محرم علی چشتی، سید جمال الدین، شوخ بے چین بریلوی اور سجاد سمنڈوی نمایاں ہیں۔

انیسویں صدی کے اختتام تک اردو نثر میں مزاح کا ایک ایسا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا جو تنوع کا حامل تھا۔ اس کے بعض عمدہ نمونوں سے قارئین یہ سمجھ سکتے تھے کہ کس طرح شگفتگی کے پردے میں معاشرتی برائیوں اور ناہمواریوں پر تنقید کرنے اور ذہنی مسرت و بہجت پہنچانے کے اہم فریضے انجام دیے جا سکتے ہیں۔ اب مزاح ترقی کر کے ذاتی اور شخصی سے معاشرتی اور اجتماعی ہو گیا۔ ہجویات اور ذاتی چشمک سے اٹھ کر یہ سماجی تنقید کے درجے تک پہنچ گیا۔ بیسویں صدی کے مزاح نگاروں میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا قلم ماضی کی بے مثال تصویر کشی کرتا تھا۔ ان کے تمام مضامین میں مزاح گہرائی کے ساتھ نہیں ملتا، البتہ ان کی شگفتگی اور گاہے بگاہے ملنے والا مزاح بڑا لطیف اور ہلکا محسوس ہوتا ہے۔ سید محفوظ علی بدایونی اس دور کے مزاح نگاروں میں اس لحاظ سے خاص اہم ہیں کہ انہوں نے اردو مزاح کو پھکڑ پن اور ناشائستگی سے بچا کر اس مزاح سے آشنا کرنے کی کوشش کی جسے ''متین ظرافت'' کہنا چاہئے۔ ان کے یہاں طنز اور مزاح دونوں اتنے گھلے ملے ہیں کہ ان کو الگ کر کے دیکھنا

مشکل ہے۔ سید محفوظ علی کے یہاں طنز ہے لیکن اس میں تلخی نہیں بلکہ شگفتگی ہے' اسی لئے ان کو طنز نگار سے زیادہ مزاح نگار سمجھنا چاہئے۔ سلطان حیدر جوش کا مزاح بالعموم شگفتگی سے دور اور طنز سے بھرپور ہے۔ بلکہ اکثر تلخی اور تعریض کی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان کا طنز بھی اکثر براہِ راست اور بالواسطہ ہوتا ہے' چند ایک مثالیں رمز کی بھی ملتی ہیں۔ ''سلطان حیدر جوش نے اردو ادب میں سب سے پہلے مغربی طنز کو اور فلسفیانہ طنز کو رواج دیا اور ''اسپیکٹیٹر'' کے انداز سے قریب ہونے کی کوشش کی۔ ۸

عظیم بیگ چغتائی کا شمار اردو کے ان مزاح نگاروں میں ہونا چاہئے جن میں مزاح نگاری کی صلاحیتیں تو موجود تھیں اور وہ مزاح نگاری میں کامیاب بھی رہے' لیکن ریاضت کی کمی اور بسیار نویسی ان کی مزید کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔ بقول کلیم الدین احمد : ''عظیم بیگ چغتائی اپنی شہرت کے باوجود بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل یہ ہے کہ ان ۔۔۔۔۔ کی ذہنیت ترقی کے مدارج طے کرنے کے دوران ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی ہے'' ۹ عظیم بیگ چغتائی نے محض علمی مذاق' شرارتوں' اتفاق اور بدحواسی سے مزاح پیدا کرنے پر توجہ دی۔ بیسویں صدی کے عبوری دور میں اردو نثر میں مزاح نے ترقی کی کچھ اور منزلیں طے کرلیں تھیں۔ اس دور میں مزاح ترقی پا کر نیم پختگی کے مراحل کو پہنچ گیا۔ اسلوب' اندازِ بیان اور لب و لہجے کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کی خوبی نے اردو مزاح کی راہوں کو وسیع کر دیا۔ ادھر ادبی افق پر بڑی اہم تبدیلی ہوئی جو ترقی پسند ادبی تحریک کی صورت میں تھی۔

ترقی پسند ادبی تحریک نے صحیح معنوں میں دو مزاح نگار پیدا کئے۔ کرشن چندر خواہ افسانہ لکھ رہے ہوں یا ناول' ہلکے پھلکے مزاح اور طنز کی موجودگی کو برابر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی کچھ ایسی تحریریں ہیں جو خالص مزاح کے ذیل میں آتی ہیں۔ لیکن ان کا اصل میدان اور بنیادی حربہ طنز ہے۔ ان کے طنز میں اکثر شگفتگی ہوتی ہے۔ وہ براہِ راست طنز کرتے ہیں اور ان کا اسلوب بڑا دلکش اور شگفتہ ہے۔ اس کے برخلاف ابراہیم جلیس کا طنز براہِ راست اور تلخ ہے۔ اور اس میں شگفتگی بالکل نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو انکا طنز سیدھا سادہ ''جلی کٹی'' سنانے کے ذیل میں آتا ہے۔ ابتدائی دور میں ان کا طنز بے ساختہ' بہت کٹیلا اور بڑی حد تک زہرناک تھا۔ اس میں جذباتی ابال' غم و غصہ اور بے بسی کا احساس بھی شامل تھا۔ بعد میں مزاح نگاری کا عوامی انداز اپنانے کے بعد ان کے طنز کی شدت' بے ساختگی اور معیار میں کمی آ گئی۔

---

۸ طنزیات و مضحکات' رشید احمد صدیقی' صفحات ۲۴۴ تا ۲۴۵

۹ اردو ادب میں طنز و ظرافت'' از نقوش'' طنز و مزاح نمبر' صفحہ ۶۹

اردو ادب کے ارتقائی دور میں مزاح پیدا کرنے کے لئے حرکات وسکنات اور صورتِ حال کے علاوہ زبان کے ماہرانہ استعمال' خیال ولفظ سے بھی مزاح پیدا کیا گیا۔ طنز' رمز تحریف' مہملات' رعایتِ لفظی' برجستگی اور شگفتگی کا استعمال بڑھ گیا۔ اس دور میں اردو نثر میں مزاح نے اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے اتنی ترقی کی کہ گذشتہ ادوار میں اس ترقی کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری اس دور کے بہت بڑے مزاح نگار ہیں۔ بحیثیت مجموعی رشید احمد صدیقی کے مزاح میں توانائی ملتی ہے اور اس میں گہرے فلسفیانہ افکار بھی موجود ہیں۔ انہوں نے مزاح پیدا کرنے کے لئے قولِ محال اور دلچسپ تبصروں کے ساتھ الفاظ کی تکرار' صوتی تکرار' جملے میں الفاظ کی جگہ کی تبدیلی یا تقدیم وتاخیر اور الٹ پھیر سے بھی کام لیا ہے۔ ان کے یہاں کافی طنز ملتا ہے۔ اور اس طنز میں کہیں کہیں شدت اور تلخی بھی ہے۔ لیکن بالعموم ان کا طنز شگفتہ ہوتا ہے۔ احمد شاہ پطرس بخاری جیسے فطری مزاح نگار کو مزاح پیدا کرنے کے لئے کسی خاص موضوع' کردار' لفظ یا واقعے کی بالالفاظِ دیگر کسی ذریعہ یا بہانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کے مزاح میں بے حد توانائی ہے۔ اس دور کے دیگر بڑے مزاح نگاروں میں شوکت تھانوی' شفیق الرحمٰن' کنہیالال کپور وغیرہ شامل ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد مزاح لکھنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور مختلف اصناف میں لکھنے والوں نے مزاح کی جھلکیاں پیش کیں۔ مختلف اصناف میں مزاح کے چھوٹے چھوٹے پارے یا منظر ملتے ہیں یا بیانیہ انداز میں بعض چیزوں اور نظریات پر طنزیہ انداز اور زہر خند کی ایسی لہر ملتی ہے جو بعض لکھنے والوں کے یہاں نمایاں ہے اور بعض کے یہاں زیرِ سطح ہے۔ باعتبار توانائی اور مقدار دیکھا جائے تو آزادی کے بعد پاکستان میں جس صنف میں مزاح سب سے زیادہ ملتا ہے وہ انشائیہ ہے۔ پاکستان کے نمایاں مزاح نگاروں میں جسٹس محمد رستم کیانی' محمد خالد اختر' ابنِ انشاء' کرنل محمد خاں' مشتاق احمد یوسفی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ایسے نمائندہ مزاح نگار ہیں جن کا مزاح نہ صرف توانائی رکھتا ہے بلکہ انہوں نے نہ صرف پڑھنے والوں بلکہ دیگر لکھنے والوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ دیگر مزاح نگاروں میں بعض ایسے لکھنے والے شامل ہیں جو کہنہ مشق ہیں اور ان کے یہاں انفرادیت بھی موجود ہے۔ ان میں مجید لاہوری' اشرف صبوحی' نصراللہ خاں' سید ضمیر جعفری' امجد حسین' اے حمید' مشکور حسین یاد اور صدیق سالک وغیرہ شامل ہیں۔ بھارت کے بعض مزاح نگاروں کا معیار بلند ہے لیکن مجموعی طور پر بھارت کے مزاح میں وہ شگفتگی اور معیار نظر نہیں آتا جو پاکستان کے مزاح میں ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بھارت میں اردو کی وہ اہمیت نہیں جو پاکستان میں ہے۔

اردو نثر میں مزاح کا آغاز جو اٹھارویں صدی کے اوائل میں فحش گوئی' تضحیک' تمسخر' تحریف' طنز اور پیوند کاری

زبان کے استعمال سے ہوا تھا اس نے رفتہ رفتہ عروج کی جانب سفر کیا اس میں زوال کسی دور میں نہیں آیا بلکہ دورِ حاضر کو چھوڑ کر ہر دور کا مزاح گزشتہ دور سے بڑھتا ہوا نظر آیا۔ جیسے جیسے سماجی اور سیاسی حالات بدلتے گئے مزاح نگاروں کے موضوعات بھی بدلتے گئے۔ مزاح میں طنز بڑھتا گیا۔ سماجی، سیاسی اور معاشی ابتری طنز کے فروغ کا باعث بنی اور اردو مزاح اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

۴۔ چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط میں مزاح:

چودھری صاحب کی مکتوب نگاری کے مختلف پہلوؤں کا باب سوم میں تفصیلی جائزہ لیا جا چکا ہے۔ وہ خصوصیات جس نے ان کے تحریر کردہ مکاتیب کو ان کے افسانوں، انشائیوں اور خاکوں سے زیادہ دلچسپ بنا دیا وہ ان کی شوخی تحریر ہے۔ مثلاً اپنے ۲۲ ستمبر ۱۹۳۲ء کے تحریر کردہ خط میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں۔ ''شاہ ضیاء الحق کی بی بی سے پندرہ سولہ برس کے بعد ملاپ ہوا ہے۔ اتنے زمانے تک بیچارے بندر کی طرح زندگی بسر کیا کئے۔ کھانا بازار سے کھایا۔ کباب روٹی باورچی کے یہاں سے مول لے لی نہیں تو دکان ہی پر حلوائی سے مٹھائی لے کر کھالی۔ پانی گھر میں آ کر پی لیا۔ پان ملا تو ملا، نہیں تو ایک کھٹیا مونہہ میں ڈال اور پیرزادگی کے مزے چوس چوس کر لیا کئے۔ ریوڑی کھٹیا، کچھ مول لینا نہیں۔ مخدوم صاحب کے مزار پر انوار کی طرح ہر وقت برسا کرتی ہیں۔ اب بے چارے پکی پکائی روٹی پاتے ہیں''۔[۱۰]

یہاں پر چودھری صاحب ضیاء الحق نامی کسی صاحب کا پندرہ سولہ سال تک اپنی بیگم سے کشیدگی کے باعث تجرد کی زندگی گزارنے کا احوال انتہائی مزاحیہ الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اور ایسی زندگی کو کھانے پینے کے معاملے میں بندر کی زندگی سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ بیگم کے گھر واپس آ جانے کے بعد ان کی نظر میں گھر کی رونق اس طرح بڑھ گئی ہے جس طرح قصبہ ردولی میں واقع بزرگ مخدوم عبدالحق صاحب کے مزار پر تجلی و انوار کی بارش ہوا کرتی ہے۔ یہ ان کا طنزیہ انداز ہے خاتونِ خانہ کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے۔

چودھری صاحب اپنی دختر نیک اختر ہما بیگم کو ۱۶ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ذاتی خط تحریر کرتے ہوئے کچھ اس انداز سے رقمطراز ہیں کہ اس میں، انہوں نے اپنے آپ کو ہی طنز کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ لکھتے ہیں'' آج کل میں بہت پریشان رہا اور پریشان ہوں مگر میری پریشانی موٹاسے پن کی ہے۔ سکھ روگ لگا ہے۔ بعضے وقت خیال ہوتا ہے کہ کفرانِ نعمت کر رہا ہوں، پھر عقل کہتی ہے۔

---

۱۰ کویا دبستاں کھل گیا، صفحات ۱۷ تا ۱۸

ہو جائے گا چھوٹی چھوٹی باتوں میں خفا

کیا تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے

اب مولوی لوگ ان کے کان بھر دیں تو اور بات ہے۔ جیسا کھانا کھاتا تھا ویسے ہی کھانا کھاتا ہوں۔ بلکہ شاید اس سے بہتر اللہ دے دیتا ہو۔ کیونکہ قیصر آج کل ہمیشہ سے بھی زیادہ خیال کرتی ہیں۔ نیا ریشمی لحاف اوڑھتا ہوں' پھر اور کیا چاہئے۔ مگر دل نہیں مانتا۔

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے

یہ رنج کہ کم ہے' مئے گلفام بہت ہے

دکھڑا رونے کو اور کچھ نہ سہی تو یہی ہے کہ سلمان کا خط نہیں آتا''۔[۱۱] سارا خط ان ہی الفاظ پر مشتمل ہے پریشانی اور دکھ کا تذکرہ بھی کس شگفتگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ انسان کتنا ہی امیر کبیر کیوں نہ ہو اسے کوئی نہ کوئی فکر ضرور لاحق رہتی ہے' اس لئے کہ وہ خواہشات کا پتلا ہوتا ہے۔ اسے فکرِ معیشت نہ سہی مگر تردیدِ زمانہ ضرور ہوتا ہے۔ محبت کی طلب ہوتی ہے' مقاصد کا حصول درکار ہوتا ہے۔ اسی فلسفے کو یہاں چودھری صاحب نے بہت سلیقے سے طنزیہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

چودھری صاحب بحیثیت تعلقہ دار ایک بہت بڑے زمیندار تھے۔ اور جب زمینداری نظام ختم ہونے لگا تو یہ ان کے لئے بہت ہی بڑا صدمہ تھا۔ جس کا تذکرہ وہ اپنے سے بھی بڑے زمیندار راجہ صاحب سلیم پور کے نام ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں۔ ''خیر کوئی حرج نہیں۔ اس وقت تک نہ کھانے کی تکلیف ہوئی ہے نہ ضروریاتِ زندگی کی۔ البتہ غرور بری طرح ٹوٹ رہا ہے۔ جس پر باوجود عقل کے نیک مشوروں کے نفس اس وقت تک راضی نہیں ہوا ہے۔ ہزار سمجھاتے ہیں کہ اتنی آراضی' اتنا مال تجھ کو تنہا رکھنے کا کیا حق تھا۔ مگر نفس کسی طرح راضی نہیں ہو رہا ہے۔ نفس کہتا ہے یہ تو درست ہے مگر جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کا انتظام ہے وہ الو کے پٹھے ہیں' ان سے سوائے کام بگڑنے کے بنے گا کیسے۔ ہم دل کو سمجھاتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں' دیکھو کیا ہوتا ہے۔ جس قدر رہ گیا ہے اس پر اللہ کا شکر بھیجو۔ تمہارے اعمال تو اس قابل بھی نہ تھے۔ اس جگہ تو ہم بھی قائل ہو جاتے ہیں اور سوائے شکراً شکراً' عفواً عفواً کے کچھ نہیں کہہ سکتے''۔[۱۲] اتنے بڑے نقصان کا تذکرہ کس اطمینان سے کرتے ہیں۔ لیکن تحریر کی شوخی برقرار رہتی ہے۔ انسان کی ملکیت میں موجود کوئی چیز جب واپس لے لی جائے تو اسے دکھ تو ہوتا ہی ہے۔ وہ رضائے الٰہی کے خیال کے تحت اپنے دل کو سمجھانے کی غرض سے تاویلیں پیش کرتا ہے۔ اسی فلسفے کو چودھری محمد

---

۱۱ گویا دبستاں کھل گیا' صفحہ ۷۰ ۱۲ ایضاً' صفحات ۹۵ تا ۹۶

علی نے یہاں پر طنزیہ انداز سے پیش کیا ہے۔ ڈپٹی تحصیلدار صاحب کا دیوانِ شاعری پڑھ کر انہیں اپنی رائے سے اس طرح ایک خط میں مطلع کرتے ہیں:

''آپ نے اپنا دیوان میرے عزیز بھائی غلام مصطفےٰ صاحب شاعر بے بدل پنشنر تھانے دار کو عنایت کیا۔ موصوف نے تعریف بھی کی مگر دیوان دیکھ کر دل کی کلی کھل گئی۔ انشراحِ قلب ہوا' اس طرح کی فرحت ہوئی جیسے لکھنؤ کے بنارسی باغ میں صبح کی مستی میں کسی شائستہ متوازن' مقتصد' خوش مذاق' شریف مرد سے پہلے پہل ملاقات ہو جائے۔ اور دل فوراً یہ کہے کہ کہیں دیکھا ہے۔ پہلی ملاقات شاید میدان ازل میں ہوئی ہو' جہاں ہم مذاق لوگوں کی ٹولیاں الگ الگ رہی ہونگی۔ نئی شاعری نے ایسی بلند پروازیاں کی ہیں کہ ان کو سن کر ہم دقیانوسی لوگوں کے حواس اڑ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں حدود کے اندر والی شاعری اگر کہیں دکھائی دے جاتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بچھڑے مل گئے''۔ ۱۳

یہاں شوخی کے ساتھ متانت اور سنجیدگی بھی موجود ہے۔ ان کی طبیعت میں غضب کا ابھار تھا جو کبھی انہیں نچلے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ چودھری محمد علی کا یہ انداز ان کی تحریر کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے سے ٹپکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ظرافت چودھری صاحب کی فطرت ثانی تھی اور انہوں نے جہاں قلم اٹھایا ظرافت کے پھول جھڑنے لگے۔ چودھری صاحب کے ایک دوست ہاشمی صاحب کی ایک اولاد کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ پرسہ ادا کرنے کی غرض سے جب ہاشمی صاحب کو خط لکھتے ہیں تو رسمی علیک سلیک کے بعد کچھ اس انداز سے رقمطراز ہوتے ہیں:

''میں نا تجربہ کاری کے زمانے میں تعزیت اور پرسے پر ہنسا کرتا تھا۔ میری ایک لڑکی جو بہت دنوں سے بیمار تھی (اس کے علاوہ چار لڑکیاں اور بھی تھیں) وہ گذر گئی۔ صبح کو ایک صاحب تعزیت کو آئے۔ بے چارے کم سخن تھے آکر چپ بیٹھ گئے۔ میں نے کہاں ہاں تو پھر شروع کیجئے' بچی کیا بیمار تھی۔ مجھ کو اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ خدا آپ کو صبر دے۔ وہ بے چارے پریشان ہو گئے۔ اس کے بعد میرا اکلوتا لڑکا گذر گیا۔ اس واقعے کے بعد ایک دیہاتی جاہل ملاقاتی نے ہمدردی کی۔ عجب بھونڈے طریقے سے اس نے مجھ کو تسکین دی۔ مگر یہ معلوم ہوا کہ جیسے زخم پر کسی نے مرہم رکھ دیا ہو۔ اس نے کہا ''وہ لڑکا تمہارا تھا ہی نہیں۔ اگر تمہارا ہوتا تو تمہارے پاس رہتا نا۔ وہ جس کا تھا اس نے لے لیا۔ تم کیوں رنج کرتے ہو؟'' ہاشمی صاحب! اس وقت بھی وہ زخم ہرا ہے اور اس وقت بھی وہ مرہم اپنا کام کر رہا ہے'' ۱۴ غور طلب بات یہ ہے کہ رنج و افسردگی کے بیان میں بھی مذکورہ بالا ابھار موجود ہے شوخی اور ظرافت کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی ہے اور باتوں ہی باتوں میں تعزیت کی

---

۱۳ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۵۲ تا ۵۳ ۱۴ ایضاً' صفحات ۱۷۷ تا ۱۱۸

اہمیت واضح کردی۔

اپنی عمر کے آخری زمانے میں چودھری صاحب پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اس دوران وہ اپنی عزیز بیٹی ہما بیگم کو اپنی علالت کا حال اپنے ۱۲ نومبر ۱۹۵۵ء کے خط میں اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''تم نے میرا حال دریافت کیا ہے۔ سنو! میرا بایاں ہاتھ بالکل بے کار ہے۔ مگر خفیف سی جنبش اختیار میں ہے۔ بایاں پاؤں اٹھ جاتا ہے' لیکن اگر کوئی طاقت ور آدمی مجھ کو پکڑے نہ رہے تو میں گر پڑوں۔ یعنی مفلوج محض ہوں۔۔۔۔ موٹا ہو گیا ہوں یعنی نوکروں کو اٹھانے میں اور تکلیف ہوتی ہے۔ فرنچ داڑھی رکھوالی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ معلوم نہیں اللہ میاں کو بھی اچھی لگے گی یا نہیں۔ میری مجبوریوں کا حال نہ پوچھو۔ یہ کارڈ تب لکھ سکا ہوں' جب دوسرا آدمی اس کے کونے پکڑے ہے۔ اگر آرام کرسی پر چھپکلی گر پڑے تو میں مجبور محض ہوں خود نہیں اٹھ سکتا'' ۱۵؎ اس کے چند ہفتوں بعد' اپنے ۴ رجنوری ۱۹۵۶ء کے خط میں اپنی مزید بگڑتی علالت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''پیٹ کی خرابی کو تو میں بھول گیا۔ مگر موت کی یاد ویسی ہی ہے۔ قلب کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ جیسے کوئی پرانا ستار تانپورہ ہو جس کے تار اترے ہوئے' کھونٹیاں ڈھیلی ڈھالی پڑا ہو' اور چوہا بھی اس پر سے دوڑ جائے تو تمام تار بے سرے جھن جھن کرنے لگیں۔ یہ حال ہمارے قلب سلیمہ کا ہے۔ چنانچہ رات بہت کم سوئے۔ منوم دوا جو عورتوں کو ہسٹیریا میں دی جاتی ہے وہ بھی پی' مگر یہ حال رہا کہ ہم سمجھے کہ ہم جاگ رہے ہیں۔ اور گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا تقریباً چار گھنٹے ہوئے۔ یہ حال ہے بی بی کہ سوتا بھی ہوں تو معلوم ہوتا ہے جاگ رہا ہوں'' ۱۶؎

ان دونوں خطوط میں چودھری صاحب اپنی علالت اور اپنی تکالیف و پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں مگر اپنی ظریفانہ طبیعت کی وجہ سے انکی تحریر میں شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ شوخی و شرارت جو انکی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے وہ ہر مقام پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ خواہ خوشی کا مقام ہو یا غم کا' وہ نچلے نہیں بیٹھتے۔ ضعیفی میں جہاں تمام اعضاء ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں قلب کی رفتار میں بھی فرق آنے لگتا ہے' اس کی مثال چودھری صاحب نے یہاں بڑے ہی مزاحیہ انداز میں پرانے ستار تانپورہ پر کسی چوہے کے دوڑ جانے سے پیدا ہونے والی جھنجھناہٹ سے دی ہے۔ چونکہ وہ ہما بیگم کو اپنی دوست کی طرح ہی تصور کرتے تھے۔ ان سے بہت بے تکلف تھے' اس لئے وہ اپنے ۲۲ رستمبر ۱۹۳۲ء کے خط میں اپنے نوکروں کے خاندان کی ایک بہو کا تذکرہ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

۱۵؎ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۳۰۵ ۱۶؎ ایضاً' صفحات ۳۱۷ تا ۳۱۸

''دلہنیا کے لڑکا ہونے والا ہے۔ دن قریب ہونگے۔ کو قریب تر نہیں معلوم ہوتے۔ وہ بہت خوش ہے۔ باورچی خانے سے سہ دری آتے وقت ذرا سا سر جھکا کر کنکھیوں سے اپنا پیٹ دیکھتی چلتی ہے۔ مجھ کو نہ معلوم آپ ہی آپ کیوں خوشی ہے۔ مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا میرے ہی پوتا پیدا ہونے والا ہے'' ۱۷

اس تحریر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ چودھری صاحب کی نظر کتنی تیز تھی۔ وہ نباضِ فطرت تھے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کس خوبصورت انداز میں کرتے تھے۔ شوخی و ظرافت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیتے تھے۔ چونکہ وہ فطرتاً خوش مزاج اور شوخ طبیعت کے مالک تھے اس لئے انکی تحریر میں ہر جگہ اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ چودھری محمد علی کی تحریروں کا سب سے اہم موضوع عورت ہے۔ انہوں نے ہر زاویہ سے عورت کا مطالعہ کیا ہے۔ ایک نوجوان عورت جب پہلی بار حاملہ ہوتی ہے تو بعد ازاں رونما ہونے والی تکالیف سے ناآشنا ہوتے ہوئے اسے ایک گونہ مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ اسی کیفیت کو چودھری صاحب نے یہاں طنزیہ پیرائے میں بڑی خوبصورت مثال سے واضح کیا ہے۔ اسی طرح اپنے دوست عزیز صاحب، جن کا تعلق اعظم گڑھ سے تھا، ان کو ۶ راپریل ۱۹۵۱ء کو ایک خط میں نوکروں کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چند آدمی اجمیر شریف کی زیارت سے واپس آرہے تھے۔ ان کے ساتھ جو نوکر تھا نہایت بے وقوف تھا۔ وہ لوگ لکھنؤ آرہے تھے۔ سندیلہ وغیرہ کے اسٹیشن پر اس کو روپیہ توڑانے بھیجا۔ اس نے روپیہ توڑایا اور آٹھ آنے پیسے دونوں مٹھیوں میں لے کر ریل کی طرف بڑھا۔ اتنے میں ریل چھوٹ گئی۔ اب وہ برابر گاڑی کے ساتھ دوڑا چلا جاتا ہے مگر ریل پر چڑھتا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پلیٹ فارم ختم ہو گیا اور وہ رہ گیا۔ لکھنؤ پہنچ کر بڑی دقت کا سامنا ہوا۔ کیونکہ قافلہ بھر کے ٹکٹ اسی کے پاس تھے۔ خیر بہزار خرابی ان غریبوں کی جان اسٹیشن والوں سے چھوٹی۔ کچھ گھوس بھی دینا پڑی۔ شام کی گاڑی سے ملازم صاحب آئے۔ آقا غصے میں بھرے بیٹھے تھے کہنے لگے۔

''ابے تو تو برابر ریل کے ساتھ دوڑا کیا۔ اور گاڑی پکڑ کر چڑھ کیوں نہ آیا''

نوکر: میاں دونوں ہاتھوں میں تو پیسے تھے، گاڑی کا ڈنڈا کیسے پکڑتن۔

آقا: ابے پیسے ایک ہاتھ میں لے لیتا دوسرا ہاتھ خالی ہو جاتا۔

نوکر: واہ میاں اب ترکیب بتاوے چلے ہو۔ او بیر نہ بتلائیو۔

آقا: اور مردود سب کے ٹکٹ بھی تیرے ہی پاس تھے۔

نوکر: لیو میاں اپنے ٹکٹ لیو، گسا کاہے کرت ہو'' ۱۸

---

۱۷ ''کو یا دبستاں کھل گیا'' صفحات ۱۸ تا ۱۹ ۱۸ ایضاً، صفحات ۱۳۴ تا ۱۳۵

یہ کوئی افسانہ یا ڈراما نہیں بلکہ خط کا ایک حصہ ہے۔ چودھری صاحب محض کسی شے' کسی واقعہ' کسی سین کو بیان ہی نہیں کرتے' بلکہ اسے نظر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں اور پوری تصویر صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ گویا پورا منظر نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے اور یہی انکے اندازِ تحریر کی خصوصیت ہے۔ نوکر دیہاتی تھا' انتہائی سادہ لوح اور بے وقوف بھی تھا۔ شہر کی تیزی اور چالاکی سے قطعاً ناواقف تھا۔ لہذا اس سے پہ در پہ جو حماقتیں سرزد ہوئیں' اس کی منظر کشی مزاحیہ انداز میں چودھری محمد علی نے بہت خوبصورت اور مناسب الفاظ میں کی ہے اور یہی ان کے اندازِ تحریر کی خصوصیت ہے۔ ''گویا دبستاں کھل گیا'' میں جمع شدہ ان کے تمام خطوط ظرافت کے پیش بہا نمونوں سے بھرے پڑے ہیں اور یہ ایسے نمونے ہیں جو خالص ظرافت کے نمونے ہی نہیں بلکہ ادبی معیار پر بھی پورے اترتے ہیں۔ ان میں تخئیل کی باریک بینی' تیزی اور بلند پروازی ہے۔ تحریر میں جابجا شوخی' رنگینی' بے ساختگی' بوقلمونی اور قوتِ ایجاد کے نمونے نہ صرف بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ ان کو پڑھ کر چودھری صاحب کی ذہنیت کی گہرائی اور پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

۵۔ چودھری صاحب کے افسانوں' کہانیوں اور مضامین میں طنز و مزاح:

اردو نثر میں طنز و مزاح کی کمی نہیں۔ اردو ادب کے نامور نقاد کلیم الدین احمد نے مزاح نگاروں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے'' پہلے گروہ میں وہ انشاء پرواز ہیں جن کا نصب العین خالص ظرافت ہے اور جو ہنسنے ہنسانے کے علاوہ کوئی دوسرا اندرونی مدعا نہیں رکھتے اور اگر رکھتے بھی ہیں تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرا گروپ پر مقصد ہے جو نقائصِ انسانی' سماجی' تمدنی' اخلاقی و سیاسی غرض ہر قسم کے نقائص کو مٹانا چاہتا ہے۔۔۔۔ اس گروپ کے انشاء پرداز کا جذبہء غضب جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبہء غضب کی اپنی ہجوؤں میں ترجمانی کرتا ہے۔ اس قسم کے انشاء پرواز خالص طنز کے عیوض ظرافت اور طنز' اور زیادہ تر طنز سے مصرف لیتے ہیں۔۔۔۔ تیسرا گروپ وہ ہے جس کی ظرافت میں فلسفیانہ رنگ ہوتا ہے۔ یہاں مقصد ظرافت نہیں بلکہ اپنے فلسفہء زندگی کی یا ان مشاہدوں کی جن پر فلسفہ کی بنیاد ہے ظرافت آمیز نقاشی ہے''[۱۹]

چودھری محمد علی کا تعلق اس تیسرے گروپ سے ہے۔ چودھری صاحب نے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان ہے ''بیوی کیسی ہونا چاہئے'' عورت کے بارے میں اپنے فلسفیانہ خیالات کا کچھ اس طرح اظہار کیا ہے'' مجھ سے سوال کیا گیا کہ بی بی کیسی ہونا چاہئے؟ میں کہتا ہوں کہ کوئی بری بی بی مجھ کو دکھا دے تو میں اس سوال کا جواب دوں۔ میرے خیال میں بی بی

---

۱۹ ''اردو میں طنز و ظرافت'' کلیم الدین احمد' مشمولہ: نقوش' طنز و مزاح نمبر'' صفحہ ۶۱

خدا کی نعمت ہے اور خدا کی نعمت کبھی بری نہیں ہوتی۔ بیوی کی وجہ سے گھر میں روشنی سی پھیلی رہتی ہے۔ چراغ کے نیچے ذرا سا اندھیرا بھی ہوتا ہے۔۔۔۔ اگر کوئی نادان مرد ذری سی تاریکی سے گھبرا کر چراغ کی شکایت کرے تو اندھیر ہی تو ہے۔ میں اس کا بھی دعوے دار ہوں کہ میں نے آج تک کوئی بدصورت عورت بھی نہیں دیکھی۔ آنکھیں رکھتا ہوں اور دنیا دیکھی ہے' اگر کہیں ہوتی تو آخر میں نہ دیکھتا'' ۲۰

چودھری صاحب عورت کے بارے میں بہت ہی بلند خیالات اور نیک تصورات رکھتے تھے۔ وہ عورت کی ہر ہیت' ہر ادا' ہر انداز اور ہر طریقہ زندگی کو اچھا ہی سمجھتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ عورت ان کی کمزوری تھی لیکن وہ اپنی فلسفیانہ نگاہوں سے اسے اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا ایک حسین پیکر تصور کرتے تھے۔ ان کا فلسفہ تھا کہ عورت نام ہی ہے حسن و جمال کا۔ اچھائی اور برائی ہر انسان کی فطرت میں شامل ہوتی ہے۔ چونکہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے اور ہر انسان اپنے خیالات کے مطابق اس کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس مضمون میں دراصل چودھری صاحب نے ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو اپنی بیویوں میں نقص نکالتے ہیں اور دوسروں کی بیویوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔

چودھری محمد علی اپنے تحریر کردہ مضمون ''عشق بالواسطہ'' کا آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں: ''لارڈ کرزن ہندوستان کے سابق وائسرائے اور انگلستان کے مشہور سیاست داں کی بابت مشہور تھا کہ وہ ''میں'' کا استعمال بہت کرتے تھے۔ قیصر ولیم' شہنشاہ جرمنی میں بھی لوگ یہی عیب بتاتے تھے۔ نفسیات کے ماہرین کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ اپنی انانیت کی وجہ سے وہ ٹھوکریں کھائیں گے کہ ان کے مرنے کے بعد بھی دوسرے یاد رکھیں گے۔ وہ دونوں تو چل بسے۔ اب اس زمانے میں ایک ہم ہی خودی کے قدر دان رہ گئے ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ تو ہم بھی کب تک۔ ناظرین کو اگر میری بات میں شک ہو تو واحد متکلم کا صیغہ اس تحریر میں گنتے جائیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ معلوم ہی ہو جائے گا' میرے ان دونوں ہم خیالوں میں صفات یہی تھے جن کو سراہتے ہیں ان کو لطف آتا تھا۔ ہم میں ذری صفات کی کمی رہ گئی ہے۔ اس لئے ہم اپنے عیوب ہی کا ذکر کر کے سڑا سا منہ سوندھا کرتے ہیں۔ عیوب کا لفظ تو ہم نے مصنف خوار معترضین کا منہ بند کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ اگر ہم ان کو واقعی عیب سمجھتے تو بیان ہی کرنے کیوں بیٹھتے'' ۲۱

اپنے اس مضمون میں چودھری محمد علی نے جو مزاحیہ انداز اختیار کیا ہے اس میں فلسفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ وہ کسی کے عیب کو جب بیان کرنا چاہتے ہیں تو اس بات کو اپنے اوپر رکھ کر مزاحیہ انداز میں بہت ہی خوبصورت طنز کر جاتے ہیں۔ انکے

---

۲۰ کشکول' صفحہ ۲۹۹

۲۱ ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' صفحات ۳۳ تا ۳۴

مزاح میں گہرائی پائی جاتی ہے۔لفظ ''میں'' کے کثرتِ استعمال سے مراد انانیت اور خود پسندی کا اظہار ہے۔ایسا لفظ استعمال کرنے والا شخص صرف اپنی ذات اور اپنی پسند کو ہی اہمیت دیتا ہے اور دوسروں کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا۔ایسے انسان کی زندگی میں کیا مضمرات ہونگے اور مطلق العنانی کا دوسروں پر کیا اثر پڑے گا ان تمام پہلوؤں پر چودھری محمد علی نے اس مضمون کی تمہید میں طنزیہ انداز سے روشنی ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

چودھری محمد علی ردولوی کی ہر تصنیف خواہ افسانوں پر مشتمل ہو یا خاکوں' کہانیوں' انشائیوں یا دیگر مضامین پر ان کا طنز و مزاح کا یہ منفرد انداز جس میں پختگی بھی ہے اور گہرائی بھی ہر جگہ نمایاں ہے۔عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ طنز و مزاح کے لئے جیسا پختگی اور برجستگی موزوں نہیں مگر ان کی تحریر میں یہ دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں جس سے ان کی تحریر کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے اور قاری اسے پڑھ کر محظوظ ہوتا ہے۔جو بات چودھری صاحب کی تحریروں کو ممتاز بناتی ہے وہ غور و فکر کا وجود' خیالات و تجربات کی گہرائی اور سنجیدہ اور متین لب و لہجہ ہے۔مثلاً چودھری محمد علی نے اپنی تصنیف کردہ کتاب ''گناہ کا خوف'' میں ایک مضمون '' آنکھوں کی زبان'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے اس میں انہوں نے مردوں کے بارے میں ایک عورت کے ذہن کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔لکھتے ہیں:

''ہم عورتیں اگر کسی کو دیکھیں تو جنس کے خیال سے' اگر کسی کو دکھائیں تو جنس کے خیال سے۔کپڑے پہنیں تو مرد کے لبھانے کو۔ہاتھ' کان' گلے میں کچھ ہو تو مرد کی لونڈی بننے کو۔کوئی کمال حاصل کریں تو شوہر پھانسنے کو' خوبصورت ہوں تو مرد کے لئے۔بدصورت ہوں تب بھی مرد کی کسوٹی پر کس کر پھینک دیئے جانے کو۔خدا کے لئے انصاف کیجئے گا۔آٹھوں پہر میں گھڑی دو گھڑی تو ایسی ہونی چاہئے جب آپ لوگ ہماری جان چھوڑ دیں' اور جنس کے نجھیڑے سے دم مارنے کی فرصت نکلے۔اور ہم لوگ خود اپنی زندگی بسر کر سکیں۔۔۔۔آخر کسی وقت تو عورت کو مرد کا بت پوجنے سے چھٹی ملنی چاہئے۔اس کو میں مانتی ہوں کہ ہماری تعلیم' ہماری تربیت' ہمارے قوانین' خود ہمارے جسم کی بناوٹ ایسی واقع ہوئی ہے کہ سوا مرد کے استھان پر بھینٹ چڑھ جانے کے ہمارا کوئی مصرف نہیں۔لیکن پھر بھی میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں کہ سوا جنس کے کوئی پہلو ہماری زندگی کا ہو ہی نہیں سکتا۔اور پیدا کرنے والے نے ہم کو صرف اس واسطے پیدا کیا ہے کہ آپ کی خدمت کیا کریں اور بس۔ہاتھ' پاؤں' دل و دماغ صرف اس واسطے پیدا کئے گئے ہیں کہ مرد کے لئے جیو اور مرد کے لئے مر جاؤ۔اگر کسی وقت بھول بھی جاؤ تو پردہ نگوڑا شرم کی باتوں سے خیال ہٹنے نہیں دیتا'' ۲۲

---

۲۲ ''گناہ کا خوف'' صفحات ۴۵۴ تا ۴۵۵

اس تحریر میں چودھری صاحب نے ان مردوں پر طنز کیا ہے جن کے نزدیک عورت صرف بچہ پیدا کرنے کی مشین ہوتی ہے' یا مردوں کا دل لبھانے کے لئے' ان کا ہر حکم ماننے کے لئے عالم وجود میں آئی ہے۔ ایک عورت اپنی زندگی کے بارے میں' اپنے وجود کے بارے میں کیسے خیالات رکھتی ہے اس سلسلے میں میں چودھری محمد علی نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں یا جو انداز اختیار کیا ہے وہ دوسرے مزاح نگاروں کے مقابلے میں نہ صرف منفرد ہے بلکہ اعلیٰ درجے کا ہے اور معیاری بھی ہے۔ وہ سستی شہرت کے طلبگار نہیں اس لئے وہ سطحی اور عام پسند قسم کی چیزوں سے احتراز کرتے ہیں۔ لہذا سطحی رنگینی اور سطحی رعنائی کبھی ان کا مطمح نظر نہیں رہا۔

''اسباب کا غلام'' کے عنوان کے تحت چودھری صاحب ایک مضمون لکھتے ہیں' جس میں ایک انگریز نوجوان میں حاکمیت حاصل ہو جانے کے بعد رعب دبدبہ کا اظہار کس طنزیہ انداز میں کرتے ہیں۔ ''پانچ ہی برس کے اندر وہ جواں رعنا اپنے ٹھکانے لگ چکا تھا اور اس کی جگہ ایک عجیب الخلقت آدمی کرسی پر بیٹھا تھا۔ بجائے قدیمی ہنس مکھ چہرے کے ایک صورت سامنے تھی' جس میں دہانے کے ادھر ادھر دو شکنیں' ہونٹوں کے سروں کو اس طرح نیچے کھینچ لائی تھیں جیسے دو سنتری تعینات ہوں کہ یہ گنہگار ہنسنے نہ پائے۔ سر کے بالوں کا قافلہ روادر میں تھا اور آنکھوں کے کوئے ایسے پھٹ گئے تھے گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں ''ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے''۔ چہرے کے پٹھے گویا مفلوج ہو گئے تھے جن میں خوشی' رنج' تعجب' شوق ظاہر کرنے کی قابلیت ہی نہیں رہ گئی تھی'' [۲۳]

طالب علمی کا دور بڑی بے فکری اور لاپرواہی کا دور ہوتا ہے۔ انسان اس دوران اکثر الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے' شرارتیں بھی کرتا ہے۔ ہنسی مذاق کرتا ہے اور لوگوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ مگر جب انسان کو حصولِ علم کے بعد کوئی اہم انتظامی کرسی پر بیٹھنا پڑتا ہے تو اسے سنجیدگی اور بردباری اختیار کرنا پڑتی ہے۔ شوخی اور چلبلاہٹ کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ سنجیدگی اور متانت اس کے چہرے کے خدوخال اور نقش و نگار کو ہی بدل دیتی ہے۔ اور اس مضمون میں چودھری صاحب نے اسی تبدیلی کا نقشہ بڑے ہی خوبصورت اور طنزیہ انداز میں کھینچا ہے۔

چودھری صاحب کا مزاح فطری ہے۔ ان کے تخیل میں غیر معمولی باریک بینی اور بلند پروازی ہے۔ اس میں ایک زور ہے ایک اثر ہے' اور یہ زور و اثر اور روانی فطری ہے۔ اس وجہ سے اس میں گرانی نہیں بلکہ لطافت پائی جاتی ہے۔ بقول چودھری صاحب کے کہ ایک صاحب قصہ بیان کرنے سے پہلے قصہ گوئی کے رموز کے بارے میں یوں گل افشانی فرماتے

---

۲۳ ''گناہ کا خوف'' صفحہ ۴۴۳

ہیں: ''فنِ مصوری میں استاد لوگ درخت اور باغ کہیں سے' عمارت کہیں سے' بادل کسی اور ملک سے لے کر تصویر مکمل کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح میں بھی گاؤں' ٹھاؤں' ناؤں اور زمانہ بدل دوں تو اعتراض نہ کیجئے گا۔۔۔۔ حافظ کے دیوان سے لوگ فال نکالتے ہیں' جس میں ہر شخص کو آپ بیتی مل جاتی ہے۔ مگر آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ تمام فال کھولنے والوں کا پتہ بھی حافظ کو نہ تھا۔ اسی طرح اگر میری گزارش میں کوئی بات فطرت کے موافق نکل آئے تو ممکن ہے کہ مجھ پر گذری ہو' ممکن ہے ہم آپ دونوں پر گذر چکی ہو یا آئندہ گذرے۔ خیر ہم پر اب کیا گذرے گی آپ لوگوں پر گذرے'' ۲۴

ایک مصور کسی منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کے مختلف اجزاء نہ جانے کہاں کہاں سے لاکر جمع کر دیتا ہے' صرف حسن و خوبصورتی پیدا کر دینے کی خاطر۔ بالکل اسی طرح کوئی کہانی بیان کرنے کے لئے ایک اچھا قصہ گو مکان' زبان اور کرداروں کے نام وغیرہ ادھر ادھر سے لاکر قصے میں جان ڈالنے کی کوشش میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ اور یہ ساری باتیں مبالغہ آرائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتیں۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ حافظ شیرازی کے دیوان سے فال نکالتے ہیں' حالانکہ بے چارے حافظ شیرازی ایک عام انسان تھے اور نعوذ باللہ پوری دنیا میں بسنے والے انسانوں کے مستقبل سے تو واقف تھے نہیں۔ غیب کی باتیں تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ مگر لوگ انتہا درجہ کی مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے اس دیوان سے ہر ایک کے مستقبل کا حال نکال لیتے ہیں۔ انہیں موضوعات کو چودھری محمد علی نے بڑی چابکدستی سے طنزیہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

کہیں کہیں چودھری محمد علی کا لب و لہجہ بہت زیادہ متین و سنجیدہ ہو جاتا ہے وہ تمسخر سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے قلم سے پھبتیاں نہیں نکلتیں۔ وہ نہایت بے تکلفی سے قہقہے نہیں لگاتے اور نہ دوسروں کو قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ پر وقار انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور ان خیالات میں بڑی گہرائی ہوتی ہے۔ طنز کے ساتھ ساتھ انکی سنجیدگی' شگفتگی' لطافت اور باریک بینی برقرار رہتی ہے۔ مثلاً ٹیگور کے بارے میں چودھری محمد علی ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں ''سمپسن جب اندھا کر دیا گیا' تو اس نے کہا روشنی کی ایسی نعمت اتنی چھوٹی' مختصر اور نازک جگہ میں کیوں رکھی گئی کہ جس بدتمیز کا دل چاہے اس کو بگاڑ کر اندھیر کر دے۔ ارے اس کو تو سر سے پاؤں تک ہر جگہ ہونا چاہئے کہ اگر کوئی مٹانا بھی چاہے تو نہ مٹا سکے۔ یہی حال اچھے آدمیوں کی زندگی کا ہوتا تو خوب تھا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ ٹیگور اگر صرف اسی برس جئے تو کیا جئے۔ ان کو تو اس طرح جینا چاہئے تھا کہ جیسے ان کی شاعری زندہ رہے گی'' ۲۵

---

۲۴ ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' صفحہ ۲۹۲ ۲۵ ایضاً' صفحات ۳۱۰ تا ۳۱۱

انگریزی ادب کا مشہور شاعر ملٹن جب نابینا ہوگیا تو اسے آنکھوں کی روشنی کا اندازہ ہوا اور اس نے بڑی خوبصورت بات کہی کہ آنکھ کی یہ روشنی اس قدر اہم ہے کہ اسے انسان کے سارے جسم میں سرایت شدہ ہونا چاہئے تاکہ یہ حیات انسانی تک قائم ودائم رہے۔ اسی بات کو چودھری صاحب نے ٹیگور کی شاعری سے انتہا درجہ متاثر ہوکر طنزیہ انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ انہیں تو خود اسی طرح جاوداں رہنا چاہئے تھا جیسے ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہیگی۔

وزیر آغا نے کامیاب مزاح نگاری کے اظہار کے لئے چار طریقہ ہائے کار بتائے ہیں۔ ''مزاح نگاری اپنے نمود کے لئے جن عناصر کی رہین منت ہے ان میں سے ایک موازنہ ہے۔۔۔۔ دوسرا زبان وبیان کی بازی گری ہے۔۔۔۔ مزاح نگاری کا تیسرا حربہ مزاحیہ صورتِ واقعہ ہے۔۔۔۔ اور مزاح نگاری کا چوتھا حربہ مزاحیہ کردار ہے۔۔۔۔ مزاح نگاری کا آخری حربہ پیروڈی یا تحریف ہے'' ۲۶ چودھری محمد علی ردولوی کی تحریر میں ہمیں طنز ومزاح سے متعلق وزیر آغا کے وضع کردہ یہ چاروں عناصر گاہے بگاہے نظر آتے ہیں۔ دو چیزوں کی آپس میں بیک وقت مشابہت اور تضاد سے وہ ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں جو ہنسی کو بیدار کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ چودھری صاحب نے کہیں کہیں اس حربے سے استفادہ کیا ہے۔

عام زندگی میں موازنے کی مثال کسی شریر آئینے کا وہ عکس ہے جو کسی فرد کو مضحکہ خیز حد تک بگاڑ دیتا ہے۔ یہ عکس بیک وقت اس فرد کا اصلی عکس بھی ہے اور اس سے قطعاً مختلف بھی اور اسی لئے یہ مزاح کو پیدا کردیتا ہے۔ مثلاً ایک عمر رسیدہ شوہر اور کمسن بیوی کے خیالات کے فرق پر چودھری صاحب کس خوبصورتی سے طنز کرتے ہیں۔ ''ایک بڑے بدصورت' ادھیڑ میاں اور ایک خوبصورت کمسن بی بی راستے میں چلے جاتے تھے۔ بی بی نے ایک کتے کی جوڑی دیکھی' جو دونوں ایک ہی طرح کے تھے۔ میاں سے کہنے لگیں ایسا جوڑ ملتے بھی کم دیکھا ہوگا۔ انہوں نے جواب دیا ساتھ رہتے رہتے پہلے خیالات اور پھر صورت ملنے جلنے لگتی ہے۔ بی بی کا جی دھک سے ہوگیا' کہنے لگیں میری جان کیا ہمیشہ یہی ہوتا ہے؟'' ۲۷

شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند　　صحبتِ طالع ترا طالع کند

صحبت کا اثر لینا تو فطرتِ انسانی ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کی فطرت ہے۔ یہ کسی بھی جاندار کے ماحول کا اہم ترین جزو ہوتا ہے۔ ماحولیات کے اسی اہم نکتہ کو یہاں چودھری صاحب نے بہت ہی اچھی مثال دیتے ہوئے طنزیہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

صورتِ واقعہ سے پیدا ہونے والا مزاح وہ ہے جو کسی شعوری کاوش کا رہین منت نہ ہو بلکہ از خود حالات وواقعات کی ایک مخصوص نہج یا کردار کی مخصوص ناہمواریوں سے پیدا ہوجائے۔ چنانچہ ایک اچھا مزاح نگار غلطی' غلط فہمی اور اتفاقِ وقت

---

۲۶ ''نقوش'' طنز ومزاح نمبر صفحات ۳۶ تا ۳۹　　۲۷ کشکول' صفحات ۸۰ تا ۸۱

سے بھی کام لیتا ہے۔لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کوشش کرتا ہے کہ عملی مذاق سے بہت کم مدد لے۔ چودھری محمد علی کا تحریر کردہ ایک مضمون جس میں وہ ماہِ رمضان میں ایک دکان پر ایک خریدار اور دکاندار کی جھڑپ کا نقشہ کس انداز سے کھینچتے ہیں ''ان حضرات کے منہ سے جھاگ اڑ رہی تھی۔لہریں نہیں بلکہ جوار بھاٹے آ رہے تھے۔ ہونٹوں کے کناروں پر سمندر پھین جمتا جاتا تھا۔اوران دو نیک لوگوں میں ہم روزہ خور' گناہ گار پھنس گئے تھے۔ان کے منہ سے خوشبوؤں کے بقعے بق بق اڑ رہے تھے۔ اور ہم محسوس کر رہے تھے کہ روزہ نہ رکھنے کے عذاب میں گرفتار ہیں'' ۲۸

بعد از عصر روزے کی تکان اور بڑھ جاتی ہے۔ خالی معدہ دماغِ انسانی کو زیادہ متاثر کرنے لگتا ہے۔ پیاس کی شدت مزید بڑھ جاتی ہے۔اور اگر اس حالت میں غصہ آ جائے تو ایسے انسان کی کیا کیفیت ہوگی؟ اسی حالت کا شکار دو لوگوں کے لڑنے جھگڑنے کا نقشہ چودھری صاحب نے اپنے اس مضمون میں کھینچا ہے اور ساتھ ہی ساتھ طنز اس بات پر ہے کہ انسان مذہبی فرائض کے دوران اگر نفسِ عمارہ پر قابو رکھ سکے تو یہی مقصدِ عبادت ہے۔

مزاحیہ کردار کی بدولت تمام ماحول مضحکہ خیز صورت اختیار کر جاتا ہے۔ مزاحیہ کرداروں کو نمایاں کرنے کے لئے پہلے ایک مناسب ماحول پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ایک کامیاب مزاح نگار کردار کے اجزاء یا عناصر کے مابین اس خلیج کو نمایاں کر کے دکھاتا ہے' جس سے ناظر کو کردار کی ناہمواریوں کا احساس ہو سکے۔ چنانچہ مزاح نگار کی نظرِ انتخاب ایک ایسے کردار پر پڑتی ہے جس میں لچک کا فقدان ہوتا ہے۔ چودھری صاحب ایک ایسے ہی دلچسپ کردار کو کس طرح تراشتے ہیں:

''ایک تھے میاں حسنو' قوم کے فقیر کہلاتے تھے مگر ہم کو تو قلمی ہی سے معلوم ہوتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ نہ تکیہ نہ قبرستان نہ کسی بزرگ سے نسبت نہ مجاوری' پیالے کی آیت تک یاد نہ تھی۔ بھیک بھی وضع داری سے مانگ لیتے تھے ورنہ جھولی' کشکول' تونبی' دسپنا' فقیری کے تمغوں میں سے کچھ بھی تو نہ تھا۔کنٹھے' کوریاں بھی گلے میں کبھی نہ دیکھیں۔البتہ اذان دے لیتے تھے۔ مسجد بھی قریب نہ تھی۔اور کسی قبرستان میں کوئی تکیہ دار ان کو کاہے کو اذان دینے دیتا۔ یوں کہیں تازہ قبر دیکھتے تھے تو غلط سلط اذان دے پڑتے تھے'' ۲۹

چودھری محمد علی کی ہر تحریر خواہ خطوط ہوں یا افسانے طنز و مزاح کی آمیزش سے بھرپور ہیں' جگہ جگہ مزاح بکھرا پڑا ہے۔انہوں نے صحیح معنوں میں اردو کو ظرافت اور ظرافت کو ادبی رنگ اور ادبی رنگ کو آفاقیت بخشی ہے۔ان کی تحریر میں روانی اور اسلوب میں جان ہوتی ہے' جس کی وجہ سے انکے مزاح کا ادب میں ایک مقام ہے۔ وہ روزآنہ کے معاملات'

---

۲۸ کشکول محمد علی شاہ فقیر' صفحات ۶۷ تا ۷۷ ۲۹ ایضاً' صفحات ۱۱۳ تا ۱۱۴

اشخاص کے کردار اور واقعات کے موزوں انتخاب سے کام لیتے ہیں اور بعض چھوٹی چھوٹی باتوں سے ایسا طنز پیدا کرتے ہیں جن میں مزاح ہوتا ہے۔ بات میں سے بات نکالنا اور ہر بات میں نئی بات پیدا کرنا ان کا فن ہے۔ چودھری صاحب نے ہر اس چیز پر طنز کیا ہے جو فرد کی آزادی، سکون اور آسودگی کو تباہ کرتی ہے۔ وہ ڈپٹی کلیکٹر ہو یا کیپٹن، ملازم ہو یا سیاست داں، بنیا ہو یا گاہک، ایڈیٹر ہو یا موسیقار، فن کار ہو یا کفایت شاعر بیوی، شاعری ہو یا عدم تعاون، اپنی کمزوری ہو یا دوسروں کی حماقت، غرض انہوں نے ہر ایک کو طنزیہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

باب ہفتم

چودھری محمد علی ردولوی بحیثیت خاکہ نگار

۱۔ فنِ خاکہ نگاری:۔

کسی شخص کی سیرت اور اس کے افکار کو ہلکے پھلکے انداز میں تحریر کرنے کے عمل کا نام خاکہ نگاری ہے۔ کبھی کبھی خاکوں میں کسی کی سوانح حیات کا مزاح آمیز عکس نظر آتا ہے۔ لیکن مزاح اسی قدر شامل کیا جاتا ہے کہ اس سے دل آزاری نہ ہو اور اصل چہرہ بگڑنے نہ پائے۔ دراصل خاکہ شخصیت کی کمزوریاں یا خامیاں بیان کرنے کی غرض سے تحریر نہیں کیا جاتا بلکہ کسی کی حقیقی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ خاکہ نگاری کے پسِ پردہ کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے اور خاکے کسی مقصد کے تحت تحریر کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر قلم کار کسی کی مسحور کن شخصیت سے بری طرح متاثر ہوتا ہے اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اس شخصیت سے اسی کی طرح متاثر ہوں اور یہ تحریک خاکہ نگاری کا باعث بنتی ہے۔

خاکہ نگاری دراصل تاریخ نویسی اور سوانح نگاری سے الگ صنفِ ادب ہے۔ تاریخ نویسی کے دوران شخصیت کے کارنامے بیان کئے جاتے ہیں اور سوانح نگاری میں شخصیت کی مکمل سوانح عمری تحریر کی جاتی ہے۔ جبکہ خاکہ نگاری میں شخصیت کی جھلک کا انعکاس کیا جاتا ہے۔ خاکہ شخصیت کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر پیش کرتا ہے۔ خاکہ نگاری بظاہر آسان مگر مشکل صنفِ ادب ہے۔ یہ شخصیت کی ترجمانی اور مرصع سازی کا ایک ایسا فن ہے جس میں افراط وتفریط' غلو مدحت طرازی سے کام لینے اور مدح سرائی کرنے کے بجائے جو شخصیت جیسی ہے من وعن اس کو اسی طرح ادبی پیرائے میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ شخصیت کی جامع عکاسی کر سکے۔ خاکہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں شخصیت کی فکری یا عملی زندگی کو اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کی خارجی اور داخلی دونوں جہتیں خاکہ میں سمو جائیں۔

سوانح اور خاکہ :

شخصی زندگی کے حالات اور شخص کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کی تصویریں ادب کی اہم ترین شاخیں ہیں۔ کسی شخص کی سیرت بیان کرنے میں اس کی زندگی کے جملہ کارناموں کا مفصل جائزہ لینا ہوتا ہے پیدائش سے لے کر اس کے انتقال تک سال بہ سال رونما ہونیوالے تمام قابلِ ذکر اور اہم واقعات کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ سیرت ایک ناول کے مانند وسیع اور ضخیم ہوتی ہے' جس میں تمام ضروری اور اہم امور کا پھیلا کر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ خارجی اثرات' افتادِ طبع اور ایک

دوسرے کے عمل اور ردِعمل کا بڑے پیمانے پر ذکر ہوتا ہے۔ خاکے میں کسی افسانے کی طرح اطناب و ایجاز سے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوانح میں متنازعہ فیہ مسائل پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے طویل و عریض بحث کی جاتی ہے اور بعد ازاں نتائج اخذ کئے جاتے ہیں' جبکہ خاکے میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کم سے کم وقت میں بہت کچھ کہہ دینے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ سوانح تحریر کرتے ہوئے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی قابلِ ذکر بات کہنے سے رہ نہ جائے جبکہ خاکے میں ہر بات کا کہنا ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اگر یہاں ہر بات کہی جائے تو بننے والی تصویر کا خاکہ بگڑ جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ اگر بعض معاملات پر مختلف اصحاب کی آراء کی جانچ پڑتال شروع کر دی جائے تو مرقع نہ صرف اپنے مقصد سے دور چلا جائے گا بلکہ خاکے کے بجائے علمی مضمون یا تحقیقی مقالہ بن جائے گا۔ اس طرح خاکہ اپنے مقصد اور ان حدود کے پیشِ نظر جنہیں سامنے رکھ کر یہ تحریر کیا جاتا ہے سوانح نگاری سے قطعاً الگ انفرادی وجود رکھتا ہے۔

تذکرے اور خاکے:۔

تذکروں یا مختصر حالاتِ زندگی میں سالِ پیدائش سے لے کر وفات تک رونما ہونے والی اہم اور موٹی موٹی باتوں کو چن کر پیش کیا جاتا ہے' اور کوئی قابلِ ذکر بات چھوٹنے نہیں پاتی۔ اگر متذکرہ شخص صاحبِ تصنیف ہے تو اس کی تصانیف کے نام' سنِ اشاعت' ان پر تنقید' اگر سائنس داں ہے تو اس کی تحقیقات' مقالوں کی اشاعت' تحقیق کی اہمیت' اس کے اثرات اور مضمرات' اگر سیاست داں ہے تو اس کی انتخابات میں کامیابی' سیاسی فتوحات' سیاسی وابستگیاں' اہم مجلسی اصطلاحات' انتظامِ حکومت کے طریقے اور بعض اہم ملکی معاملات میں ان کا حصہ وغیرہ دکھا کر اس کے سالِ وفات پر یہ افسانہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ مگر کسی کے خاکے میں نہ سنِ پیدائش کی ضرورت ہے' نہ تصانیف اور ان پر تنقید کی' نہ تحقیقاتی مقالہ جات کی اشاعت اور نہ ان کے مضمرات کی' نہ سیاسی وابستگی سے دلچسپی ہوتی ہے اور نہ نظامِ حکومت چلانے کے طریقوں کی۔ خاکہ کا مقصد تو شخصیت کی تصویر بنانا ہوتا ہے۔ یہاں یہ دیکھنا نہیں ہوتا کہ اس شخص نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ نہ یہ جانچنا کہ وہ اپنے افعال پر ہماری ملامت کا سزاوار ہے یا نہیں۔ ان مباحث کا صحیح مقام تذکرہ ہیں یا سوانح۔ خاکہ نگار پر یہ پابندی نہیں کہ وہ تمام واقعاتِ زندگی پر سرسری نظر ڈالے۔ وہ تو محض ان واقعات کو کام میں لاتا ہے جن سے شخصِ مذکورہ کی تصویر کے خد و خال بنانے میں مدد ملتی ہو' خواہ وہ واقعات اہم ہوں یا غیر اہم۔ اس طرح اپنے مقصد' واقعات کے انتخاب اور مختلف نتائج تک پہنچنے پہنچانے کی کوشش کے لحاظ سے تذکروں اور خاکوں کے راستے جدا ہو جاتے ہیں اور دونوں ادب کی دو مختلف شاخیں قرار پاتی ہیں۔

کردار نگاری اور خاکہ:۔

افسانوی کردار اور کسی خاکے میں اول تو بہت کچھ طرز اور ساخت کا فرق ہوتا ہے۔ خاکے میں موضوع کوئی ایسی شخصیت ہوتی ہے جو حقیقی دنیا میں گزری ہو اور اس کی تاریخی حیثیت مشتبہ نہ ہو۔ اصلی زندگی میں اس کا واضح اور صاف نشان مل سکے۔ مگر افسانہ نویسی پر یہ پابندی نہیں وہ اگر چاہے تو کسی حقیقی انسان کے بجائے خیالی ہستی کو اپنا موضوع بنا سکتا ہے۔ افسانوی کردار اور خاکے میں دوسرا فرق یہ ہے کہ افسانہ نگار اگر کسی حقیقی انسان کو موضوع قرار دے تو اپنے تخلیقی رنگ سے اسے کچھ کا کچھ بنا سکتا ہے۔ اس کی اصلی شکل کو مسخ کر کے اپنی حسب مرضی تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ اور کبھی تسلسل برقرار رکھنے کی غرض سے، کبھی قصے میں ڈرامائی عنصر داخل کرنے کی نیت سے اور بسا اوقات افسانے کو زیادہ دلچسپ بنانے کے واسطے کردار میں حذف و اضافہ کر سکتا ہے۔ اور اگر اس کی فنی ضرورت مجبور کرے تو وہ ان ہونی کو ہونی بھی کر دکھاتا ہے مگر خاکہ نگار کا قلم اور ذہن ہر طرف سے جکڑا ہوتا ہے۔ اس کا کام نہ اتنا آسان ہے اور نہ اسے اتنی آزادی حاصل ہے کہ وہ حقیقت سے تجاوز کر سکے۔ وہ واقعات گڑھ کر کچھ کا کچھ نہیں بنا سکتا۔ وہ اسی قدر لکھے گا جتنا در حقیقت پیش آیا ہو۔ وہ پابند ہوتا ہے کہ جو واقعات اور حالات واقعی گذرے ہوں ان کو بیان کر دے۔ افسانوی کردار اور خاکے میں تیسرا فرق تاریخی عنصر کا ہے۔ اول الذکر محض فرضی اور تخلیقاتی ہونے کے باعث کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتے۔ مگر خاکہ میں تاریخی عنصر کا ہونا لازمی ہوتا ہے تاکہ شخصیت محض خیالی نہ محسوس ہو۔ یہ تاریخی عنصر موضوع کے واقعی ہونے کا ضامن بھی ہوتا ہے اور حقیقی دنیا میں اس کی تلاش میں مدد معاون بھی ہوتا ہے۔

کرداری خاکے اور شخصی خاکے:۔

کرداری خاکے سے مراد وہ خاکے ہیں جو سوسائٹی کے بعض محاسن اور عیوب کو نمایاں کرنے کی غرض سے حقیقی زندگی کے بعض افراد کی خوبیوں یا خامیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان میں انسان اپنے اصلی ماحول کے ساتھ پیش نہیں کیے جاتے، بلکہ ہر طبقے کو ایک فرد تصور کر کے اسے انسانی قالب پہنا دیا جاتا ہے۔ اور اس کے تمام عیوب یا خوبیاں ایک کردار میں نمایاں کر دی جاتی ہیں۔ اس قسم کے کردار اپنے اپنے طبقے کے نمائندے ہوتے ہیں۔ کرداری خاکے کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ بعض لوگوں کی خوبیاں اور خامیاں نمایاں کرنے کے لئے اس شخص کا کردار فرضی نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ نام یا اس فرد کی حرکات میں کوئی نکتہ ایسا رکھا جاتا ہے کہ جس سے ذہن فوراً اس نمایاں یا مشہور شخصیت کی طرف منتقل ہو جائے۔ یہ اس قسم کی نگارش کا تمثیلی انداز ہے۔ چونکہ اس تمثیلی نگارش کا موضوع بھی کوئی انسان ہی ہوتا ہے لہٰذا ناموں اور مقاموں کے

مفروضات سے قطع نظر اس کرداری خاکے اور شخصی خاکے میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان دونوں خاکوں میں مفروضات اور مبالغہ آمیزی کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں۔

۲۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری:۔

اردو زبان کے ادبی خزانے کو اگر کھنگالا جائے تو سب سے پہلے محمد حسین آزاد کی تحریر کردہ ''آب حیات'' میں بعض شعراء کا احوال خاکے کے انداز میں ملتا ہے۔ لیکن ''آبِ حیات'' کی تکنیک کسی ڈرامے کی سی ہے۔ یہ ایک مشاعرے کی روداد ہے' جس میں مختلف ادوار کی محفلیں بار بار سجتی ہیں اور ایک شاعر اپنے دور کے ہمراہ آتا ہے۔ یہاں شاعروں کی شکل و صورت' جسامت اور لباس' وضع قطع' تراش خراش گویا ہیئت آرائی کے ہر پہلو کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر اس ضمن میں آزاد کی توجہ چہرہ نویسی سے زیادہ لباس پر رہی ہے۔ مصنف نے شعراء کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے اور ان کی نفسی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش نہیں کی' اور اگر کہیں کسی قدر نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے تو اس پر مصنف کی اپنی پسند کا رنگ غالب ہے۔ جس کے باعث تصویر یک رخی ہو کر رہ گئی ہے۔ آزاد کے تحریر کردہ شعراء کے ہر حالات نیم خاکے تو ضرور ہیں مگر ان کا رجحان سوانحی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے ۱۹۲۷ء میں تحریر کردہ خاکے ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کو عموماً اردو کا پہلا باقاعدہ خاکہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں نذیر احمد کی زندگی کی روداد بھی نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ اور کسی قدر منتشر صورت میں آ گئی ہے۔ خاکے میں کسی مخصوص تکنیک کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ نذیر احمد کی خامیاں ہی خامیاں بیان کی گئی ہیں۔ ان کی شکل' مشابہت' لباس' وضع قطع' گھر پر اور گھر سے باہر ہیئت کذائی' مکان کا جزوی نقشہ وغیرہ کا بیان ہے۔ گویا نذیر احمد کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس کی جزئیات اپنی جگہ بھرپور ہیں' لیکن نفسیاتی تصویر پوری طرح سے واضح نہیں ہوتی۔ خاکوں کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ کی دوسری کتاب ''دہلی کا یادگار مشاعرہ'' ہے جس میں شعراء کا حلیہ ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری میں شخصیت کی ہیئت کذائی' اس کے مکان اور خانگی رہن سہن کے بہت زیادہ تفصیلی تذکرے کئے گئے ہیں۔ نشست و برخاست' آداب' عادات و اطوار وغیرہ کے سلسلے میں ان کا زاویہ نظر زیادہ تر خارجی ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کی تحریر اردو خاکہ نگاری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ حالانکہ اس سے قبل سجاد حیدر یلدرم' حسرت موہانی کا خاکہ ''خانی خان'' کے نام سے تحریر کر چکے تھے جو ''زمانہ'' کانپور کے دسمبر ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع ہو چکا تھا مگر اسے وہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔

جولائی ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر سید عابد حسین نے آل انڈیا ریڈیو پر پڑھے جانے والے گیارہ مختصر خاکوں کا مجموعہ ''کیا خوب آدمی تھا'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ مختلف لوگوں کے مختلف زمانے میں تحریر کردہ خاکے تھے' لہٰذا مختلف طرز اور مختلف اسلوب کے حامل تھے۔ ۱۹۳۹ء میں جے نند کمار نے پریم چند پر ایک مختصر لیکن انتہائی موثر خاکہ تحریر کیا' اور پریم چند جیسے تھے ویسا ہی انہیں پیش کرنے کی کوشش کی۔ مئی ۱۹۴۳ء میں بشیر احمد ہاشمی کی کتاب ''گفت وشنید'' شائع ہوئی جس میں بعض پیشہ وروں کی عمومی خصوصیات کے مجموعے سے خاکے کے لگ بھگ کوئی چیز پیدا کرنے کی سعی کی گئی۔ بیرا' منشی' شاعر' ہیڈ ماسٹر' پروفیسر' ایڈیٹر حضرات میں پیشے کے لحاظ سے جو عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں ان کو مضحکہ خیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ خاکہ نگاری کے امکانات میں اضافہ ہو گیا۔

ابتداء میں تحریر کردہ خاکے نفس مضمون کے اعتبار سے خواہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ تھے مگر ان کا اسلوب قدیم تھا۔ وہ اس زور سے محروم تھے جو بعد کی سادہ تحریروں میں نظر آتا ہے۔ وہاں کافی تکلف تھا اور بات اس عہد کے تہذیبی وضعداریوں کے بوجھ سے دبی ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ اسلوب سنورتا جاتا ہے اور تکلف کے بادل چھٹتے جاتے ہیں' اور ماضی الضمیر کا اظہار براہِ راست ہوتا ہے۔ خاکوں میں دوسری اہم تبدیلی یہ آئی کہ پہلے تو فقط خوبیوں کی فہرست تیار کی جاتی تھی' مگر آہستہ آہستہ کمزوریوں سے بھی ہمدردانہ طور پر پردے اٹھائے جانے لگے۔ مولوی عبدالحق' رشید احمد صدیقی' خواجہ حسن نظامی' چراغ حسن حسرت' عبدالمجید سالک' سعادت حسن منٹو اور شوکت تھانوی وغیرہ نے خاکوں کی صنف کو عروج پر پہنچایا۔ یوں تو خاکہ نگاری میں ہلکے پھلکے اسلوب کو اہمیت دی جاتی ہے اور اسی لئے ان سب اصحاب فن کے یہاں یہ صنف موجود ہے۔

رشید احمد صدیقی کے تحریر کردہ بعض خاکوں میں ہلکی سی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ ''ایوب عباسی'' ''کندن'' اور ''ذاکر صاحب'' ان کے لکھے ہوئے خاکے اور گنج ہائے گراں مایہ'' تیرہ خاکوں کا مجموعہ ہے۔ رشید صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس فن کو رفعتوں سے آشنا کیا اور شخصیتوں کی ذاتی اہمیت سے قطع نظر خاکوں کو بذاتِ خود مقبول عام بنا دیا۔ رشید صاحب نے پہلی مرتبہ ہمیں احساس دلایا کہ یہ فن اتنا جاندار ہے کہ اگر اسے صحیح معنوں میں برتا جائے تو ایک عام انسان کو ہزار ہا ادیبوں اور ادب شناسوں کی دلچسپیوں کا محور بنایا جا سکتا ہے۔ ''ایوب عباسی'' کو اگر اردو کا بہترین خاکہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ عام طور پر اردو کا بہترین خاکہ عصمت چغتائی کا ''دوزخی'' سمجھا جاتا ہے۔ یہ عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ ہے اور اسے اس کی برجستگی اور شگفتگی کے باعث ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کی تکنیک کرداری افسانے جیسی ہے۔ اس کا اندازِ بیان چبھتا ہوا اور زاویہ نظر انوکھا ہے۔

خاکہ کے مروجہ اصولوں میں سے سعادت حسن منٹو نے صرف شکل ومشابہت ہی کو قابلِ التفات سمجھا ہے اور بعض

لوگوں کے حلیئے لکھے ہیں ۔منٹو کا یہ منفرد انداز اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں قابلِ قدر اضافہ ہے ۔شوکت تھانوی کے تحریر کردہ خاکوں کے مجموعے ''شیش محل'' میں موجود شگفتگی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ طنز اور شخصیت کے عمیق پہلوؤں کو چند جملوں میں بے نقاب کردینے کی خوبی نے اسے اردو خاکہ نگاری میں اہم اور سنگ میل بنا دیا ہے ۔۱۹۵۴ء میں شائع ہونے والی ڈاکٹر اعجاز حسین کی مختصر سی کتاب ''ملکِ ادب کے شہزادے'' جنوری ۱۹۵۵ء میں اشاعت پانے والا ماہنامہ ''نقوش'' لاہور کا شخصیات نمبر' دسمبر ۱۹۵۵ء میں عبدالمجید سالک کا تحریر کردہ ''یارانِ کہن'' جولائی ۱۹۶۱ء میں ضیاء الدین برنی کی ''عظمتِ رفتہ'' ۱۹۶۲ء میں شاہد احمد دہلوی کا ''گنجینۂ گوہر'' اور اپریل ۱۹۶۳ء میں علی جواد زیدی کی کتاب ''آپ سے ملیئے'' خاکوں کے بیش بہا مجموعے ہیں ۔ان خاکوں میں صرف زندہ تصاویر ہی نہیں سجائی گئی ہیں' بلکہ مذکورہ اشخاص کے علمی و ادبی کارناموں پر بھی اچٹتی نظر ڈالی گئی ہے ۔ یہ خاکے تکنیکی لحاظ سے زیادہ مکمل ہیں ۔ان میں اسلوب بیان' ترتیب واقعات' دلچسپی' شخصیت کے عمیق مطالعے اور خاکے کے جمالیاتی اوصاف کو مدِنظر رکھا گیا ہے ۔

اردو میں خاکہ نگاری کی مختصر مگر تیز رفتار تاریخ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب سیرت نگاری بے جان یا سرد واقعات کا انبار نہیں رہی بلکہ اس میں زندگی' قوت اور حسن کا حسین امتزاج ملتا ہے ۔ خاکہ نگار جیتے جاگتے کرداروں کی از سرِ نو تخلیق کرتا ہے' جن میں خوف بھی ہے اور گرمی بھی' رنگ بھی ہے اور روشنی بھی' دھوپ بھی ہے اور چھاؤں بھی' مگر ان سب کے ساتھ ساتھ اصلیت بھی ہے اور اسی کا نام ہے زندگی ۔

۳۔ چودھری محمد علی کے تحریر کردہ خاکے :۔

''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' چودھری صاحب کے افسانوں' کہانیوں' انشائیوں اور خاکوں کا دلچسپ مجموعہ ہے ۔اس میں مس ہیلن' راجہ پرتھی پال سنگھ' یاد احباب' استاذ' غریبی میں امیری' مرزا منش' میر باقر' میر یوسف' نفاست' میٹھا معشوق' خوش مذاقی کے اندھے وغیرہ عنوان کے خاکے شامل ہیں ۔ علاوہ ازیں چودھری صاحب نے ''اتالیق بی بی'' کے عنوان سے ایک اور کتاب تحریر کی ہے جس میں چودہ خاکے پیش کیئے گئے ہیں ۔ یہ مختلف اشخاص کے خاکے نہیں بلکہ ان سب میں ایک ایسی بیوی کا خاکہ کھینچا گیا ہے جو شکایاتِ مجسم ہے ۔ جو اپنے شوہر کی ہر بات میں کیڑے نکالتی ہے' طعنہ زنی کرتی اور صلواتیں سناتی ہے ۔ ہر خاکے میں ایک نئے اور مختلف موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے ۔ کردار نگاری کا حیرت انگیز ملکہ رکھنے والے چودھری صاحب نے جس کا بھی خاکہ تحریر کیا ہے اس کی زندگی کے ہر پہلو کی ایسی تصویر کھنچ جاتی ہے جو کسی بھی اعتبار سے نامکمل نہیں لگتی ۔ ہر شخص کی زندگی میں کچھ ایسی ناہمواریاں بھی پائی جاتی ہیں جو ہنسی اور انبساط پیدا کرتی ہیں ۔ چونکہ چودھری صاحب کی

نظر مضحک پہلوؤں پر بہت تیز پڑتی ہے اور وہ انہیں بیان کرنے کا بہترین سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے جہاں کہیں خاکوں میں اس پہلو کو پیش کیا گیا ہے' حسبِ موقع تبسم اور قہقہوں کا سامان بخوبی پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور ان تمام خاکوں میں شگفتگی و برجستگی برقرار رہی ہے۔

۴۔ چودھری صاحب کی خاکہ نگاری کا فن :۔

چونکہ چودھری صاحب باغ و بہار طبیعت رکھنے والے زندہ دل انسان تھے۔ ان کی گفتگو نہایت دلچسپ اور دل آویز ہوا کرتی تھی۔ اسی لئے ان کی طبیعت کی لطافت و شگفتگی' بے تکلفی' شوخی اور تیز حس مزاح ان کے تحریر کردہ خاکوں میں بھی جابجا نمایاں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر:

''بعضوں کے نزدیک ان کا قد بہت کشیدہ تھا۔ ان کی ٹھڈی اور ناک بہت نمایاں تھیں' اور ان کی ہنسی میں رونق نہیں تھی۔ لکھنے والے کے نزدیک ان کے قد کی برائی صرف وہ لوگ کرتے تھے جو خود لمبے نہیں تھے۔ ان کی ٹھڈی اور ناک ان لوگوں کو بری لگتی تھی' جنہوں نے روم کی سنگی دیواروں پر غور نہیں کیا تھا۔ ہنسی کو بے رونق وہ لوگ بتاتے تھے جن کا مزاق پسند ایک عورت پر ختم ہو کر رہ گیا تھا۔۔۔ سبھی سے نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتی تھیں۔ اور جنسی معاملات پر اس طرح گفتگو کرتی تھیں جیسے مولوی لوگ مذہبی کتابوں کے جنسی مسائل پڑھاتے ہیں۔ اس طرح گفتگو شروع ہوتی تھی تو نوجوانوں کے دلوں میں امیدوں کا طوفان بند ھتا تھا۔ جب ختم ہوتی تو بحث کرنے والوں کو بور کے لڈو یاد آ جاتے تھے۔ جن کی نسبت مشہور ہے کہ جو کھائے وہ پچھتائے جو نہ کھائے وہ پچھتائے'' [۱]

اسی خاکے میں چودھری صاحب آگے چل کر کچھ یوں نقشہ کھینچتے ہیں:

''مگر تم اس عورت کی قطع دیکھتی ہو۔ کمر کو لے اتنے بھاری' سینہ اتنا بڑا' پاؤں میں مردوں کے ایسے بال اور ساڑھے آٹھ نمبر کا دستانہ پہننے والی' بھلا تمہارے خیال میں اس کا کیا سن ہوگا'' [۲] یہاں ایک عورت دوسری عورت کی ہیئت کذائی کا نقشہ کھینچتی ہے۔ جس سے اس کی اس نفسیاتی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے حسن و جوانی کے انداز سے خوش نہیں۔ اس کی خوبیوں میں بھی کیڑے نکالتی ہے اور حسن میں بدصورتی تلاش کرتی ہے۔ اس کی اچھائیاں بھی اسے بری لگتی ہیں۔

چودھری صاحب کے خاکوں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ مشاہیر پر نہیں بلکہ ان کے اردگرد کے معاشرے کی عام شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔ مثلاً: مس ہیلن' استاد شیخ جی' مرزا عابد' مرزا سجاد' میر سید محمد' باقر رضوی' میر محمد یوسف' بڑے

---

۱ ''مس ہیلن'' مشمولہ ''کشکول'' صفحات ۴۶ تا ۴۷ ۲ ایضاً صفحہ ۵۰

مرزا صاحب اور مولوی ابراہیم وغیرہ ایسے حضرات ہیں جن پر اگر چودھری صاحب خاکہ نہ لکھتے تو انہیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ اس میں انہوں نے اپنے ہم عصر اور اپنی طرح کے بڑے بڑے تعلقہ داروں مثلاً درگا ہی خان اور نوابین مثلاً راجہ پرتھی پال سنگھ، نواب راحت حسین اور نواب مرزا صاحب پر بھی خاکے تحریر کئے اور ان کی عادات واطوار، طور طریقوں کا خوب خوب نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات مثلاً سماجی کارکن، استاد، زمیندار، ملازمت کے متلاشی اور غربت کے مارے نوجوان، پیر اور مولوی حضرات کے مزاج، طریقہ ہائے گفتگو اور طرز رہائش کی انتہائی شگفتہ انداز میں تصویر کشی کی ہے۔

چودھری صاحب اپنے ایک پرانے کلاس فیلو راجہ پرتھی پال سنگھ کی خصوصیات کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''صاف دلی، ذہانت، نیکی، بعض باتوں میں بہت نڈر، بعض باتوں میں بڑے ڈرپوک، مثلاً اندھیرے میں ہوے کر دو تو بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ بجلی چمکے تو لحاف سے منہ بند کر کے لیٹ رہیں۔ اگر بات پر اڑ جائیں تو چاہے جان ہی جائے اس پر قائم رہیں۔ دوست احباب کے کام آنے کے موقع کو ڈھونڈھا کریں۔ موٹے تھلتھلے آدمی تھے، فٹ بال فیلڈ میں خود فٹ بال معلوم ہوتے تھے۔ ٹینس غنیمت کھیلتے تھے، گھوڑے پر اچھا چڑھ لیتے تھے''۔[۳]

یہاں چودھری صاحب نے اچھائیاں اور برائیاں دونوں نہایت واضح اور دوٹوک الفاظ میں بیان کی ہیں اور زبان کی شگفتگی مسلسل برقرار رکھی ہے۔ اسی خاکے میں چودھری صاحب آگے چل کر ایک واقعہ تحریر کرتے ہیں ''رات کے تقریباً آٹھ بجے ہونگے، پرتھی پال سنگھ ہیڈ ماسٹر کے پاس پرائیویٹ ٹیوشن لے رہے ہیں۔ پڑھنے کے بعد رخصت ہوتے ہیں۔ برآمدے میں اندھیرا ہے، کونے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کالا بھجنگ آدمی دس فٹ کا قد مٹکے کا ایسا سر لئے کھڑا ہے۔ یہ ایک چیخ مار کر پھر کمرے میں گھس گئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب پر پھٹ پڑے۔ جھٹ پٹ جو لگی تو لیمپ بھی گر کر بجھ گیا۔ اچانک واقعہ ایسا ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی پرتھی پال سنگھ کی چیخ میں چیخ ملائی۔ نوکر جب تک آدیں آدیں کالا دیو رفو چکر ہو گیا تھا۔ لیمپ جلا تو لوگوں کے حواس بجا ہوئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب جو رضائی اوڑھے بیٹھے تھے اور اس وقت جو کرسی کے گدے کا کام بھی دے رہی تھی، صبح کو بیچ میں دھوئی نچوڑی ہیڈ ماسٹر صاحب کی دیوار پر پھیلی تھی۔ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے خطا ہو گئی یا پرتھی پال سنگھ سے آج تک نہ دریافت ہو سکا''۔[۴]

چودھری محمد علی نے یہاں پر منظر کشی اس خوبصورتی سے کی ہے کہ آنکھوں کے سامنے اس واقعہ کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے قاری خود اس منظر کا نظارہ کر رہا ہے۔ واقع کے بیان کے ساتھ ساتھ مسلسل شگفتگی و شوخی بھی برقرار

---

۳ ''راجہ پرتھی پال سنگھ''، مشمولہ ''سکٹول''، صفحہ ۱۳۸ ۴ ایضاً، صفحات ۱۴۰ تا ۱۴۱

رہتی ہے اور واقعہ کا اختتام مزاح پر ہوتا ہے۔ اور یہی انداز چودھری صاحب کی تحریر کی جان ہے۔

چودھری محمد علی کی خاکہ نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شخصیت کا مشاہدہ و مطالعہ بھی ہے اور گل افشانی گفتار بھی اور جا بجا ڈرامائیت اور مکالمے کا انداز بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً ''میٹھے معشوق'' کے عنوان سے کسی بڑے مرزا صاحب کے ایک سفر کا خاکہ بیان کیا گیا ہے' جس کے دوران دس بارہ سیر مٹھائی کے ایک ایسے ٹوکرے کی حفاظت کی جاتی ہے جو سوغات کے لئے لے جائی جا رہی تھی۔ اس میں مرزا صاحب کی شخصیت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:

''اللہ بخشے مرزا صاحب کا دماغ بذلہ سنجیوں کا ذخیرہ تھا' زبان چٹکلوں کی پوٹ تھی۔ پھر عمر بھی اتنی پائی کہ دوسرے کے پاس اتنا سامان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ انداز بیان کچھ ایسا تھا کہ سیدھی سیدھی بات' روزمرہ کے واقعات جب کہنے لگتے تھے تو داستان گو کی داستانیں مات تھیں۔ نہ معلوم کس طرح کا الٹ پھیر لفظوں کا ہوتا تھا کہ جملوں میں نئے نئے معنوں کی جھلک پیدا ہو جاتی تھی۔ فقروں کی اصلی معنی کے ساتھ ساتھ دوسرے پہلوؤں کی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ جیسے نگینے کی چھوٹ پڑتی ہے'' [۵]

آگے چل کر مرزا صاحب کے چچا یعنی بڑے مرزا صاحب کے سفر کے ہمراہیوں کی تفصیل چودھری صاحب کس خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہیں: ''خود بہلی پر' اور مصاحبت میں مختصر ریاست کے دیوان منشی بخت بلی کا کنبہ جن کے بغیر چھوٹی بڑی ریاست کا ہونا ویسے ہی ناممکن تھا جیسے ان کی ماش کی دال بے ہینگ کے ہو۔ جلو میں کارکن صاحب جن کو نائب کہہ لیجئے ٹٹو پر ایک لٹھ بند سپاہی اور دو نفر ہمراہی جن میں ایک بڑے مرزا صاحب کا خدمت گار اور دوسرا نائب صاحب کا نیم سائیس اور نیم خدمت گار' اور وقت ضرورت باورچی بھی'' [۶] مزید آگے سفر کے دوران ساتھ لے جانے والی اشیائے ضرورت کی تفصیلات یوں تحریر کی گئیں ہیں۔ ''بہلی کے ساز و سامان میں بچھونے' لالہ کی لوٹیا' مرزا صاحب کا لوٹا' جانماز' مختصر سامان مطبخ ایک عدد توا اور ایک دو پتیلیاں' کچھ دال مسالے کی پوٹلی بہلی کے پیچھے جال میں' مسل مقدمہ کی دیوانجی کی بغل میں'' [۷] یہاں انداز بیان کی روانی اور برجستگی قابلِ غور ہے۔

خاکے میں سفر کا حال بیان کرتے ہوئے مکالمے سے بھی کام لیا گیا ہے مثلاً:

''منشی جی: حضور! ایک بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ جو سزا دیجئے کم ہے۔ مجھ سے ایک چوک ہوگئی۔

مرزا صاحب: کیا چوک ہوگئی ہے؟

منشی جی: چوک حضور یہ ہوگئی ہے کہ جب آپ کا خدمت گار پہنچا تو میں نے اپنے عزیز سے کہا کہ مٹھائی اندر سے منگوا دو اور میں

---

۵ ''میٹھا معشوق''، شمولہ ''سکول''، صفحہ ۲۶۵ ۶ ایضاً، صفحہ ۲۶۶ ۷ ایضاً، صفحات ۲۶۶ تا ۲۶۷

بیٹھ کر داتون کرنے لگا۔ اتنے میں ٹوکری میں کتے نے منہ ڈال دیا۔

بڑے مرزا صاحب: ایں یہ کیسے ہوا۔ (خدمت گار کی طرف اشارہ کر کے) اور یہ کہاں تھا۔

منشی جی: یہ بھی وہیں تھے۔ انہوں نے ہی دوت دوت کہا مگر وہ منہ ڈال چکا تھا۔

بڑے صاحب: اجی بالکل غلط۔ کتا وتا کچھ نہیں۔ یہ اسی بے ایمان کی حرکت ہے۔ تم منشی جی اس کو کیا جانو۔ یہ بڑا حرام زادہ ہے۔ حرام خور، نمک حرام آدمی ہے۔

ملازم: آپ ہم ہی کو کہتے ہیں۔ دیکھئے کپڑا دانت سے پھٹا ہے کہ نہیں، اگر میں دوت دوت نہ کرتا تو سب کھا جاتا'' ۸

اور اس طرح مکالمے کے ذریعہ واقعے میں حقیقت کا رنگ بھرا گیا ہے۔

چودھری صاحب نے ''غریبی میں امیری'' کے زیر عنوان اپنے قصبہ ردولی کے محلہ شیخانہ کے رہنے والے نواب راحت حسین کا خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ کسی مزاحیہ کردار کی صورت میں نظر نہیں آتے بلکہ ایک انتہائی سنجیدہ، متین، ہنس مکھ اور دوسروں کے کام آنے والی شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی وضع قطع بیان کرتے ہوئے چودھری صاحب یوں لکھتے ہیں۔ ''وجیہ آدمی تھے۔ ان کو دیکھ کر نگاہ سفارشیں کرتی تھی۔ ہنس مکھ تھے، اس لئے کمینہ جذبات کم ابھرتے تھے'' ۹ چودھری صاحب نے ان کے خاکے کا عنوان غریبی میں امیری اس وجہ سے رکھنا مناسب سمجھا کہ یہ غریب ہوتے ہوئے بھی بہت سخی تھے اور دوسروں کو کھلانے پلانے اور مالی مدد کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ ان کی اس خوبی کو چودھری محمد علی نے کس خوبصورتی سے جا بجا اجاگر کیا ہے۔ ایک جگہ پر لکھتے ہیں کہ ''کسی پشت میں ان کے یہاں کسی نے لکھنؤ میں شادی کر لی تھی۔ تب سے یہ لوگ نام ہی کے نہیں بلکہ سچ مچ کے نواب ہو گئے اور گھر لٹا دیا'' ۱۰

اس خاکے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی مشہور شخصیت، کسی بلند پایہ مفکر، ادیب، شاعر، سائنس داں یا امیر و کبیر انسان پر نہیں لکھا گیا بلکہ ان کے قصبے کے ایک ایسے آدمی پر تحریر کیا گیا ہے، جو صرف نام اور دل کے نواب تھے۔ دل کی نوابی کی کیفیت یہ تھی کہ ''دولت، ثروت، علاقہ نکل گئے، برسوں ہو چکے ہیں۔ مفلسی کے کھٹے مضبوط ہو چکے ہیں مگر نہ چہرے پر شکن نہ ہمت میں کمی۔ ایک دن ایک صاحب نے بیان کیا کہ ہمارے کھانے کا سامان کہیں نہیں ہے۔ نواب صاحب نے کہا آپ کھانا ہمارے یہاں آ کر کھا لیا کیجئے۔ پتا لگا کہ جس دن نواب صاحب یہ دریا دلی فرما رہے تھے، اس دن نو بجے صبح تک گھر

---

۸ ''میٹھا معشوق''، مشمولہ ''کشکول''، صفحہ ۲۷۰

۹ ''غریبی میں امیری''، مشمولہ ''کشکول''، صفحہ ۱۷۹ ۱۰ ''ایضاً''، صفحہ ۱۸۳

میں ہانڈی نہیں چڑھی تھی۔اسی دن شام کو ہم اور ایک اور مہربان نواب صاحب کے وہاں پہنچے۔ محلے کی دو تین عورتوں کو دیکھا کہ اپنے گھروں سے مٹی کی رکابیاں لے کر آئی ہیں اور پلاؤ بھر بھر کر لے جارہی ہیں۔ پلاؤ بالکل معمولی تھا۔ جو شخص دو چار کو کھلائے بغیر کھا نہ سکے وہ اچھا پلاؤ کیسے کھا سکتا ہے'' [۱] یہ خوبی کسی عام انسان میں تو نہیں پائی جا سکتی' اس کا مظہر وہی ہو سکتا ہے جو واقعی دل کا امیر ہو۔

نواب صاحب کے دل کی امیری کا نقشہ اسی خاکے میں آگے چل کر چودھری محمد علی نے یوں کھینچا ہے۔''ان کے گھر کے اندر امیری' غریبی دونوں بہنیں کاندھے سے کاندھا جوڑے نہایت بے تکلفی سے بیٹھی رہتی تھیں۔ایک طرف بیگم صاحب خود کھانا پکا رہی ہیں' دوسری طرف روز کے آنے والے چند مہمان پہنچ گئے۔کھرچن تک پونچھ کر کھا گئے۔ لیجئے صاحب گھر والوں کے لئے پھر سے ہانڈی چڑھی۔ بے حیا کھانے والے اور حمیت دار کھلانے والے دونوں ہنس رہے ہیں۔کہیں فکر کا نشان نہیں ملتا'' [۲] اگر الفاظ پر غور کیا جائے تو گفتگو انتہائی سنجیدہ ہے مگر چودھری محمد علی کی طبیعت کی لطافت اور شگفتگی و بے تکلفی' شوخی اور تیز حسن مزاح تحریر میں جگہ جگہ عیاں ہیں۔

نواب صاحب بڑے سخی تھے اور بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔لیکن ظاہر ہے کہ ایک انسان تھے اور اگر ان میں صرف خوبیاں ہی خوبیاں ہوتیں تو فرشتہ نہ بن جاتے۔ان تمام خوبیوں اور اچھائیوں کے ساتھ ساتھ ان میں ایک عیب بھی تھا جس کے بارے میں چودھری محمد علی کچھ اس انداز سے رقمطراز ہیں''شیریں کلام تھے' خوش مذاق تھے۔ان کی بڑی مبالغہ آمیز تقریریں سن کر دل کہتا تھا کہ ایسی باتوں کے لئے جھوٹ کا بھونڈا لفظ استعمال کرنا ظلم ہے۔یہ ایک حد تک ٹھیک بھی تھا' کیونکہ ان کی واقعہ بانی کا سرچشمہ ہی دوسرا تھا۔یہ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے سوچتے تھے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔رفتہ رفتہ یقین کر لیتے تھے کہ ایسا ہو ہی گیا۔پھر اس کو بیان ایسے انداز سے کرتے تھے کہ غلط جان کر بھی آدمی سننے کا مشتاق رہتا تھا۔کیونکہ کسی کی برائی نہیں چاہتے تھے'' [۳] چودھری صاحب نے یہاں اپنی نفسیاتی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے۔اور نواب صاحب میں موجود مبالغہ آمیزی اور غلط بیانی کی قبیح برائی کی کتنی اعلیٰ توجیح پیش کی ہے۔اور ساتھ ساتھ برائی میں بھی اچھائی کا پہلو تلاش کر لیا' یہ لکھ کر کہ موصوف کسی کی برائی نہیں چاہتے تھے۔

چودھری محمد علی نے نواب صاحب کے گھر کے اندر اور باہر رونما ہونے والے اچھے اور تکلیف دہ دونوں طرح کے واقعات کو اس انداز سے تحریر کیا ہے کہ انہیں پڑھ کر موصوف کی شخصیت کے خدوخال ابھر کر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔اور

---

[۱] ''غریبی میں امیری'' مشمولہ ''کشکول'' صفحہ ۱۸۱ [۲] ایضاً' صفحہ ۱۸۲ [۳] ایضاً' صفحہ ۱۸۰

ساتھ ساتھ زبان و بیان کی ندرت' سحر آفرینی اور جادو بیانی قاری کو پڑھتے چلے جانے پر مجبور کرتی ہے۔ اس خاکے میں نواب صاحب کی فکری اور عملی زندگی کو نہ صرف اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کی خارجی اور داخلی دونوں جہتیں خاکے میں سمو دی گئی ہیں۔ جنہیں پڑھ کر قاری کبھی موصوف کی غربت کے باوجود احباب پروری' غریبوں سے ہمدردی' غرباء کی مدد کے سلسلے میں رونما ہونے والے جذبات کی شدت سے متاثر ہوتا ہے' تو کبھی ان کی لفاظی اور دروغ گوئی کا حال پڑھ کر زیر لب مسکراتا ہے۔ یہاں نہ تو نواب صاحب کی کمزوراں اور خامیاں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے' اور نہ ہی ان کی توصیف کا مل کے پل باندھے گئے ہیں۔ بلکہ نواب صاحب کی زندگی کے سیرتی گوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے اور ان کی نجی' فطری اور عام حالات زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع بیان کرتے ہوئے بھی زبان کی شگفتگی اور طرزِ تحریر کی شوخی برقرار رہی ہے اور یہی چودھری صاحب کی تحریر کا خاصہ ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ چودھری محمد علی کا خاص موضوع ''عورت'' ہے۔ مگر خاکوں کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ مشاہدے میں آئی ہے کہ ''کشکول محمد علی فقیر شاہ'' میں ان کے تحریر کردہ گیارہ خاکوں میں سے صرف ''مس ہیلن'' واحد خاکہ ہے جو کسی عورت پر تحریر کیا گیا ہے' باقی تمام خاکے مرد حضرات پر ہی تحریر کئے گئے ہیں۔ ''مس ہیلن'' کے خاکے کا انداز مکالماتی اور ڈرامائی ہے' لیکن کلب کے مختلف اراکین سے گفتگو کرتے ہوئے ہی ان کی شخصیت ابھرتی چلی جاتی ہے۔ اس میں عورت کے نفسیاتی پہلوؤں کا بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے جائزہ لیا گیا ہے اور شخصیت کے انہیں گوشوں کی زیادہ عکاسی کی گئی ہے۔ اس خاکے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تعریف و تحسین نہیں ہے بلکہ شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے اپنے ہم عصر خواتین اور مردوں کے بارے میں افکار اور خیالات کا پتہ چلتا ہے' جس سے اس کا اندازِ فکر نمایاں ہوتا ہے۔

''خوش مذاقی کے اندھے'' کے عنوان کے تحت کسی مولوی ابراہیم کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ یہ ایک پڑھے لکھے' شہر کی تعلیم اور طرزِ معاشرت سے آشنا' نہایت نفیس مزاج کے حامل انسان تھے۔ ان کی شادی والد صاحب نے ایک جاہل اور دیہاتی خاتون سے کر دی' جس کی تفصیل چودھری محمد علی کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ''مولوی ابراہیم کی بی بی آئیں۔ ٹھیٹھ دیہاتن' کئی دن تو شرم کے مارے دولہا سے بولیں نہیں۔ اس کے بعد بولیں بھی تو معلوم ہوا کہ نہ بولتیں تو اچھا تھا۔ مولوی صاحب کا دل چاہتا تھا کہ کچھ شوخی ہوتی' کچھ شرارت' کچھ اچپلاہٹ' کچھ ناز' کچھ غمزہ' کچھ کرشمہ' کچھ چٹکی وہاں ہر بات کا ایک ہی جواب تھا'' کا کچھ ہم پتر یا ہون'' کبھی کبھی اسی مضمون کو دوسری طرح باندھتی تھیں۔ ''ای سب پتر یا جانین' ہم کا جانین'' قصہ مختصر سائنس میں اگر وحدت حرکت میں بدل جاتی ہے تو یہاں ہر چیز جمود کا جامہ پہن لیتی تھی'' [۱۴]

---

[۱۴] ''خوش مذاقی کے اندھے'' مشمولہ ''کشکول'' صفحہ ۲۸۵

ظاہر ہے چودھری صاحب شب عروسی کی پنہائیوں میں بذاتِ خود ناظرِ جلوہ تو نہیں ہو نگے۔ اور نہ ہی کسی تاریک گوشے میں چھپے ان سرگوشیوں کو سن رہے ہو نگے۔ مگر ان کے دماغ نے ان تمام کیفیات کو بخوبی بھانپ لیا۔ اور ان کے قلم نے اسی طرح بیان کیا کہ قاری کے ذہن میں سادہ نقشہ یوں کھنچ گیا گویا کسی فلم کا سین ہو۔ ان کو زبان پر بھی عبور تھا لہذا انہوں نے دیہاتی زبان بڑی خوش سلیقگی سے استعمال کی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے وسیع مطالعہ کے حامل تھے لہذا دولہا دلہن دونوں کے ذہنی تضاد کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ الفاظ کے بادشاہ تھے اس لئے دولہا کی ذہنی توقعات کے سلسلے میں الفاظ کا دریا بہادیا۔ سائنسی نقطہ نگاہ سے حرکت اور جمود کا فرق بھی واضح کر دیا۔ سنجیدہ باتیں بھی کیں، نفسیات بھی بیان کی مگر کہیں ایسا محسوس نہیں ہونے دیا کہ قاری کے ذہن پر بوجھ پڑے۔ مسلسل شگفتگی برقرار رہی۔

چودھری محمد علی نہ صرف گل افشانی گفتار کے ماہر تھے بلکہ نقاشِ فطرت بھی تھے۔ ''نفاست'' کے عنوان کے تحت تحریر کردہ خاکے میں پڑوس میں رہنے والے دور بچپن میں ساتھ کھیلے میر مونس سے اکیلے میں انتہائی سنجیدگی اور عاجزانہ طریقہ سے فرمائش کی کہ ''کوری گگریا گاتے ہوئے بھاؤ بتا کر اس کا نقشہ کیسے کھینچا جائے۔ چودھری صاحب نے یہ بھاؤ بتانے کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

''مونس صاحب نے بائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اور پکیں جیسے پھول کی، آدھی سے ایک ذرا زیادہ کھلی ہوئی کلی ہوتی ہے۔ ہاتھ چہرے کے برابر اور سامنے لائے، داہنے ہاتھ سے ڈھیلی مٹھی باندھی اور بیچ کی انگلی کو سیدھی کر کے آدھی اس طرح خم کی کہ بیچ کا پور دوسرے پوروں سے آگے نکلا رہا۔ اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ بلندی پر خیالی گگریا کو ٹھنکا مار دیا'' ۱۵؎ جیسا کہ خود چودھری محمد علی نے تحریر کیا ہے کہ پہلے میر مونس نے بھانڈ سے کنواڑ بند کروائے تھے اور پھر یہ عمل کر کے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس خلوت میں چودھری صاحب تو شریک نہ تھے جو وہ یہ نظارہ کر سکتے۔ یہ تو بس ان کے تخیل کی پرواز کا کمال تھا کہ نقشہ کچھ اس طرح کھینچا کہ قاری کے سامنے کسی ٹیلی ویژن اسکرین پر متحرک تصویر نظر آ گئی اور وہ قاری سے ناظر بن گیا۔

''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' کے علاوہ چودھری محمد علی نے ''اتالیق بی بی'' کے عنوان سے ایک اور کتاب تحریر کی اس کتاب میں افسانوی پیرائے میں بیویوں کی شوہروں سے گفتگو نقل کی گئی ہے۔ اس میں شوہروں پر عورتوں کی بے معنی نکتہ چینیوں اور بیجا شکایتوں کا بہت ہی سچا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ دراصل یہ انگریزی زبان میں تحریر کردہ کتاب ''کرٹین لکچرز'' سے

۱۵؎ ''نفاست'' مشمولہ ''کشکول'' صفحہ ۲۳۴

متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اس میں چودہ ابواب ہیں اور ہر باب میں کسی خاص موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ مثلاً ایک دوست کو پانچ روپیہ قرض دینے پر بیوی کا نصیحت نامہ' حقہ پینے کی عادت سے بیوی کا چڑھنا' کلب کی رکنیت پر بیوی کا اعتراض' باسی کھانے پر اعتراض سے بیوی کی ناراضگی' صاحب فراش ہونے پر بیوی کی کڑوی کسیلی باتیں' رات گئے گھر لوٹنے پر رائے زنی' دوست کے دیر تک بیٹھ جانے پر اعتراض' شوہر کے میلے میں چلے جانے پر حلواتیں' کسی خاتون مہمان کی آمد پر بیوی کا وسوسہ' کسی جلسے میں شرکت کرنے پر باتیں بنانا وغیرہ۔ گویا سارے موضوعات ایسے ہیں جو میاں بیوی کی زندگی میں روزمرہ ہی پیش آتے ہیں۔

مذکورہ بالا ابواب کو شخصی خاکوں میں شامل کرنا کچھ زیادہ مناسب تو نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ یہاں کوئی ایک مخصوص شخص سے مراد نہیں لی گئی ہے بلکہ سب کا موضوع ایک ہی ہے۔ یعنی بیوی کا اپنے شوہر کی ہر بات میں اپنے دل میں وسوسے پیدا کر لینا اور اعتراضات کے انبار لگا دینا۔ ظاہر ہے یہ تو ساری بری عادتیں ہیں۔ بیوی میں یقیناً کچھ نہ کچھ اچھائیاں بھی تو ہونگی مگر ان کا تذکرہ نہیں۔ تحریر کا اسلوب بھی ایک ہی ہے یعنی ہر باب طنز و مزاح سے بھرپور ہے۔ ان ابواب کو پڑھ کر ایک ایسی بیوی کی شخصیت ابھرتی ہے جو جھگڑالو ہے' بات بات میں چھوڑ جانے اور میکے چلے جانے کی دھمکیاں دیتی ہے' بدگمان بھی ہے اور بک بک کر کے دماغ چاٹنے والی بھی۔ یہ تو کچھ اچھا تاثر نہیں ہوا۔ البتہ بیان کی شگفتگی' مناسب الفاظ کا استعمال' تحریر کی سلاست اور تخیل کی پرواز ان ابواب کو دلچسپ بناتے ہیں۔ یہ خاکے کے زمرے میں آتے ہوں یا نہ آتے ہوں اور ان سے کسی کی شخصیت صحیح طور پر واضح ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو مگر انہیں پڑھ کر یہ تاثر ضرور ابھرتا ہے کہ عام طور پر بیویوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ شوہروں کے اچھے برے ہر فعل میں عیب تلاش کریں اور ان کی ہر حرکت پر کڑی تنقید کریں۔ ان مضامین کی یک طرفی کی وجہ کیا ہے؟ طویل عرصے خلوت و جلوت میں مسلسل ایک ساتھ رہتے رہتے اچھائیاں نظروں سے اوجھل ہونے لگتی ہیں اور برائیاں ابھر کر سامنے آنے لگتی ہیں۔ اس لئے کہ برائیاں تکلیف دہ ہوتی ہیں لہذا آسانی سے محسوس کی جانے لگتی ہیں۔

۵۔ چودھری محمد علی کی خاکہ نگاری کے اسلوب:۔

مجموعی طور پر بحیثیت خاکہ نگار چودھری صاحب بہت کامیاب رہے ہیں۔ شگفتگی' برجستگی اور طنز و مزاح ان کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ لہذا وہ خاکہ نگاری میں بھی اسی طرح عیاں ہے جس طرح ان کے افسانوں' مضامین اور انشائیوں میں نظر آتا ہے۔ ان کے شخصی خاکوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بنیاد ذاتی علم و مشاہدے پر رکھی گئی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ

چودھری صاحب نے صرف ان چیزوں کو بیان کیا ہے جن کا علم ان کو براہ راست یا معتبر واسطوں سے حاصل کیا گیا ہو۔ خاکے پڑھ کر ان کے ذاتی علم و مشاہدے کے رنگ و آہنگ کی آخری حدود کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے اندازِ نگارش اور افتادِ ذہنی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شدت کے ساتھ داخلی طرزِ تحریر کے قائل رہے ہیں۔ وہ رونما ہونے والے مختلف واقعات کو اس خاص انداز سے ترتیب دیتے ہیں کہ وہ صاحب سیرت کی شخصیت کے لئے آلہ اظہار بن جاتے ہیں۔ چودھری صاحب نے اپنے ذاتی علم و مشاہدے کو اندھا دھند صرف نہیں کیا بلکہ واقعات کو صرف واقعہ کے خاطر بیان کیا۔ انہوں نے اپنے حافظہ سے مدد لے کر کوئی واقعہ اسی جگہ بیان کیا جہاں شخصیت مخصوصہ کی کسی خصوصیت یا عبارت کے اظہار کے لئے اس کی ضرورت پیش آئی۔ ان کے خاکوں میں نفسِ واقعہ میں کوئی لطف نہیں بلکہ وہ شخصیت کے اظہار کے لئے ایک ایسا سہارا ہے جس سے بہتر سہارا اس کے کردار کو واضح کرنے کے لئے اور کوئی نہیں۔

چودھری محمد علی نے اپنے کرداروں کا بہت قریبی اور گہرا مطالعہ کیا ہے۔ انہیں گویا ایسے لمحات میں پکڑا گیا ہے جب اگر وہ زندہ تھے تو یہ بھول چکے تھے کہ دیکھنے والے کی نظر ان کی طرف لگی ہے۔ جہاں نہ اندیشہ محتسب تھا اور نہ خوفِ رسوائی۔ چودھری صاحب اپنے کرداروں کو ایسے ہی مواقع پر پکڑتے اور اس بروقت گرفت سے وہ اپنے موضوع کے کردار کی وہ بندھی ہوئی گرہیں کھولتے ہیں جن کے کھلتے ہی اس کی خصوصیات جیتے جاگتے انداز میں ایک ایک کر کے قاری کے سامنے آتی جاتی ہیں۔ وہ غیر ضروری تفصیلات سے اپنے قارین کو نجات دلاتے ہیں۔ اور واقعات میں صرف ان چیزوں کو منتخب کرتے ہیں جو موضوع سے فوری طور پر منسلک ہوں۔

چودھری صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے انتخاب واقعات میں متعلقہ شخصیت کے بیرونی افعال ہی کو مدنظر نہیں رکھا بلکہ اس کے اندرونی ذہنی عمل پر توجہ دی۔ انہوں نے شخصی کردار کا مرکز انسان کے بیرون سے اندرون کی طرف منتقل کیا اور اعمال سے زیادہ محرکات میں دلچسپی لی۔ شخصی خاکے میں اگر داستان کی سی ڈرامائی جان نہ ہو تو وہ ادب میں کوئی زیادہ بلند درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ڈراما کسی غیر معمولی یا انہونی بات کا نام نہیں۔ تمام زندگی ایک ڈراما ہے۔ چودھری صاحب کے یہاں ڈرامائی احساس بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس نے ان کے خاکوں میں ایک عجیب ادبی حسن پیدا کر دیا ہے۔ چودھری محمد علی کے خاکہ نگاری کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے فرد کی زندگی سے زیادہ سروکار نہیں رکھا۔ ان کے تمام خاکے اندرونِ خانہ پیش آنے والے واقعات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کے کردار اپنے گھروں میں بیٹھ کر بذلہ سنجی کرتے اور ہنستے بولتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر سے نہیں نکلتے بلکہ گھر سے باہر بھی عام زندگی میں نظر آتے ہیں اور

چودھری صاحب نے ان کی اسی نجی زندگی میں پیش آنے والی گفتگو کو قلم بند کیا ہے۔ گفتگو کو زندہ و پائندہ پیرائے میں قلم بند کرنے میں انہوں نے لطف کا عنصر ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مکالمے عام بول چال میں حسب مراتب ہیں' یعنی پوربی اور دیہاتی زبان کو بھی حسب ضرورت کام میں لایا گیا ہے۔ ڈرامائیت اور مکالمہ نویسی کے جملہ مراتب ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

چودھری محمد علی نے شخصی خاکوں کی فقط ہو بہو تصویر کشی نہیں کی ہے بلکہ تخلیقی فن سمجھا ہے۔ انہوں نے اپنے مواد پر قابو پاکر اسے خاص شکل میں ڈھالا ہے۔ ان کے سانچوں میں تخیل انتخاب' اسلوب اور باریکی فن سب ہی کچھ موجود ہے۔ وہ جز تفصیلات پسند کرتے ہیں۔ ایک خاص قسم کے خاموش ذہنی ربط کے ذریعہ وہ مختلف حصوں اور واقعات کو ایک دوسرے سے جوڑتے ہیں۔ ان کا نفسیاتی مطالعہ' تحلیلی و ترتیبی قوت اور انتخاب کا مخصوص ملکہ ان کے آرٹ کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ جس کے سہارے وہ انسانی شخصیت کے اتنے حسین اور دلکش و متوازن تانے بانے بن دیتے ہیں جس سے شخصیت واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ اپنے کرداروں کی زندگی کے وہ ٹکڑے جن کے متعلق وہ سمجھتے ہیں کہ بہترین طور پر ان کی ذات کا اظہار کر سکتے ہیں منتخب کر لیتے ہیں۔ واقعات کے تسلسل اور اختصار کے ذریعے وہ حرکت اور زندگی کا اثر پیدا کرتے ہیں۔

ایک شخصیت کی تعمیر میں جگہ جگہ دوسرے اشخاص کا ذکر بھی آتا ہے مگر یہ اشخاص ضمنی یا ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی مرکزی کردار ان ثانوی کرداروں کے باعث دھندلکے میں گم نہیں ہوتا۔ چودھری محمد علی شخصی خاکہ تحریر کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی تعمیر فن کارانہ ہوتی ہے۔ وہ کسی مینا کار کی طرح نوک پلک سنوارنے کے چکر میں نہیں پڑتے۔ وہ تخلیق کے قائل ہیں۔ ان کے شخصی خاکوں میں ترتیب وحدت' ادبی چابکدستی سبھی کچھ ملتا ہے۔ وہ خاکوں میں کبھی کبھی اپنے موزوں کردہ اور مشہور شعراء کے ایسے اشعار سے بھی مدد لیتے ہیں جو شخصیت کے مجموعی تاثر کی ترجمانی کرتا ہو۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر اردو ادب کے بہترین خاکہ نگاروں کی فہرست مرتب کی جائے' تو اس کہکشاں میں چودھری محمد علی ردولوی کا نام کسی درخشاں ستارے کی طرح چمک رہا ہوگا۔

باب ہشتم

چودھری محمد علی ردولوی کی ادبی خدمات

ا۔ چودھری صاحب کی تصانیف :۔

چودھری محمد علی ردولوی ایک صاحب طرز، وسیع المطالعہ اور تجربہ کار ادیب تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں تحریر کیں جو بے انتہا دلچسپی کی حامل ہیں اور بے پناہ افادیت رکھتی ہیں۔ چودھری صاحب کی تصانیف تعداد کے اعتبار سے کچھ زیادہ تو نہیں ہیں مگر اس کے باوجود دل نشیں اور ادبی شہہ پارے ہیں، ان کی مطبوعہ تصانیف میں بارہ کتابیں اور کتابچے شامل ہیں۔ ''اتالیق بی بی'' ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے جس میں افسانوی انداز اور طنزیہ پیرائے میں ان بیویوں کا خاکہ کھینچا گیا ہے جو اپنے شوہر کی ہر بات میں کیڑے نکالتی اور بات کا بتنگڑ بناتی اور بے جا تنقید کی بھرمار کرتی رہتی ہیں۔

''صلاح کار'' اردو زبان میں سائنسی نقطہ نظر سے جنسیات پر تحریر کی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ یہ نوجوانوں کے لئے نصیحتوں کا ایک خزانہ ہے، جس میں ان کو جنسی کج روی کے اندوہناک نتائج سے متنبہ کیا گیا ہے۔ ''خبطی'' ایک مزاحیہ انداز میں تحریر کردہ کتابچہ ہے۔ ''نقادی کے نکتے'' بھی ایک کتابچہ ہے، جو قلمی تصاویر کو پرکھنے اور ادب کے فنِ لطیف کو جانچنے کے اصولوں سے متعلق تصنیف کی گئی ہے۔ ''یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم'' ایک سوانحی خاکہ ہے اور یہ بھی ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج کے کردار اور خصائل بیان کئے گئے ہیں۔ ''سیرۃ الاقطاب اردو'' بھی ایک سوانحی کتابچہ ہے۔ ''گناہ کا خوف'' ایسے افسانوں کا مجموعہ ہے جنہیں حقیقت آفرین کہا جا سکتا ہے۔

''پردے کی بات'' چودھری صاحب کی تصنیف کردہ ایک ایسا معلوماتی کتابچہ ہے جو ضبطِ تولید کی افادیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ''کشکولِ محمد علی شاہ فقیر'' ان کے مزاحیہ مضامین، انشائیوں، افسانوں، خاکوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے اس میں تحریر کردہ ہر افسانہ کسی نہ کسی حقیقی مشاہدے پر مبنی ہے۔ ''میرا مذہب'' ایک ایسا کتابچہ ہے جس میں چودھری صاحب نے مذہب اسلام کے بارے میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، شیعہ اور سنی مکاتب فکر کی خوبیوں، خامیوں اور ایک دوسرے پر کی جانے والی زیادتیوں کی نشان دہی کی ہے۔ ''گویا دبستاں کھل گیا'' چودھری صاحب کی طباعت کی غرض سے تحریر کردہ کوئی تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کے جملہ اعزاء و اقربا و احباب کے نام وقتاً فوقتاً تحریر کردہ ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جسے ان کی

صاحبزادی ہما بیگم نے شائع کروادیا۔ ''کشکول'' ایک ایسی کتاب ہے جسے ہما بیگم کے صاحبزادے سید علی کاظم نے مرتب کر کے شائع کیا اور جس میں چودھری صاحب کی تین تصانیف ''کشکول محمد علی شاہ فقیر''۔ ''گناہ کا خوف'' اور ''اتالیق بی بی'' کو شامل کیا گیا ہے۔ گویا یہ ان تین کتابوں کی دوسری اشاعت ہے۔

چودھری محمد علی کے وہ افسانے اور مضامین جو حکیم عبدالوالی کے ماہنامے ''معلومات'' اور ''اودھ پنچ'' میں شائع ہوتے تھے اب تک کسی شکل میں مرتب نہیں کئے جا سکے۔ ان میں چودھری صاحب کے تحریر کردہ ایک ایکٹ کے تین ڈرامے ''عیاش کسان'' ''کسان'' اور ''سعید اور سلمہ'' بھی شامل ہیں' جو ماہنامہ ''معلومات'' میں شائع کئے گئے تھے۔ اسی طرح ان کے وہ تراجم بھی کتاب کی صورت میں شائع نہیں ہو سکے جنہیں انہوں نے جارج برناڈ شاہ کے ''پیراڈاکس'' اور آسکر وائلڈ کے ''مقدمہ فندموت'' اور دیگر تحریروں کو اپنے خوبصورت انداز میں اردو کے قالب میں ڈھالا اور ''اودھ پنچ'' میں شائع کیا۔ ہما بیگم نے ''بھولی ہوئی باتیں'' کے عنوان سے ایک کتاب ۱۹۴۸ء میں سول اینڈ ملیٹری پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کی۔ اس کتاب کا مقدمہ چودھری محمد علی نے تحریر کیا جس میں قرآن حکیم کی عظمت' اہمیت اور افادیت بیان کی گئی ہے۔ ہما بیگم اخلاق حسین نے جو مبارے نام سے ایک اور کتاب مرتب کی جسے فیروز سنز کراچی نے ناظر پرینٹنگ پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔ اس میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے شعراء کے منتخب اشعار شامل ہیں۔ اس کتاب میں چودھری صاحب کی موزوں کی ہوئی ایک مزاحیہ نظم ''سرخے آم'' بھی شامل ہے۔

۲۔ اہم تصانیف کا تفصیلی تعارف:۔

ڈاکٹر انور حسین خان نے چودھری محمد علی ردولوی کی ادبی خدمات پر مقالہ لکھتے ہوئے ان کی جملہ تصانیف کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اولاً خالص ادبی کتابیں: ۱۔ گناہ کا خوف' ۲۔ کشکول محمد علی شاہ فقیر' ۳۔ گویا دبستاں کھل گیا' ۴۔ نقادی کے نکتے۔ ثانیاً متفرق موضوعات پر لکھی گئی کتابیں: ۱۔ صلاح کار' ۲۔ سیر اندھب' ۳۔ یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم' ۴۔ پردے کی بات' ۵۔ اتالیق بی بی[1] یہ تقسیم کچھ زیادہ مناسب نہیں اس لئے کہ ''نقادی کے نکتے'' کو خالصتاً ادبی تصنیف قرار دینا اور ''یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم'' جیسے شخصی خاکے اور ''اتالیق بی بی'' جیسے طنزیہ خاکوں کو ادبی تصنیف قرار نہ دینا کسی بھی لحاظ سے درست نہیں۔ حیرت ہے کہ ردولی کے قریب رہ کر تحریر کئے جانے والے اس تحقیقاتی مقالے میں ''خبطی'' اور ''سیرۃ الاقطاب اردو'' کا کوئی تذکرہ نہیں۔

---

[1] چودھری محمد علی ردولوی (حیات اور ادبی خدمات) صفحات ۲۰ تا ۲۱

اتالیق بی بی:۔

اس کتابچے کا پہلا ایڈیشن حاصل نہ ہوسکا۔ اسے دوبارہ ہما بیگم کے صاحبزادے سید علی کاظم نے دو اور کتابوں ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' اور ''گناہ کا خوف'' کے ساتھ ملا کر ''کشکول'' کے عنوان سے ۱۹۸۰ء میں اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع کیا۔ ''اتالیق بی بی'' اس کتاب کے آخری حصے میں صفحہ ۵۵۵ سے صفحہ ۶۳۹ پر مشتمل ہے۔ اس میں چودہ ابواب ہیں اور یہ ۸۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ایک انگریزی کتاب ''کرمٹین پکچرز'' سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے لیکن اسے چودھری محمد علی نے اس طرح ہندوستانی قالب میں ڈھالا ہے کہ کہیں سے بھی اردو زبان کے قارئین کو اجنبیت محسوس نہیں ہوتی اس میں شوہروں پر بیویوں کی بے جا شکایتوں' فضول نکتہ چینیوں اور بے معنی اعتراضات کا بڑی خوبصورتی سے خاکہ کھینچا گیا ہے۔ ہر بات میں کسی ایک مخصوص واقعہ کو موضوع بنا کر بیگم صاحبہ کی اس رخ سے لن ترانیوں اور ہزل گوئی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

چونکہ پہلا ایڈیشن دستیاب نہیں لہذا اس کے اولین سنِ اشاعت کا اندازہ نہیں ہوسکا۔ ''گویا دبستاں کھل گیا'' کے دوسرے ایڈیشن کے اواخر میں چودھری محمد علی کی تصانیف کا مختصر سا تعارف شائع کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ''اتالیق بی بی چودھری صاحب کی تحریر کردہ پہلی کتاب ہے'' [۲] اس کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے تحریر کیا ہے ''اتالیق بی بی'' شاید سب سے پہلی کتاب ہے اور شاید شرر صاحب کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ [۳] اس کتاب میں ہماری اس تہذیب کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر وجود میں آئی۔ یہاں پر دونوں تہذیبوں کا تصادم بھی نظر آتا ہے اور دونوں میں پائے جانے والے فرق کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے اور چودھری صاحب نے ہر باب میں مشرقی عورت کو ایک نئے زاویے سے پیش کیا ہے۔

پہلے باب میں شوہر اپنے کسی دوست کو پانچ روپیہ قرض میں دے دیتے ہیں۔ اور بیوی مختلف قسم کی ضروریات کا ذکر کر کے بار بار انہیں لتھاڑتی اور لایعنی نصائح کا انبار لگا دیتی ہے۔ دوسرے باب میں شوہر کے حقہ پینے کی عادت سے سخت بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ حقہ پی کر منہ سے بو آنا لازمی بات ہے مگر اس میں بدگمانی کا اظہار کرنا دوسروں پر شک کرنا اور معنی سے معنی نکالنا یہ سب ہماری مشرقی عورتوں کا خاصہ ہے۔ تیسرے باب میں بیوی کے علم میں آتا ہے کہ شوہر کسی کلب میں شریک ہو کر آئے ہیں اس بات پر بغیر یہ جانے ہوئے کہ کلب ہے کیا چیز وہ شوہر کو ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔ چوتھے

---

۲ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۳۹۷

۳ انور حسین ''چودھری محمد علی ردولوی'' صفحات ۶۱ تا ۶۲

باب میں کہیں غلطی سے شوہر نے کھانا کھاتے ہوئے یہ شکایت کر دی کہ کھانا باسی ہے اور بعد از طعام کوئی مٹھائی دستیاب نہیں۔ بس شوہر کو خوب خوب صلواتیں سننی پڑیں۔

''فری میشن'' ایک خفیہ برآدرانہ جماعت ہے۔ جس میں کوئی عورت شریک نہیں ہو سکتی اور اس کا اصول یہ ہے کہ تمام انسان آپس میں بھائی ہیں اور کسی مصیبت زدہ بھائی کی مدد کرنا دوسرے بھائیوں کا فرض ہے۔ شوہر اس جماعت کے رکن بن کر گھر لوٹتے ہیں اور بیوی سے اس خفیہ جماعت کے بارے میں گفتگو نہیں کرنا چاہتے مگر بیوی ہیں کہ پلٹ پلٹ کر حملے کر رہی ہیں اور تیر و نشتر کی بارش کر رہی ہیں کہ کسی طرح سے شوہر بیان کر دیں کہ یہ کیا بلا ہے؟ چھٹے باب میں شوہر رات کو اپنے ایک دوست کی ضمانت کی غرض سے جاتے ہیں اور لوٹنے میں خاصی دیر ہو جاتی ہے۔ بیوی صلواتوں کا دفتر کھول دیتی ہیں مگر جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے کسی رشتہ دار کی ضمانت کی غرض سے گئے تھے تو ایک دم سے پگھل کر موم ہو جاتی ہیں۔ ساتویں باب میں ایک دوست کے آ جانے سے شوہر میزبانی میں مصروف ہو جاتا ہے اور مہمان رات کے ایک بجے رخصت ہوتا ہے اس بات پر بیوی چراغ پا ہو جاتی ہے۔

آٹھویں باب میں شوہر میلے چلے گئے' جب بیوی کو خبر ہوئی تو انہوں نے آڑے ہاتھ لیا۔ نویں باب میں شوہر نے گھر واپس آنے میں دیر کر دی' بیوی غصہ میں دروازہ دیر سے کھولتی ہے۔ بارش ہو رہی ہے جس کی وجہ سے شوہر بھیگ کر شرابور ہو جاتے ہیں۔ اس بات پر شوہر ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں مگر بیوی بجائے شرمندہ ہونے کے الٹی باتیں سناتی ہے۔ دسویں باب میں بیوی کو سردیوں کے لئے گرم کپڑے بنوانے کے سلسلے میں شوہر سے بجٹ کی منظوری لینا ہے جس کے لئے وہ کیا کیا جتن کرتی ہے اور بالآخر اپنی بات منوا کر ہی دم لیتی ہے۔ گیارہویں باب میں بیوی ایک روز کے لئے اپنے میکے چلی جاتی ہے۔ شوہر موقع دیکھ کر اپنے دوستوں کو گھر میں مدعو کر لیتے ہیں۔ بیوی میکے سے واپس آ کر جب گھر میں افراتفری دیکھتی ہے تو شوہر کی کیا خوب خبر لیتی ہے۔ بارہویں باب میں ایک رشتہ دار مہمان خاتون آ جاتی ہیں اور غیر شعوری طور پر شوہر میں دلچسپی لینے لگتی ہیں۔ ظاہر ہے بیوی یہ کیسے برداشت کر سکتی ہے' خوب ہی لعن طعن کرتی ہے۔

تیرہویں باب میں گھر آتے ہوئے ڈاکیے نے شوہر کو نمونے کے طور پر آیا ہوا ایک اخبار دیا' جسے شوہر نے کھانے کے بعد پڑھنا شروع کیا۔ بیوی نے شوہر کے انہماک کو ناپسندیدگی اور شکوک کی نظر سے دیکھا اور چراغ پا ہو گئیں۔ چودھویں باب میں شوہر ''فری میشن'' کے جلسے میں شرکت کر کے چندہ دے آئے ہیں' جس پر بیوی سخت برہم ہوتی ہے۔ الغرض یہ مختلف زاویہ ہیں جن سے چودھری محمد علی نے ''اتالیق بی بی'' کے عنوان سے مشرقی عورت کی تصویر کشی کی ہے۔ مختلف طریقوں سے

اس کے مزاج کا خاکہ پیش کیا ہے۔اس کتاب کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ چودھری صاحب عورتوں کی نفسیات پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور انہیں بخوبی پیش کرنے کا فن جانتے تھے۔

صلاح کار:۔

یہ کتابچہ جامعہ ملیہ دہلی میں طبع ہوا اور اسے مکتبہ ایوان اشاعت گورکھپور نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔کتاب برائے فروخت نہیں لہٰذا قیمت درج نہیں ہے۔ جنسیات کے موضوع پر لکھی جانے والی یہ ایسی کتاب ہے جن کے ذریعہ نوجوانوں کو جنسی معاملات کی پیچیدگیوں اور جنسی الجھنوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔جنسی کجروی اور جنسی بے راہ روی سے اجتناب بخشنے کی ہدایت کی گئی ہے۔۱۲۴ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں کئی فصلوں کے تحت مختلف موضوعات پر مضامین لکھے گئے ہیں۔کتاب کے شروع میں دیباچہ اور آخر میں ''خاتمہ'' کے عنوان سے پیش کردہ خیالات کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔

دیباچہ صفحہ ۳ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۵ کے بالائی حصے پر ختم ہوتا ہے۔اس میں چودھری محمد علی نے اس کتاب کی ضرورت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلا باب پانچ فصلوں پر مشتمل ہے اور اس میں مرد اور عورت کے اعضائے تناسل' جنسی عمل کے مقصد اور عورت کے مقام تولید کی وضاحت کی گئی ہے۔ساتھ ساتھ استقرار حمل اور عمل تولید کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا باب دو فصلوں پر مشتمل ہے۔پہلی فصل میں یورپی اور ہندوستانی عصمت فروش عورتوں کا فرق' ہندوستانی طوائفوں کے معاشرتی مقام اور ان سے جنسی خواہشات کی تکمیل کے مضر اثرات سے آگاہ کیا گیا ہے۔دوسری فصل میں شادی کے طریقے' عائلی زندگی اور شادی کے لئے موزوں عمر کا تعین کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انگریزی اور ہندوستانی شادی کے طریقوں کا بھی موازنہ کیا گیا ہے۔تیسرا باب بھی دو فصلوں پر مشتمل ہے جس میں جنسی بیماریاں بیان کی گئی ہیں۔پہلی فصل میں سوزاک کے اسباب' مختلف مدارج اور اس کی ہولناکیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری فصل میں آتشک کی علامتیں' مرض کے اسباب' مختلف مدارج اور جسم پر رونما ہونے والے بھیانک اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔

چوتھا باب تین فصلوں پر مشتمل ہے۔پہلی فصل میں جنسی نقطۂ نگاہ سے مذکورہ بالا دو بیماریوں سے بچنے کے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔دوسری فصل میں شراب نوشی اور مباشرت کے رشتہ کو واضح کیا ہے اور اس کی وجہ سے رونما ہونے والے مضرت رساں اثرات بیان کئے گئے ہیں۔تیسری فصل میں جنسی قوت کی تشریح کی گئی ہے۔اس کے صحیح مصرف اور اعتدال پر زور دیا گیا ہے۔مردوں میں جلق کے نقصانات واضح کئے گئے ہیں۔ پانچواں یعنی آخری باب دو فصلوں پر مشتمل ہے۔جس کی

پہلی فصل میں ''امرد پرستی'' کے منفی اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسری فصل میں ہسٹیریا کے مرض کی وضاحت کی گئی ہے اور اس کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ ایسے مریض کے ساتھ حسنِ سلوک کا مشورہ دیا گیا ہے۔

پوری کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ چودھری محمد علی نے اس نظریہ سے اسے تحریر نہیں کیا کہ اس سے قاری کے ذہن میں جنسی ہیجان برپا ہو۔ اسے جنسی حظ حاصل ہو یا اس کی جنسی عیاشی میں مزید مدد ملے' بلکہ چودھری صاحب کا مقصد پڑھنے والوں کو جنس سے متعلق بنیادی باتوں سے آگاہ کرنا ہے۔ اچھائی برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھانا ہے۔ اس میں نہ صرف کارآمد باتیں بیان کی گئی ہیں بلکہ جابجا نصیحتیں بھی کی گئی ہیں اور وہ طریقے بیان کئے گئے ہیں جو آنے والی نسلوں کی صحت و تندرستی کا باعث بن سکیں۔ کتاب میں جگہ جگہ مغربی مصنفین اور دانشوروں کی تصانیف و آراء سے استفادہ کیا گیا ہے۔

نقادی کے نکتے' خبطی اور سیرۃ الاقطاب اردو:۔

تلاشِ بسیار کے باوجود کتابچہ ''نقادی کے نکتے'' حاصل نہ ہو سکا۔ نہ ہما بیگم کے پاس لاہور سے دستیاب ہو سکا اور نہ ہی سید علی کاظم کے پاس کراچی سے۔ نہ ہی چودھری صاحب کے پوتے اسد سلمان کے پاس ٹورنٹو (کینیڈا) سے اور نہ ہی چودھری محمد علی کے گھر میں ان کے چھوٹے صاحبزادے چودھری سعید مصطفیٰ علی کے پاس ردولی (بھارت) میں کوئی نسخہ موجود تھا۔ نہ ہی کسی لائبریری یا ان کے قریبی دوست احباب سے مل سکا۔ دراصل یہ کتاب خود چودھری محمد علی کی زندگی میں ہی نایاب ہو گئی تھی۔ جس کا تذکرہ انہوں نے ہما بیگم کے نام اپنے ۱۳ر مئی ۱۹۵۷ء کے تحریر کردہ خط میں کیا ہے: ''اتالیق بی بی'' ''صلاح کار'' ''پردے کی بات'' تمہارے پاس ہیں یا نہیں؟ ''نقادی کے نقطے'' کہیں نہیں ہے آگے تم جانو تمہارا کام''[۱] اس وجہ سے اس کتابچہ کا تعارف پیش نہیں کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح چودھری صاحب کی دو اور کتابیں ''خبطی'' اور ''سیرۃ الاقطاب اردو'' بھی کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکیں' لہٰذا ان کا تعارف بھی درج نہیں کیا جا سکا۔ ''نقادی کے نکتے'' سرفراز قومی پریس' لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ ''خبطی'' کو ۱۹۴۰ء میں انوار بکڈپو' لکھنؤ نے طبع کیا تھا جبکہ ''سیرۃ الاقطاب اردو'' نولکشور' لکھنؤ کے ذریعہ ۱۹۴۴ء میں شائع کی گئی تھی۔

یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم:۔

چودہ ابواب کے ساتھ یہ کتابچہ ۴۱ صفحات پر مشتمل ہے جس میں پانچ صفحات کا دیباچہ بھی شامل ہے' جسے مہاراجہ

---

[۱] ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۳۵۸

صاحب محمود آبادی علی محمد خاں بہادر محبت نے تحریر کیا ہے۔ اسے نول کشور پریس نے لکھنو سے ۱۹۱۷ء میں شائع کیا تھا۔ یہ الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک سابق جج مولانا سید کرامت حسین کا شخصی خاکہ ہے۔ ان کی مکمل سوانح حیات نہیں ہے۔ مولانا کی خدمات تعلیم نسواں کے سلسلے میں خاصی رہی ہیں۔ انہوں نے شرفاء کی لڑکیوں کے لئے اسلامی اور اخلاقی تعلیم کی غرض سے لکھنؤ میں ایک اسکول کھولا تھا جو آج بھی انہیں کے نام پر ''کرامت حسین مسلم گرلز ڈگری کالج'' کے نام سے قائم ہے۔ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر یہ کتابچہ تحریر کیا گیا۔

کتاب کا ہر باب کسی الگ موضوع پر نہیں لکھا گیا بلکہ چودھری محمد علی نے مولانا کی آخری زندگی میں جو وقت ساتھ گزارا' اس دوران رونما ہونے والے مختلف واقعات کا احاطہ تسلسل کے ساتھ کیا ہے۔ پہلا باب تمہیدی ہے اور کتاب لکھنے کی غرض و غائت پر روشنی ڈالتا ہے اور اسی طرح چودھواں باب جو کہ مختصر ترین ہے' مولانا کے انتقال کے بعد ان کے چھوڑے ہوئے تاثر کو بیان کرتا ہے۔ درمیانی ابواب میں مختلف واقعات اس طرح ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں کہ ان کو پڑھنے سے مولانا کے طرز نگارش' سلیقہ مندی خورد و نوش' طرز زندگی' دلچسپی' شوق' نفاست' افتادِ طبع' طریقہ استراحت کی وضاحت ہوتی ہے' ان کے مذہبی' سماجی' اخلاقی خیالات و نظریات کا علم ہوتا ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اسے پڑھ کر مولانا کی شخصیت اور ان کے اچھے برے تمام کرداروں کی وضاحت ہوتی ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کی ایک تصویر بھی شائع کی گئی ہے مگر ان کی اصلی تصویر تو کتاب پڑھنے کے بعد ہی واضح ہوتی ہے۔

گناہ کا خوف :۔

یہ پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے جو کہ ۱۴۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس میں دیباچہ کے علاوہ نو افسانے اور پانچ انشائیے شامل ہیں۔ اسے ادارے ''نیا سنسار'' لکھنؤ نے رامانشکر بھاگور' فائن پریس لکھنؤ کی طباعت سے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔ اسے دوبارہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے ۱۹۸۰ء میں کتاب بہ عنوان ''کشکول'' کے تحت شائع کیا' جسے چودھری صاحب کے نواسے سید علی کاظم نے ترتیب دیا۔ ''کشکول'' کے تحت گناہ کا خوف ''صفحہ نمبر ۳۹۹ سے صفحہ ۵۵۴ تک پھیلے ہوئے ۱۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا پہلا افسانہ ''اسیری کی بو'' اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ ایک امیر گھرانے میں پرورش پانے والی خاتون جب گردشِ افلاک کا شکار ہو کر غربت کے آغوش میں آجاتی ہیں' تب بھی ان کے رکھ رکھاؤ کردار و گفتار اور حرکات و سکنات سے ان کے گزشتہ عروج کا پتہ چلتا ہے۔ دوسرا افسانہ ''گناہ کا خوف'' سماج کی ظاہر پرستی پر لازوال طنز

ہے۔ایک نہایت چالاک' مقدمہ بازی کے فن میں ماہر اور جعل بنانے میں یکتائے روزگار شخص بھی ظواہر پرستی کے تحت کس طرح اپنا رویہ بدل دیتا ہے۔

تیسرا افسانہ ''اسباب کا غلام'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس حقیقت پر مبنی ہے کہ زمانے کے حالات ہر انسان کو خواہ وہ اچھا ہو یا برا' اسباب کی زنجیروں میں جکڑ کر ان کا تابع بنا دیتا ہے۔ چوتھا افسانہ '' آنکھوں کی زبان'' ایک انوکھے موضوع پر مبنی ہے ایک مرد کسی حسین وجمیل عورت کو دیکھ کر ملتفت ہوتا ہے۔اور آنکھیں چار ہونے کی صورت میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا گفتگو ہوتی ہے اس کا بہت ہی خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے' جو کہ ظاہر ہے قطعاً تخیلاتی ہے۔ ''شاعر کا کلام'' کے عنوان سے پانچواں ایک مختصر افسانہ ہے جس میں اشعار کی اہمیت اور سماج پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی شعر یا مصرعہ کا مفہوم واضح نہ ہو جو کہ عوام الناس کی زبان پر چڑھ چکا ہے' لیکن کسی موقع سے مناسبت رکھنے کی صورت میں اس کے معنی زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔

چھٹے افسانے '' آنکھوں کی سوئیاں'' میں یہ حقیقت پیش کی گئی ہے کہ آنکھیں جس حسین چہرے اور جسم کو دیکھنے کی مشتاق ہوں' وہاں بجائے اس کے مدقوق چہروں اور لاغر وضعیف اجسام سے مڈبھیڑ ہو جائے تو کیا کیفیت ہوگی۔ ''میٹھے بول'' ساتواں لیکن مختصر ترین افسانہ اس بات کی اہمیت کو واضح کرتا ہے کہ میٹھی گفتگو بڑے بڑے مسائل کو حل کر دیتی ہے۔ آٹھواں مشہور افسانہ ہے ''تیسری جنس'' جس کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ ہر مرد میں کچھ جز وعورت کا ہوتا ہے اور ہر عورت میں کچھ جز و مرد کا۔ جس شخص میں جو جز و غالب ہوتا ہے ویسے ہی خیالات اور افعال پائے جاتے ہیں۔ اس قبیل کے زنانہ قسم کے مرد اور مردانہ قسم کی عورتیں فطرتاً اپنی ہی جنس سے تعلقات رکھنا پسند کرتے ہیں۔ ''گھر کی صحبتیں اور کلب'' کے عنوان سے نواں افسانہ ایسے کردار کو پیش کرتا ہے' جس میں انسان ہر ملنے والے کی تعریف وتوصیف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا ڈالتا ہے اور ایسی ایسی تعریفیں منہ پر کرتا ہے' جو مفقود ہوں اور پیٹھ موڑتے ہی ہزاروں عیب نکال کر لوگوں کے سامنے بکھیر دیتا ہے۔ چرب زبانی اور بسیار گوئی کی انتہا کر دیتا ہے۔

''گناہ کا خوف'' کے آخری حصے میں ''امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات'' کے عنوان سے چودھری محمد علی نے پانچ انشائیے تحریر کیے ہیں' جن کو پڑھ کر پیشہ خدمت گاری سے تعلق رکھنے والی' رؤسا کے یہاں کام کاج کرنے والی' امامن مہری کی جیتی جاگتی' چلتی پھرتی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اس کے جملہ عادات واطوار' خصائل اور اس کی زبان و بیان کا ایک بہت ہی کامیاب مرقع ہے۔ ہر انشائیہ میں اس کو ایک مختلف انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ پہلا انشائیہ ''ایمان داری بہترین دوراندیشی

ہے'' اس فلسفے کو پیش کرتا ہے کہ غربت کا تقاضہ ہے کہ چیزوں کی ریل پیل میں سے حسبِ ضرورت اگر کچھ چیزیں کمال ہوشیاری سے چرالی جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ مگر جب چوری پکڑی جانے کا اندیشہ ہو تو جھٹ سے ایماندار بن جانا چاہئے۔ دوسرے انشائیہ ''رکھ رکھاؤ'' میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ جب انسان کے حالات بگڑ جائیں تو اسے رکھ رکھاؤ اور وضعداری کو ترک کر دینا چاہئے' ورنہ یہ عذاب بن جاتا ہے۔ تیسرے انشائیہ ''تیہا' طنطنہ' جوشا' غصہ' جذبہ'' میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے انسان میں جو جذبات تخلیق فرمائے ہیں وہ بلاوجہ نہیں ہیں۔ مثلاً اگر کسی نے کسی شخص کو دبانے کی کوشش کی اور اس نے پلٹ کر غصہ سے اس کو جواب دیا تو پھر دبانے والے کی ہمت پست پڑ جاتی ہے۔ چوتھے انشائیے ''کام کاج'' میں یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ محنتی اور کام کاج والے شخص کو لوگ اس کی خامیوں کے باوجود برداشت کر لیتے ہیں۔ محنت سے خود داری اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ جوانی کی محنت بڑھاپے میں فراغت کا باعث بنتی ہے۔ پانچویں انشائیے ''خیر خیرات'' میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ دینے دلانے کے سلسلے میں پردہ داری اور خلوصِ نیت ہونی چاہئے' تاکہ لینے والا شرمندہ نہ ہو۔ یہ نہ صرف آخری انشائیہ ہے بلکہ اس کتاب میں تحریر کیا جانے والا آخری مضمون بھی ہے۔ کتاب میں چودھری محمد علی کے تحریر کردہ ''دیباچہ'' کو نمبر شمار ایک دیا گیا ہے جس کی وجہ سے پندرہ مضامین (بشمول دیباچہ) محسوس ہوتے ہیں۔

پردے کی بات:۔

ایک انتہائی مختصر سا پاکٹ سائز کتابچہ ہے' جس پر سنِ اشاعت اور پریس کا نام درج نہیں۔ مفت تقسیم کیا گیا تھا' اس لئے نایاب ہے۔ اس کے ناشر خود چودھری محمد علی تھے اور ادارہ نیا سنسار' لکھنؤ تقسیم کنندہ تھے۔ حفظانِ صحت کے پیشِ نظر تحریر کیا گیا' جس میں فطری ضبطِ تولید کا موثر طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ بچوں کی بے تحاشہ پیدائش سے عورتوں کی صحت و تندرستی پر رونما ہونے والے خراب اور ناقابلِ تلافی برے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ کثرتِ اولاد کے باعث معاشی مسائل' بچوں کی نامناسب نگہداشت اور ان کی تعلیم و تربیت' پرورش و پرداخت میں کوتاہی کی وضاحت کی گئی ہے اور خاص طور پر عورتوں کو مخاطب کر کے تحریر کیا گیا ہے۔

کشکول محمد علی شاہ فقیر:۔

یہ کتاب چودھری محمد علی کی کہانیوں' طنزیہ خاکوں اور بعض دوسرے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں ۳۵ تحریریں شامل ہیں۔ اسے ۱۹۵۱ء میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا۔ یہ کتاب ۲۲۶ صفحات پر مشتمل

ہے جن میں آخری دو صفحات میں چارٹ کی شکل میں اغلاط نامہ شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں صفحہ ۵ سے صفحہ ۲۴ تک ''تعرف مصنف'' کے عنوان سے ماہنامہ ''ادبی دنیا'' لاہور کے ایڈیٹر صلاح الدین احمد کا تحریر کردہ مضمون ''محمد علی ردولوی' اردو کا اولین فطرت نگار'' شائع کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد صفحہ ۲۵ پر ''عرضِ حال'' کے عنوان سے چودھری صاحب نے دو تمہیدی پیراگراف تحریر کئے ہیں لیکن یہ تمام صفحات کتاب سے الگ تصور کئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے بعد کتاب کی دوبارہ سرخی ڈال کر نئے سرے سے نمبر شمار کا آغاز کیا گیا ہے۔ سید علی کاظم نے اسے دوبارہ اپنی ترتیب شدہ کتاب ''کشکول'' میں ۱۹۸۰ء میں باب الاسلام پریس' کراچی سے چھپوا کر اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع کیا۔ اس دوسرے ایڈیشن میں یہ کتاب ۳۹۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب کے آغاز میں تین صفحات پر مشتمل سید سجاد ظہیر کا تحریر کردہ ''اقتباس از روشنائی'' چودہ صفحات پر پھیلا ہوا سید علی کاظم کا لکھا ہوا ''حرفِ اول'' اور صلاح الدین احمد کا تحریر شدہ ''تعارفِ مصنف'' شائع کئے گئے ہیں۔ کون سا مضمون کتاب میں شامل ہے اور کون سا نہیں اندازہ لگانا مشکل ہے اس لئے کہ ''تعارف مصنف'' صفحہ ۹ سے شروع ہوتا ہے۔ اس دوسرے ایڈیشن میں ۳۶ مضامین شامل ہیں۔ آخر میں ''دور کا نشانہ'' کے عنوان سے ایک خاکہ بھی شائع کیا گیا ہے جو پہلے ایڈیشن میں موجود نہ تھا۔

''عشق بالواسطہ'' اس کتاب کی پہلی کہانی ہے' جس میں انسانی نفسیات کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مرد صنفِ نازک سے اجتناب ظاہر کرتا ہے۔ جس کی وجہ اس کی جانب کشش اور میلان ہوتا ہے' جسے وہ دوسری طرح ظاہر کرتا ہے۔ ''دھوکہ'' ایک شاہکار کہانی ہے۔ جس میں اس حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر انسان باطنی تقاضوں کو کسی دباؤ کے تحت نہیں پورا کرتا تو ایک شدید نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ فطری قوانین کے برخلاف اگر کوئی ایسا قدم اٹھاتا ہے جس سے ان شدید تقاضوں کی تکمیل ہو سکے تو اس کے نتائج اچھے بھی نکل سکتے ہیں اور ناخوشگوار بھی۔ ''نیلم کانگ'' ایک بہترین افسانہ ہے جس میں ایک بہت ہی گرے ہوئے اور گھناؤنے ماحول میں رہنے والی عورت کے حالات بتائے گئے ہیں۔ اور بعد ازاں اچھا ماحول ملتے ہی یہی عورت نکھر کر اس قدر صاف ستھری اور پاکیزہ ہو جاتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ افسانہ ایک نفسیاتی شاہکار ہے۔ ''یادِ احباب'' کے تحت ''دیو جانس یا ابی تورس؟'' ایک چھوٹا عنوان دے کر ایک ایسے تعلقہ دار کا شخصی خاکہ تحریر کیا ہے' جو دیکھنے میں جنگلی' ہوش' جاہل و بیہاتی' بے وقوف اور بانگڑو نظر آتا ہے مگر گفتگو میں بہت دور کی کوڑی لانے والا' کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پہنانے والا اور بڑی گہری و فلسفیانہ باتیں کرنے والا انسان ہے۔ ''میر باقر'' کے عنوان سے ایک اور نہایت دلچسپ مزاحیہ شخصی خاکہ تحریر کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جس کی طبیعت میں از حد مسخرہ پن ہے اور وہ

اکثر مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا کر دیتا ہے۔ ''میزوکزم'' میں دو اجنبی بیماریوں کو واقعات کے غلاف میں لپیٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں واضح کیا گیا ہے کہ سیڈزم (Sadism) میں مار کر اور میزوکزم (Masochism) میں پٹ کر صرف لطف ہی نہیں آتا بلکہ تسکین بھی حاصل ہوتی ہے۔

''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' کے عنوان سے پانچ مضامین تحریر کئے گئے ہیں۔ چودھری صاحب علم و ادب کی نگری سے فقیرانہ گزرتے ہیں اور جہاں کہیں سے جو کچھ اور جتنا کچھ ملتا ہے اپنے حافظے کے کشکول میں ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین میں آپس میں کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ بلکہ دانستہ طور پر بے ترتیبی اس خیال سے رکھی گئی ہے کہ فقیر کے کشکول میں بندے کا دیا اور اللہ کا دلوایا کیا کچھ نہیں ملتا ہے۔ کبھی اس کشکول میں کسی کی داستانِ حیات، کبھی کسی شاعر کا اچھا شعر، کبھی کسی مفکر کا ادا کردہ بیش بہا جملہ اور کبھی کسی اخبار سے حاصل کردہ کوئی حیرت انگیز خبر یا کسی ڈائجسٹ میں تحریر کردہ کوئی مفید معلومات برآمد ہوتی ہے۔ اس سلسلے کے پہلے مضمون میں پان میں ڈالے جانے والے اجزاء اور ان کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعد ازاں میر، بیان، مجنوں، حالی، جلال، غالب، حافظ وغیرہ کے اشعار تحریر کئے گئے ہیں اور اس کے بعد ''کہروا'' ناچ کی دھن پیش کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا سلسلے کی دوسری تحریر میں گفتگو پھاگن رت کی سرمستیوں اور کبیر گانے سے شروع کی گئی ہے۔ اور سیاسی عیاریوں کا پردہ فاش کر کے ختم کر دی گئی ہے۔ تیسرے مضمون میں تین قطعاً الگ الگ خیالات پیش کئے گئے ہیں، جن کا آپس میں نہ کوئی تعلق ہے اور نہ ربط۔ چوتھا مضمون بھی پانچ ایسے اجزاء پر مشتمل ہے جن کا آپس میں سرے سے کوئی ربط یا تعلق نہیں ہے۔ پانچواں مضمون کارڈنل نیومین کی تحریر ''شریف کا خاکہ'' کا اردو ترجمہ ہے جس میں درحقیقت ایک شریف انسان کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ ''وزیر گنج (اودھ) کے غیر مطبوعہ ''گزیٹر کا ایک ورق'' میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ اکثر جرائم پیشہ لوگ اپنے سیاہ کارناموں پر پردہ ڈالنے کی غرض سے مذہب کا سہارا لیتے اور اس کے پیچھے غلط کام کرتے رہتے ہیں۔ ''دوا'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں غیر مرئی حقیقتوں کی تصویر کشی کی گئی ہے اور سماج کے ہر طبقے کی نفسیات کو فنکاری کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ آخری مضمون ''دور کا نشانہ'' یہ ایک ایسے شخص کا خاکہ ہے جو بدلا لینے اور دشمن کو ذلیل کرنے کا مہاجنی طریقہ استعمال کرتا ہے۔

''مس ہیلن'' میں ایک ایسی خاتون کا کردار پیش کیا گیا ہے جو انگلستان سے ہندوستان خدمتِ خلق کے ارادے سے آئیں، جوان ہیں خوبصورت بھی ہیں اور گفتگو میں بڑی بے تکلف ہیں۔ وہ کلب میں دوسروں کے سامنے مختلف مردوں اور

عورتوں کے جنسی رجحانات کا بڑی بے باکی سے تجزیہ کرتی رہتی ہیں۔ گفتگو کے دوران ان کی اپنی نفسیاتی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''اندرسبھا کی امانت'' میں ایسی کہانی پیش کی گئی ہے جس میں اندرسبھا میں کام کرنے والے کردار آہستہ آہستہ حقیقی زندگی سے منسلک ہو گئے ہیں۔ اور اندرسبھا اس قدر رچ بس جاتی ہے کہ اس کا رواج ختم ہو جانے کے باوجود زندگی کے آخری لمحات میں روح اس وقت تک قصرِ عنصری سے پرواز نہیں کرتی جب تک اندرسبھا کی یادگاریں سینے پر لاکر نہیں رکھ دی جاتیں۔ ''روزہ خور کی سزا'' میں روزے کے نزاعی وقت' دو روزداروں کے درمیان بات بے بات لڑائی اور ایک دوسرے پر الفاظ کی مار مارنے کا بہت ہی اچھا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور ہذیان گوئی کے ساتھ ساتھ چہرے مہرے کی بدلتی ہوئی کیفیات کی اچھی تصویر کشی کی گئی ہے۔

''زندگی کا مقصد'' میں ایک ایسا کردار پیش کیا گیا ہے جس نے سوائے عیش وعشرت' رنگین مزاجی اور رئیسوں کی مصاحب گیری کے اور کوئی کام نہیں کیا۔ ساتھ ہی ساتھ تمباکو خوری کی بھی عادت ڈال لی۔ تمباکو فروش کے انتقال کے بعد لت ایسی لگ گئی تھی کہ ایک دوسرے تمباکو فروش کی تلاش میں نقل مکانی کیا اور نسخہ تمباکو کے حصول کے لئے اس کی مطلقہ اور عمر رسیدہ بیٹی سے شادی بھی کر لی۔ اس طرح کے انسانوں کے نفسیاتی پہلوؤں کو بڑے احسن طریقہ سے واضح کیا گیا ہے۔ ''پیرس کی ایک کہانی اناٹول فرانس کی زبانی'' دراصل ''ٹائمس آف لٹریچر'' میں شائع شدہ ایک کہانی کو اردو کا لباس پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ کردار تو فرانسیسی ہیں مگر زبان کا تسلسل اور روانی ایسی ہے کہ نامانوسیت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ استعمال کیا جانے والا شعر بھی بالکل مقامی ہے۔ ''قیافہ'' میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عام طور پر لوگوں کے درمیان بیٹھ کر ہر ایک اپنے چہرے پر مصنوعی تبسم اور ظاہرداری کا خول چڑھائے ہوتا ہے' جس سے صحیح طور پر قیافہ شناسی ممکن نہیں۔ لیکن اگر کسی کا صحیح چہرہ دیکھنا ہو تو ایسے وقت میں دیکھا جائے جب اسے خبر نہ ہو کہ کوئی شناسا اسے دیکھ رہا ہے اور وہ اپنے محبوب مشغلہ میں مصروف ہو۔ اس کی مکمل وضاحت کے لئے ایک چھوٹی سی کہانی بھی بیان کی گئی ہے۔

''ہندوستان کی سیر'' یہ ایک مختصر سا طنزیہ مضمون ہے جس میں مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ سیر کی غرض سے آئے ہوئے امریکیوں کی جہالت اور ہندوستان کے کسم پرسی کے حالات پر بھرپور طنز ہے۔ کسی اسٹیشن پر کھڑی ایک سست رو ٹرین کے مسافروں کی مختصر سی داستان ہے۔ چودھری صاحب کے تحریر کردہ خاکوں میں سے ایک عبرت ناک خاکہ ''راجہ پرتھی پال سنگھ'' کا ہے جو باشعور' صاحبِ علم اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پرتھی پال سنگھ میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ وہ جس کے گرویدہ ہوتے تھے اپنی زندگی بالکل اسی کے حوالے کر دیتے تھے اور اپنی سوجھ بوجھ اور فہم وفراست کو بالائے طاق رکھ دیتے

تھے۔ وہ زندگی کے ہر مرحلے میں کسی نہ کسی کے گرویدہ ضرور ہوئے ہیں۔ اس خاکے میں چودھری محمد علی نے اعتماد گرویدگی اور عقیدت مندی کی ایک ایسی تصویر پیش کی ہے جس کا تعلق عقل و شعور سے قطعاً نہیں۔ گرویدگی کا اظہار کرنے کے لئے چودھری صاحب نے جو پیراسائٹ پودوں کی مثال دی ہے وہ البتہ درست نہیں اس لئے کہ پیراسائٹ یعنی طفیلی پودے مثلاً آکاش بیل یا امربیل جن پودوں پر سوار ہو جاتے ہیں انہیں تہہ و بالا کر کے ہی دم لیتے ہیں۔

''استاد'' میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو بے حد دردمند دل رکھتا تھا اور ہر ایک کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ اس کہانی میں نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایسے کردار پیش کئے گئے ہیں جن سے ان کی نفسیاتی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''غریبی میں امیری'' میں ایک ایسے وضع دار نواب کے حالات بیان کئے گئے ہیں جن کا سب کچھ لٹ چکا تھا اور تنگ دستی میں زندگی گذار رہے تھے۔ مگر فیاضی اور سخاوت میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ جملہ خوبیوں کے ساتھ مبالغہ آمیزی کی زبردست قوت کے مالک تھے۔ ''مرزا منش'' میں دو بھائیوں کے خاکے پیش کئے گئے ہیں جن کی طبیعت میں نوابی تھی یعنی نوابوں کی تمام بری عادتیں پڑی ہوئی تھیں جن کو غربت کی وجہ سے پورا کرنا محال تھا۔ اس خاکے میں بھی نچلے طبقے کے لوگوں کے نفسیاتی رجحانات پیش کئے گئے ہیں۔

''مرزا یوسف'' ایک ایسے شخص کا خاکہ ہے جو ساری زندگی غربت کے خلاف لڑتا رہا اور تنگ دستی کے خلاف جدوجہد کرتا رہا مگر ایمان داری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ جہاں کہیں ظلم و زیادتی دیکھتے تھے فوراً سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ ''نفاست'' میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو خوش بیانی میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ باتیں بڑی دلچسپ کرتے تھے مگر تخیل کی پرواز میں مضمون کو کہاں سے کہاں لے جاتے تھے۔ اور زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے۔ ''جاگتی تصویریں'' میں پہلے تو لندن کی ایک تصویر کو دیکھ کر دماغ میں ابھرنے والے خیالات اور تاثرات کو انتہائی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ اور پھر کسی مرزا صاحب کی زبانی ہندوستان کے ایک جلسے میں رونما ہونے والے حالات میں اس کی مماثلت بیان کی گئی ہے مگر ساری خوبی انداز بیان کی ہے۔

''ایک عمدہ کتاب'' میں سر رضا علی کی کتاب ''اعمال نامہ'' پر مختلف لوگوں کی اپنے اپنے لحاظ سے تنقیدی گفتگو دکھا کر کسی مرزا صاحب کے ذریعہ ایک دلچسپ واقعہ بیان کروایا گیا ہے، جس کا محور جنسی نفسیات ہے۔ ''میٹھا معشوق'' میں ایک انتہائی دلچسپ اور مزاحیہ کہانی بیان کی گئی ہے جو مٹھائی کے ایک ٹوکرے کو بحفاظت ایک لمبے سفر کے دوران منزل مقصود تک لے جانے سے متعلق ہے۔ ایک بدنیت ملازم مسلسل مٹھائی چرانے کے لئے مختلف حربے استعمال کرتا رہتا ہے۔ ''نیک کام''

ایک خالص نفسیاتی مرقع ہے۔ پہاڑ پر بسنے والی ایک آٹھ نو برس کی بچی جس کا بچپن میں ایک ہاتھ جل گیا تھا اور جسے اس کے باپ نے ایک مالی کے ہاتھ دوسو روپیہ میں فروخت کر دیا تھا۔ اس کم سنی میں اس پر ظلم ہوتے تھے۔ اس لڑکی کے چہرے کے تاثرات اور نفسیات کو بڑے احسن طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

''خوش مزاقی کے اندھے'' اس مضمون میں ایک ایسے خوش مذاق اور نفیس طبیعت کے حامل شخص کی زندگی دکھائی گئی ہے جس کی شادی ایک جاہل اور دیہاتی عورت سے کر دی جاتی ہے جو ان کی زندگی کو اجیرن کر دیتی ہے۔ اس کے انتقال کے بعد وہ ایک ایسی طوائف کی صحبت میں وقت گزارنے لگتے ہیں جو عمر میں ان سے بہت بڑی لیکن انتہائی مہذب اور شائستہ عورت ہے۔ یہاں پر بھی انسانی نفسیات کی بہت اچھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ''رقابت'' میں ایک چھوٹا سا مضمون پیش کیا گیا ہے جس میں پہاڑ پر مقیم ایک عمر رسیدہ شخص کے نوجوان اور خوبصورت مگر بیوہ رئیس زادی سے مجلسی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں ایک جوان کارکن ان کی ضعیف العمری ظاہر کرنے کے لئے خوش اخلاقی کے حربے استعمال کرتا ہے۔ یہ مضمون بھی انسانی نفسیات کے پہلو بیان کرتا ہے۔ ''بیوی کیسی ہونی چاہئے'' ایک طنز و مزاح سے بھرپور مضمون ہے جس میں سنجیدگی بھی ہے اور شگفتگی بھی۔

''ٹیگور'' رو بندرو ناتھ ٹھاکور (بنگلا تلفظ) کی شاعری کی خصوصیات اور ان کے خیالات بیان کرنے کی غرض سے تحریر کردہ مضمون ہے۔ جس میں بہت زیادہ علمیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور بڑے سنجیدہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''گدھی کی بتیا'' طنز و مزاح سے بھرپور کہانی ہے' جو ایک تنبولی یعنی پان فروخت کرنے والے سے متعلق ہے۔ جس کی دوکان بہت اچھی چلتی تھی مگر لوگوں کے کہنے پر اس نے بنواڑی لگوالی۔ ایک دھوبن کی بیمار اور لنگڑی گدھی وہاں گھس جاتی اور بنواڑی کا ستیہ ناس کر دیتی تھی۔ ایک دن تنگ آ کر تنبولی کے لڑکے نے اس کی پٹائی کر دی جس سے زخمی ہو کر وہ تیسرے روز مر گئی۔ تنبولی کو دھوبن کا نقصان الگ پورا کرنا پڑا اور بعد ازاں ایک پنڈت جی گدھی کی بتیا کا بہانہ لے کر سر پر سوار ہو گئے۔ جس کے باعث اسے بتیا دان بھی دینا پڑا۔ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مذہبی ٹھیکے دار کس طرح سادہ لوح لوگوں کو مذہب کے نام پر بے وقوف بناتے ہیں۔

میرا مذہب :۔

اس کتاب کو ۱۹۵۱ء میں یونائیٹڈ پریس' امین آباد لکھنؤ میں طبع کروا کر شائع کیا گیا۔ یہ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل

اور ۱۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ابتداء میں سات صفحات پر مشتمل دیباچہ ہے' جس کا دلچسپ عنوان ہے ''اے غریب دیباچے تجھ کو کون پڑھے گا''۔ چودھری صاحب نے اس کتاب میں مذہب اسلام کے دو بڑے فرقوں' شیعہ اور سنی کی خوبیوں اور خامیوں کی اپنے نقطہ نظر سے نشاندہی کی ہے۔ اور یہ کوشش کی ہے کہ ہر بات کو دلائل سے ثابت کیا جائے۔ انہوں نے یہ کتاب مذہبی تعلیم دینے کی غرض سے نہیں لکھی بلکہ اس میں اپنے مصلحانہ عقائد کی شرح اور ترجمانی کی ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں مذہب کے بارے میں اپنے خیالات کا مختلف واقعات کے ذریعہ اظہار کیا ہے اور تبرے کو نامناسب قرار دیا ہے۔ دوسرے باب میں اپنی پہلی بیوی کے ساتھ حج بیت اللہ کے سفر کا مفصل حال درج کیا ہے۔ یہاں تقلید کے سلسلے میں اپنا نقطہ نظر واضح کیا ہے اور وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں دلیل بھی پیش کی ہے۔ تیسرے باب میں مدینہ منورہ کے سفر کا ذکر ہے اور نماز باجماعت کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

کتاب کے چوتھے باب میں چودھری صاحب نے مجالس کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان ذاکرین پر تنقید کی ہے جو بے بنیاد روایات کا سہارا لیتے ہیں۔ انہوں نے مجلس کے دوران لوگوں کے رونے پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پانچویں باب میں اپنے ان عقائد کا ذکر کیا ہے جو شیعہ اور سنی فرقوں کے درمیان اختلافات کا باعث ہیں۔ اور تاریخی حقائق بیان کر کے مستند دلائل کے ذریعہ اپنی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ خلفائے راشدہ کی اہمیت اور فضیلت کا بھی ذکر کیا ہے۔ چھٹے باب میں خلفائے راشدین کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور اختلافی مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ چاروں خلفاء کے بارے میں اچھے اور احسن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ساتویں باب میں تدوین احادیث پر اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ تبرہ کو حماقت اور گناہ قرار دیا ہے۔

آٹھویں باب میں تدوینِ احادیث کے موضوع پر مزید تنقیدی بحث کی ہے اور معجزات و کرامات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نویں باب میں شیعوں کے مختلف فرقوں پر تنقید کی ہے۔ تصوف اور حال و قال پر بھی بحث کی ہے۔ دسویں باب میں قرآنِ حکیم' اس کی تفسیر اور تاویل پر گفتگو کی ہے اور تعزیہ داری کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ گیارویں باب میں متعہ کے متعلق اپنی رائے دی ہے۔ بارہویں باب میں بارہویں امام کی غیبت پر بحث کی ہے۔ تیرہویں اور آخری باب میں چودھری صاحب نے مذہب کے بارے میں اپنے خیالات و عقائد کا ذکر کرنے کے بعد ایسے مفید مشورے دیئے ہیں جن سے جذبہ تنافرت کم ہو۔ ایک دوسرے کے خلاف بغض و کینہ کھٹے اور محبت' اخوت و یگانگت کے جذبات پیدا ہوں۔ چودھری محمد علی نے یہ کتاب اپنے مذہب کی ترویج اور تبلیغ کی غرض سے تحریر نہیں کی بلکہ اس میں اپنے مذہبی

نظریات کا اعتراف کیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ اگر دونوں فرقوں کے لوگ اسی طرح اسلامی تعلیمات پر غور و فکر کریں تو باہمی افتراق کی خلیج کم ہو سکتی ہے۔

گویا دبستاں کھل گیا:۔

یہ چودھری محمد علی ردولوی کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنے مختلف اعزا و اقربا، دوست احباب اور اپنے جاننے والوں کو وقتاً فوقتاً تحریر کئے ہیں۔ اس کتاب کو بھی ہما بیگم نے مرتب کر کے اگست ۱۹۵۶ء میں کریسنٹ پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر اکادیمی پنجاب لاہور کے ذریعہ شائع کیا ہے۔ اس کا پیش لفظ خود ہما بیگم نے تحریر کیا اور اس کی تمہید ''اس کتاب میں'' کے عنوان سے صلاح الدین احمد نے لکھی۔ اس میں چودھری صاحب کے تحریر کردہ ۱۰۵ خطوط شامل ہیں اور یہ کتاب ۲۸۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

گیارہ سال کے وقفے کے بعد ہما بیگم نے اس کتاب کو ۱۹۷۷ء میں باب السلام پرنٹنگ پریس کراچی سے چھپوا کر اردو اکیڈمی سندھ کراچی کے ذریعہ دوبارہ شائع کیا۔ ''پیش لفظ'' اور ''اس کتاب میں'' (تمہید) لفظ بہ لفظ پہلے ایڈیشن کی طرح ہیں اور بعد ازاں ''تعارف'' شان الحق حقی نے لکھا ہے، جو کہ نئی تحریر ہے۔ اس دوسرے ایڈیشن میں ۱۸۱ خطوط شامل ہیں جن میں ایک ایسا خط بھی شامل ہے جسے شہاب الدین صاحب نے چودھری محمد علی کے نام پہلا ایڈیشن دیکھنے کے بعد تحریر کیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جن میں آخری پانچ صفحات پر چودھری صاحب کی نادر تصانیف کا تعارف اور اردو اکیڈمی سندھ کراچی کی دیگر مطبوعات کا تعارف بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ۴ ستمبر ۱۹۳۶ء سے لے کر چودھری صاحب کے انتقال سے ایک سال قبل ۱۰ ستمبر ۱۹۵۸ء تک کے تحریر کردہ خطوط شامل ہیں۔

۳۔ جملہ تصانیف کا لسانیاتی جائزہ:۔

''اتالیق بی بی'' چودھری محمد علی کا ایک مزاحیہ شاہکار ہے جس میں جا بجا اس طرح کے جملے اور عبارتیں پائی جاتی ہیں کہ قاری برابر ہنستا اور مسکراتا رہتا ہے۔ شوخی اور خوش مزاقی ان کی تحریر کا خاصہ ہیں۔ مثلاً

''ہاں تو یہ کلب کون چیز ہے؟

کلب پیاری ایک جگہ ہے جس میں ۔۔۔۔۔

بس رہنے دو۔ سب جانتی ہوں ۔۔۔ تم کہاں کے کروڑ پتی آئے جو روز موٹی رنڈی نچاؤ گے اور جلسہ دیکھا کرو

مگے ۔۔۔لوکھلا نہ اب روز ناچ رنگ ہوتا ہے؟۔۔۔۔بھئی سنوتو۔ ناچ واچ کیسا۔ کچھ خبر ہے؟

بس جو کچھ خبر ہونی تھی ہو چکی ۔۔۔۔تم ابھی اپنے منہ سے ناچ جلسہ کہہ چکے ہو۔اب مکرنے سے کیا ہوتا ہے؟

یا خدا یہ بدی میرے آگے آئی۔لوصاحب ہم کو خبر ہی نہیں اور ہاں روز رنڈی آتی ہے۔

۔۔۔۔بھلا میں نے ناچ کا کب نام لیا۔

ناچ۔ہائے غضب آپ ہی ناچ جلسہ پکارتے پھرتے ہیں اور آپ ہی مکرتے ہیں۔

ارے میں نے تو جلسہ کہا تھا۔ناچ کہاں ہوتا ہے؟

ہاں ہاں مکر جاؤ۔کون نہیں جانتا کہ جلسے میں وہی موئیاں ناچتی ہیں۔

۔۔۔تم نے تو اپنے جوش میں آکر بات ہی کچھ کی کچھ کر دی۔

بات کیسی؟ تقدیر ہی رنگ بھنگ ہوگئی۔جس گھر میں ان سبز پریوں کا قدم آیا اسے جڑ بنیاد سے کھد جاتے ہی دیکھا۔ اللہ مجھے یہ دن دیکھنے کو نہ رکھتا تو بہتر تھا۔

۔۔۔تمہارے سر کی قسم۔

بس کہہ دیا ہے۔میرے سر کی قسم نہ کھانا' نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔کسی کنوئیں تالاب میں جا کر ڈوب مروں گی۔ان انگاروں پر مجھ سے نہ لوٹا جائے گا۔

۔۔۔کلب ایک مکان ہوتا ہے جس میں دوست آشنا جمع ہوتے ہیں۔

ہائے خدا موت بھی نہیں آتی؟ میرے ہی جہیز کے پلنگ پر لیٹے لیٹے آشنا نگوڑی کی تعریفیں ہو رہی ہیں اور میں سننے کو زندہ بیٹھی ہوں۔

۔۔۔آشنا بہ معنی دوست ملاقاتی۔۔۔مجھ کو رنڈی منڈی سے کوئی سروکار نہیں۔۔۔۔

کلب تو ایک مہذب مقام ہے وہاں اس طرح کے لوگ گھسنے بھی نہ پاتے۔

۔۔۔اگر وہاں کوئی بات اس طرح کی نہیں تو جاتے ہی کیوں ہو؟

صرف دو گھڑی باتیں کرنے میں جی بہلتا ہے۔

ہاں تو وہاں جی بہلتا ہے اور گھر کاٹے کھاتا ہے۔۔۔میں کوئی موئیاں چھوتی ہوں یا چٹکیاں لیتی ہوں جو تم اب کلب بھاگے پھرتے ہو۔۔۔یہ میں کہتی ہوں کلب میں کیا دھرا ہے جو گھر میں نہیں؟

اجی کلب میں پڑھے لکھوں کی صحبت رہتی ہے۔ لائق لوگوں کا مجمع ہوتا ہے اور کیا؟

اچھے لائق لوگوں کا مجمع ہے کہ بجز سڑی ہوئی تمباکو اور پان پر پان کھانے کے کچھ نہیں۔ جب گھر آتے ہو تو منہ اگالدان ہو جاتا ہے اور وہ بو کہ سونگھ کر جی نفرت کرے''۔ ۵

اس کتاب کے تیسرے باب میں غریب شوہر نے مغربی طرزِ معاشرت سے متاثر ہو کر جو ترقی پسندی کی علامت تصور کی جاتی ہے کلب میں شرکت کر لی۔ جب بیوی کو اس امر کا علم ہوا تو وہ اس بات سے اپنی سخت بیزاری کا اظہار کرتی ہے۔ اسے صحیح طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ کلب ہوتا کیا ہے۔ لہذا معنی سے معنی نکالتی ہے اور بات کا بتنگڑ بناتی چلی جاتی ہے۔ وہ کلب کو کوئی ایسی جگہ سمجھنے لگتی ہے جہاں رقص و سرود، نغمہ سرائی اور شراب و نشاط کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چودھری محمد علی نے یہاں گفتگو کی وہ پھلجڑیاں چھوڑی ہیں کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائے اور یہی ان کی تحریر کا کمال ہے۔

اس کتاب میں چودھری صاحب نے افسانوی پیرایہ میں اس طرح کی بیویوں کا ذکر کیا ہے جو اپنے شوہر سے بجائے یگانگت، ہم آہنگی اور انس و محبت کے، خانگی جھگڑوں، گھریلو بکھیڑوں اور مختلف قسم کے دکھڑوں کی داستانیں بیان کر کے الجھنیں اور ذہنی تناؤ پیدا کر دیتی ہیں۔ لسانی اعتبار سے خاص بات یہ ہے کہ اس کتاب میں چودھری محمد علی نے وہ زبان استعمال کی ہے جس میں گزشتہ معاشرت کی خواتین اودھ گفتگو کیا کرتی تھیں۔ زیادہ تر مکالمات ہی تحریر کئے گئے ہیں۔ روزمرہ اور محاوروں کا اتنا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے کہ لطف آ جاتا ہے۔ مثلاً:

''اب تو کوئی میلہ ٹھیلہ آپ سے نہیں بچتا۔ کیوں صاحب یہ تو سن۔ بال کھچڑی ہو گئے ہیں مگر میلے کی سیر نہیں چھوٹتی۔ سینک کٹا کے بچھڑوں میں داخل ہوں گے۔ موچھوں میں کاجل لگا لیا کرو جس میں خوب جوان معلوم ہو۔

۔۔۔۔ تم نے نہیں جی کہہ دیا اور میں نے مان لیا۔ اے کہو قرآن اٹھالوں کہ ضرور سوار ہوئے ہو گے۔ موئے ذلیل بھنگیڑ یول، بگڑی ہوئی گھر گرستوں کے بیچ میں ایک تخت پر تم بھی بیٹھے ہوئے ہو گے اور یہی تھوڑی۔ رومال ہاتھ میں لئے، دوسرے تخت کو چھوتے جاتے ہیں۔ اٹھکھیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔ بدن میں آگ لگ جاتی ہے جب یہ سوچتی ہوں۔ اس وقت مجھ نگوڑی کا خیال بھی رہا ہو گا؟''۔ ۶

کتاب کے آٹھویں باب میں شوہر دوستوں کے اصرار پر میلے چلے گئے۔ یہ میلہ ''آٹھوں کا میلہ'' کہلاتا ہے جو اودھ کی تہذیب و ثقافت کی نشانی ہے۔ اس میلے کی سیر میں نوجوان اور رنگین مزاج لوگ پرزور طریقے سے حصہ لیا کرتے

---

۵ ''اتالیق بی بی''، مشمولہ کشکول، صفحات ۵۶۹ تا ۵۷۲ ۶ ایضاً، صفحات ۵۹۵ تا ۵۹۷

تھے۔ بیوی کو جب یہ خبر ہوئی' تو پہلے تو میاں کا یہ کہہ کر خوب مزاق اڑایا کہ میلہ نو جوانوں کی دلچسپی کی چیز ہے اور اب ان کی یہ عمر نہیں رہی کہ اس طرح کی حرکتیں کریں۔ پھر بیوی کو یہ گمان ہوا کہ میاں ہنڈولنے پر ضرور چڑھے ہونگے اور آوارہ مزاج عورتوں سے دل لگی بھی کی ہوگی۔ لہذا بیوی کی اس سلسلے میں سخت تادیب اور سرزنش کو بیان کرنے کے لئے کیا خوبصورت زبان اور محاورے استعمال کئے گئے ہیں۔

بارہویں باب میں کچھ اس طرح کی زبان استعمال کی گئی ہے: ''اے انہیں کو کہہ رہی ہوں' جو بڑی نیک پارسا دن بھر ماموں ماموں کہتے کہتے منہ تھکاتی ہیں اور ہتھکنڈے یہ کہ بیسواؤں کے کان کاٹ لئے۔ خدانہ کرے کسی کی آنکھ کا پانی یوں مرجائے۔ ایسی موئی تو پیدا ہوتے ہی مرجائے تو اچھا ہے۔ خاندان کا نام تو نہ ڈوبے۔ نہیں تو کسی کسبی بازاری کے گھر میں پیدا ہو۔ خدانہ کرے' کسی بہو بیٹی کے دیدے ایسے چربانک ہوں۔ اور پھر وہ دیدہ دلیری تو دیکھو کہ میرے ہی سامنے بن بات کی بات پر ہنسی۔ تم نے گھر میں قدم رکھا اور ان کے دانت نکل آئے۔ یوں چاہے گھی کے گھڑے ڈھلک جائیں وہ بندی جگہ سے نہ ٹسکے گی۔ اور ادھر تم آئے ادھر آٹھ آٹھ مرتبہ آنگن میں چک پھیریاں ہونے لگیں' کہیں یہ کام کہیں وہ کام''۔ ؎

گھر میں ایک دور کے رشتے کی خاتون مہمان کی حیثیت سے آجاتی ہیں۔ بیوی کو یہ گمان ہوتا ہے کہ مہمان خاتون ان کے شوہر میں دلچسپی لے رہی ہیں اور شوہر بھی غیر شعوری طور پر ان کی جانب التفات برت رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی عورت یہ کبھی برداشت نہیں کرسکتی کہ کوئی دوسری عورت اس کے شوہر میں دلچسپی لے یا اس کا جھکاؤ دوسری عورت کی جانب ذرہ برابر بھی پیدا ہو جائے۔ تو غصہ اور جذبات میں آکر بیوی کیا خوب زبان استعمال کرتی ہے اور کیسے کیسے محاورے کام میں لاتی ہے۔ یہ چودھری محمد علی کی زبان دانی کا کمال ہے کہ مکالمات کے ذریعہ ایسی منظر کشی کرتے ہیں کہ صورت حال کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

''صلاح کار'' چودھری محمد علی کی ایک ایسی تصنیف ہے جو پڑھنے والے کو جنسی معاملات کی بنیادی باتوں سے آگاہی بخشتی ہے۔ بہتر اور خوشگوار ازدواجی زندگی گذارنے کے طریقے سکھاتی ہے' جنسی بیماریوں کا سدباب پیش کرتی ہے۔ جنسی خواہشات کی تکمیل کے صالح اور صحت مند طریقوں سے واقف کراتی ہے اور ایسے نفسیاتی پہلوؤں سے آگاہ کرتی ہے اور مفید مشورے پیش کرتی ہے جن سے جنسی آزادی کے سیل رواں کے ذریعہ پیدا شدہ مضرتوں سے بچنے کی سبیل ہو سکے۔ اس مفید کتاب میں زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ طرز تحریر ایسا ہے کہ ایک عام آدمی اس کو بخوبی سمجھ سکے مثلاً:

؎ ''اتالیق بی بی'' مشمولہ کشکول' صفحات ۶۲۱ تا ۶۲۲

''انگریزی کتابوں میں اکثر دیکھتے ہیں کہ ایک عورت باوجود سچی محبت کے اپنی زندگی تباہ کر دیتی ہے اور کسی ادھیڑ امریکن کروڑ پتی کے ساتھ صرف اس وجہ سے شادی کر لیتی ہے کہ جس قدر دولتمندی کی وہ عادی تھی اس کا عاشق اس قدر دولتمند نہیں تھا۔ اسی کے مقابلہ میں ہندوستانی شریف خاندانوں کو دیکھ لیجئے جہاں عموماً لڑکی کو زیادہ عمدہ کپڑے اس وجہ سے نہیں پہناتے کہ نہ معلوم کہاں تقدیر ہو۔ اپنے بچے کو کون نہیں چاہتا اس کے آرام میں اپنا آرام کون نہیں دیکھتا مگر بات یہ ہے کہ ان گئے حالوں پر بھی ہندوستانی کی نظر صرف دولت ہی پر نہیں جاتی'' [۸]

یہ اقتباس دوسرے باب کی دوسری فصل سے لیا گیا ہے۔ جس کا عنوان ہے ''شادی'' اس کہانی میں انگریزی اور ہندوستانی طریقہ ہائے شادی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دونوں کا بخوبی موازنہ کیا گیا ہے۔ یہ جتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انگریزی ماحول کے برخلاف مشرقی ماحول میں روپیہ پیسہ کو اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ ازدواجی زندگی میں خلوص و محبت کو اہمیت دی جاتی ہے۔

چوتھے باب کی دوسری فصل میں ''نشہ'' کے عنوان سے چودھری صاحب شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کے ذریعہ جنسی ذرائع سے پیدا ہونے والے نقصانات سمجھانے کے لئے یوں رقمطراز ہوتے ہیں:۔

''سوزاک اور آتشک کی سب سے بڑی دلال شراب ہے۔ گناہ کا سودا جس قدر خریدا جاتا ہے زیادہ تر اسی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ بڑے بڑے مصنفین نے لکھا ہے کہ ایک ہی عورت کو دو آدمی مصرف میں لائے اور شرابی پھنس گیا۔ اور ہوشیار بچ نکلا وجہ یہ ہے کہ نشہ میں آدمی صرف یہی نہیں کہ دیر تک مصروف رہتا ہو۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ احتیاط نہیں کرتا اگر کھال میں خراش آگئی تو اس کے اعصاب دماغ تک خبر نہیں پہنچاتے۔ اگر عورت کھلم کھلا بیمار ہے تب بھی آگ میں چھلانگ پڑنے میں باک نہیں۔ پھر اس کے بعد بھی کچھ پرواہ نہیں۔ صبح کے وقت اعضاء شکنی، کسل ایسا مسلط ہے کہ اس وقت بھی کچھ نہ ہو سکا اور آخر کار بیمار پڑ گئے۔ شراب سے قوتِ ارادی پر وہ زوال آتا ہے کہ دیکھنے والے عبرت کریں'' [۹]

جنسی معاملات میں شراب نوشی کی وجہ سے پیدا شدہ مضمرات کو چودھری محمد علی نے مذکورہ بالا پیرایہ میں کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ بند بند الفاظ میں کتنی بڑی بڑی باتیں کہہ ڈالی ہیں مگر کہیں پر بھی فحش نگاری اور کج بیانی کا اظہار نہیں ہوتا۔ جوں جوں قاری اس کتاب کو پڑھتا جاتا ہے اسے بیان کی پیچیدگی کم محسوس ہوتی ہے اور باتیں آسانی سے سمجھ میں آتی چلی جاتی ہیں۔ تحریر قطعاً گنجلک اور پیچیدہ نہیں، زبان کی شگفتگی برقرار رہتی ہے اور یہی چودھری صاحب کی تحریر کا خاصہ ہے۔

۸۔ ''صلاح کار'' صفحہ ۴۷

۹۔ ''صلاح کار'' صفحات ۹۴ تا ۹۵

''یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم'' نامی کتاب میں چودھری محمد علی نے بڑی کامیاب کوشش کی ہے کہ مولانا مصوف کی سچی اور صحیح تصویر کھنچ جائے۔ چونکہ چودھری صاحب ان کی علمیت' اخلاق اور باوقار شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھے اور ان کی محبت اور شفقت کی بناء پر ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے' لہذا انہوں نے اپنی تحریر میں اس بات کا مسلسل خیال رکھا ہے کہ اس عقیدت کا صحتِ مضمون پر اثر نہ پڑے۔ مولانا کی زندگی کے مختلف واقعات کا ذکر بہت ہی دلچسپ' پرلطف اور انتہائی شگفتہ انداز میں کیا گیا ہے' مثلاً:

''مولوی صاحب کے پاس خدمت گار نہیں رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اوپر کی آمدنی بالکل مفقود تھی۔ نوکر کا دل کیونکر لگتا۔ مولانا کی معمولی غذا یہ تھی چار انڈے کچے' کچھ خوبانیاں' کچھ بادام علی الصباح۔ ابلی ہوئی مچھلی' چوکر کی روٹی' تقریباً ایک چھٹانک ابلی ہوئی ترکاریاں اور دہی قریب گیارہ بجے دن کے۔ دہی اور ترکاریاں رات کو۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو سوا مولانا کے دوسرا شخص کا ہیکو کھاتا۔ نوکر دیکھ دیکھ کر جلتے تھے کہ گویا نوالہ میں ہمارا حصہ ہی نہیں۔ سو خدمتگار رکے اور نوکر نہیں بھاگتے تھے'' ۱۰

اس پیراگراف میں چودھری صاحب نے مولانا کرامت حسین کے کھانے کی تفصیل بتائی ہے کہ وہ کس قسم کا کھانا کھاتے تھے اور نوکران کے اس کھانے سے کتنے بیزار رہتے تھے کیونکہ یہ کھانا نوکروں کی پسند کا تو نہیں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے ابلی ہوئی سبزی یا ابلی ہوئی مچھلی' کچے انڈے وغیرہ عام آدمی کے لئے تو بیکار ہی ہوتے ہیں۔ اس پیراگراف میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ پوربی زبان کے ہیں اور اودھ کے لوگ خاص طور سے یہ زبان استعمال کرتے ہیں مثلاً کاہیکو یا ترکاری وغیرہ۔

چودھری صاحب مولانا کے شعری ذوق اور غضب کے حافظے کی تعریف کرتے ہوئے ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:۔

''مولنا: میں کیا کروں۔ اگر کوئی کام مجھ کو کرنا ہوتا ہے تو اگر میں اس کو ملتوی بھی کر دیتا ہوں تب بھی دماغ مصروف رہتا ہے۔ جس سے لامحالہ کسل و ماندگی ہوتی ہے۔ اگر کہیں جنگل اور سبزہ ہوتا جہاں کوئی دوسرا نہ ہوتا۔ اور میں چلا چلا کر حافظ کے اشعار پڑھتا تو پھر دماغ میں تازگی آجاتی اور کسل دور ہو جاتا۔

مولانا کے ایک پیارے دوست اور سچے ہمدرد جو تشریف رکھتے تھے فرمانے لگے۔ میرے پچھواڑے فلاں سڑک پر رات کو بالکل سناٹا رہتا ہے۔ آپ جسقدر جی چاہے چلا کر پڑھ لیا کیجئے۔ مولنا نے گردن جھکا کر سکوت اختیار کیا'' ۱۱

---

۱۰ ''یادگار مولانا کرامت حسین'' صفحات ۱۴ تا ۱۵

۱۱ ''یادگار مولانا کرامت حسین'' صفحات ۳۳ تا ۳۴

اس قسم کے چھوٹے چھوٹے واقعات بیان کر کے چودھری صاحب نے واضح کیا ہے کہ مولانا پیکرِ ایثار' نہایت خلیق' بردبار' قناعت پسند اور سنجیدہ انسان تھے۔ اس پیراگراف میں بھی کچھ الفاظ پوربی کے استعمال کئے گئے ہیں جیسے ''پچھواڑے'' چودھری محمد علی کی تحریر کی خاصیت اسی قسم کے الفاظ ہیں جو اودھ کے قصبات کی یاد دلاتے ہیں۔ مولانا کی قناعت پسندی اور ایثار کی وضاحت چودھری صاحب نے کچھ یوں کی ہے:

''مولوی صاحب کا مکان ایک بے کرایہ کی سرا تھا جس کا دل چاہے آئے۔ پھوس والے بنگلے میں پانچ کمرے' دو غسلخانے' برآمدے اور کوٹھریاں تھیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ مولانا کے حصہ میں اندر باہر ملا کر صرف ایک کمرہ اور غسلخانہ رہ گیا ہے۔ جس شخص کی عمر ایثار میں کٹی ہو جس کی ایک مثال اپنی کل مایہ بضاعت کو وقف کر دینا ہو' اس کے لئے متذکرہ بالا مثال کوئی بڑی مثال نہیں ہے'' [۱۲] چودھری صاحب کی تحریر میں روانی ہے۔ چونکہ مطالعہ کافی وسیع تھا اور انگریزی زبان میں تصنیف شدہ مغربی مفکرین کی کتابیں خاصی تعداد میں پڑھ رکھی تھیں۔ لہذا اس کتاب میں بھی کہیں کہیں فارسی زبان کے اشعار انگریزی زبان کے نامانوس الفاظ اور عام اردو زبان میں استعمال نہ ہونے والے دقیق الفاظ اور تراکیب بھی مل جاتی ہیں۔ دیگر تصانیف کی طرح اس کتاب میں بھی مغربی مفکرین کا جابجا تذکرہ ہے ان سب باتوں کے باوجود زبان کی شگفتگی برقرار رہتی ہے اور مولانا کو قطعاً نہ جاننے والا قاری بھی مضمون میں دلچسپی لیتا چلا جاتا ہے۔ ان کی تحریر کی پہچان اودھ کے قصبہ ردولی میں بولے جانے والے وہ الفاظ ہیں جنہیں جگہ جگہ پر وہ استعمال کرتے ہیں' مثال کے طور پر مذکورہ بالا جملوں میں: کوٹھری' سرا' پھوس وغیرہ۔

''گناہ کا خوف'' چودھری محمد علی ردولوی کا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان افسانوں اور کہانیوں میں قصباتی ماحول اور اس کی نرم روزندگی کی عکاسی نظر آتی ہے۔ پیشتر افسانوں کے موضوعات اور کردار اسی معاشرے اور ماحول سے منتخب کئے گئے ہیں۔ مثلاً ''امیری کی بو'' کی حمیدہ بانو' ''گناہ کا خوف'' کے عبدالمغنی' ''تیسری جنس'' کی ''مدی'' اور ''امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات'' میں امامن مہری کا کردار۔ ان افسانوں اور خاکوں میں جو بھی کردار پیش کئے گئے ہیں وہ اپنی جگہ بہت ہی مکمل اور بھرپور ہیں۔ اس کتاب میں بیان کئے گئے قصے اضطراب انگیز مطالعے اور خیال افروز مشاہدے پر مبنی ہیں۔ اندازِ بیان ایسا ہے کہ پڑھنے والا ان سے ایک روحانی اتصال محسوس کرتا ہے۔ افسانوں کی زبان نہایت صاف اور سادہ ہے جو

---

۱۲ ''یادگار مولانا کرامت حسین'' صفحہ ۲۳

کردار جس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے اس کی زبان بھی اسی کے مطابق ہوتی ہے۔ روزمرہ اور محاروں کا استعمال بڑی چابکدستی سے کیا گیا ہے۔ مثلاً ''امیری کی بو'' میں نائن تاخیر سے آنے کے سلسلے میں اپنی زبان میں کس طرح تاویل پیش کرتی ہے:

''نائن: میری مجال پڑی ہے کہ آپ بلاویں اور میں نہ آؤں۔ آپ کے گھر سے یہ ہڈیاں پلی ہیں۔ بڑے میاں کی دی ہوئی بارہ بیگھے معافی آج تک کھا رہے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں۔ آپ کے دشمن غریب ہوں۔ آج بھی آپ ہی کے یہاں سے پیٹ پلتا ہے۔ تن ڈھکتا ہے۔ دیر اس وجہ سے ہوگئی کہ دوپٹہ چھیتھڑا ہوگیا تھا۔ ایسا بھی نہیں رہ گیا تھا کہ سر پر ڈال کر باہر نکلتی۔۔۔۔'' [۱۳]

اس پیراگراف میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ چاپلوسی سے بھری ہوئی خوشامدانہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ غرض سے بھی وابستہ ہے۔ اسی طرح ایک اور افسانہ ''میٹھے بول'' کے عنوان سے ہے' اس میں ایک تانگے والے کے مکالمات کچھ یوں ہیں: ''جی نہیں حضور! ابا وبا کچھ نہیں ہیں۔ انہیں میٹھے بولوں سے آج تک کسی سالے نے چالان نہیں بولا۔'' [۱۴]

کسی صاحب کے بیچ میں آجانے کی وجہ سے تانگے والے نے انہیں ابا کہہ کر ہٹ جانے کی درخواست کی تھی جو کہ کم وبیش ہم عمر ہی رہے ہونگے اور وجہ پوچھنے پر اس نے مذکورہ بالا جواب دے دیا۔ اس میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ روزمرہ کی عام بول چال کی زبان ہے اور نچلے طبقے کے لوگ اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

''امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات'' میں امامن مہری جو زبان بولتی ہے وہ ملاحظہ ہو:

''رہیں جھونپڑے میں خواب دیکھیں محلوں کا۔ بھیک مانگنے چلے اور مشعلچی ساتھ' نکلیں کوڑی پھیرا کرنے اور ساتھ لیں کوڑی پھیرا کرنے اور ساتھ لیں صندوق پٹارے۔ چوری نہ لگتی ہو تو لگ جائے۔ کریں گی نکلے کی مہری گیری اور دکھائیں گی ٹھاٹھ۔ پھر تو اللہ ہی نے کہا ہے ہر سٹے ننگا جھوری (تلاشی) دینی پڑے گی۔ روز صندوق پٹارے اتھنے پتھنے جائیں گے''۔ [۱۵]

اس عبارت میں جو محاورے اور جملے تحریر کئے گئے ہیں اور جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ اودھ کے نچلے طبقے کی ملازمائیں (مہریاں) کرتی تھیں۔ امامن مہری اپنے تجربات کی بناء پر یہ مشورہ دے رہی ہیں کہ جہاں ملازمت کرنی ہو اس گھر میں صندوق اور پٹارے رکھنا مناسب نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر گھر کے کسی فرد کی کوئی چیز کھو جائے تو صندوق پٹارے کی

---

۱۳ ''امیری کی بو''، مشمولہ ''کشکول''، صفحات ۴۲۱ تا ۴۲۲

۱۴ ''میٹھے بول''، مشمولہ ''کشکول''، صفحہ ۴۷۰

۱۵ ''امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات'' (۱) مشمولہ ''کشکول''، صفحہ ۴۹۹

تلاشی لی جاتی ہے۔ چودھری صاحب نے امامن مہری کی زبان سے بہت ہی کام کی باتیں کہلوائی ہیں لیکن زبان ایسی زبردست استعمال کی ہے کہ قطعاً شک بھی نہیں ہوتا کہ ایک انتہائی وسیع المطالعہ شخص نے اسے اپنے دماغ سے سوچ کر تحریر کیا ہوگا۔ گفتگو میں جابجا شگفتگی نظر آتی ہے۔ اس کتاب کی طرزِ تحریر کے بارے میں چوتھے اور پانچویں ابواب میں مفصل تشریح پیش کی جا چکی ہے۔

''پردے کی بات'' ایک بہت ہی مختصر مگر انتہائی جامع اور نہایت پر مغز کتابچہ ہے جو اس غرض سے تحریر کیا گیا ہے کہ عوام الناس' خاص طور پر خواتین اس سے استفادہ کر سکیں اور بچوں کی کثرتِ پیدائش کا شکار نہ ہوں۔ اس میں عام فہم اور انتہائی سہل زبان استعمال کی گئی ہے' معمولی تعلیم رکھنے والے بھی اسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ تحریر میں جگہ جگہ ناصحانہ انداز اختیار کیا گیا ہے اور بے انتہا وضاحت اور تکرار کے ساتھ استقرارِ حمل کا امکان' فطری ضبطِ تولید کے طریقے اور کثرتِ اولاد کے نقصانات جیسے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ چونکہ یہ کتابچہ عورتوں کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہے اس لئے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ زبان بہت ہی آسان اور سادہ ہو۔ لب ولہجہ عورتوں کا جیسا اختیار کیا گیا ہے۔ مثلاً ال بل موئے' بیسی کھیسی وغیرہ اور الفاظ اس طرح کے استعمال کئے گئے ہیں جیسے عورتیں عموی طور پر اپنی زبان میں بیان کرتی ہیں۔ مثلاً لسن' تلے اوپر کے وغیرہ۔ کتاب کا مطمع نظر عوام الناس کے حفظانِ صحت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' چودھری صاحب کی کہانیوں' خاکوں' افسانوں' انشائیوں اور متفرق مضامین پر مشتمل کتاب ہے۔ اس میں انسانی نفسیات کے بہت سے پوشیدہ پہلوؤں پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ جنسی عوامل کی عمل داری بھی ملتی ہے مگر اس طرح کہ عریانیت اور چھچھورا پن پیدا نہ ہو اور جنسی حسِ باطن کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اگر کہانیوں اور افسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان کے عناصرِ ترکیبی میں نفسیاتی اور جنسیاتی عوامل کی بہتات نظر آئے گی۔ کہانیوں میں اکثر و بیشتر ایسے موڑ آتے ہیں کہ یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ چودھری صاحب اپنی تحریر کے ذریعہ نفسیات کے کچھ پہلوؤں پر روشنی ڈالنا اور ظاہر کے پردے میں پوشیدہ حقائق کو بے نقاب کرنا ہی اپنا نصب العین سمجھتے ہیں' مثلاً:

''حسنو کی بی بی زیادہ تر تو لڑائی کرتی تھیں۔۔۔۔ علاوہ اس کے اور بھی چھوٹے چھوٹے مشاغل تھے۔ مثلاً لگائی بجھائی کرنا' عورتوں کو آپس میں لڑوانا' مردوں کو گھر میں چھپا رکھنا اور پھر لڑکیوں کو پھسلا کر گھر میں بلا لینا۔ اس کے بعد باہر سے کنڈی چڑھا کر گھڑی دو گھڑی کے لئے کھسک جانا۔ مگر اس کام میں وہ پہلے سوار پیدل پہنچان لیتی تھیں تب کرتی تھیں۔ پہلے

اپنی لڑکی سے دوستی پیدا کرواتی تھیں۔اس کے بعد یہ چالیں چلتی تھیں۔اس وجہ سے آج تک نہ کسی لونڈیا نے شور مچایا تھا نہ ان کا چونڈا مونڈا گیا'' ۱۶

چودھری محمد علی بناضِ فطرتھے اور خصوصیت کے ساتھ عورتوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔ مذکورہ بالا اقتباس میں نچلے طبقے کے غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والی اور بھیک مانگ کر زندگی گزارنے والی عورت کے مشاغل کا بہت ہی خوبصورت انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔اس میں جو زبان اور اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے وہ اودھ کے قصبات اور خاص طور سے قصبہ رودولی کے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین کی غمازی کرتا ہے' مثال کے طور پر یہ الفاظ جیسے لونڈیا' چونڈا' مونڈا وغیرہ۔

چودھری صاحب اسی مضمون میں آگے چل کر حسنو کی بی بی کی ایک اور عادت کو یوں بیان کرتے ہیں:

''بیکاری میں کبھی کبھی ڈھیلے پھینک کر جی بہلاتی تھیں۔ایک مرتبہ گاؤں میں رات کو ہر گھر میں دس پانچ ڈھیلے گرنے لگے۔ بڑی بڑی اینٹیں آتی تھیں۔ چونکہ گاؤں میں نٹ بیر بابا کا ٹوٹا مٹھ ہی پکی اینٹوں کا تھا۔اس لئے لوگوں کو خیال ہوا کہ وہی کچھ خفا ہو گئے ہیں اور یہ حرکتیں کرتے ہیں۔۔۔۔گاؤں والوں نے نٹ بیر بابا کو خوش کرنے کے لئے کچھ مان دان بھی کی مگر ڈھیلے بند نہ ہوئے۔ایک دن یہ اتفاق گزرا کہ کسی شخص نے ڈھیلے گرتے وقت ایک نئی بات دریافت کی۔یعنی ڈھیلے کی ''بھد'' کے پہلے کچھ کھن سے بھی ہوتا ہے جیسے چوڑیاں بولتی ہیں۔ سننے والے نے میاں حسنو کی بی بی کی ٹوہ لگائی' آخر پکڑی گئیں۔گاؤں والوں نے اچھی خاصی مرمت کی۔میاں حسنو اس وقت جیل خانے میں تھے۔۔۔۔چونکہ اس کا مرد گھر میں نہیں تھا۔اس لئے جنسی تقاضے کی وجہ سے ''بیٹھے سے بیگار بھلی'' کے مسئلے کے تحت میں ڈھیلے ہی پھینکا کرتی تھی'' ۱۷ اس طرح چودھری صاحب نے اس دلچسپ واقعے کو بیان کر کے اس کی جنسی ونفسیاتی وجہ بھی تلاش کر لی۔

اس کتاب کے افسانوں اور کہانیوں میں جگہ جگہ مزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ چودھری صاحب جنسی حقائق کو واقعات کے قالب میں ڈھال کر افسانوں کو مزید دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ جو کردار بھی پیش کرتے ہیں وہ اپنی جگہ پر بہت ہی مکمل اور جامع ہوتے ہیں۔افسانوں اور کہانیوں میں قدم قدم پر روزمرہ اور محاوروں کا استعمال انتہائی چابکدستی سے کرتے ہیں۔جس طبقے کی نمائندگی کرنے والے کردار کو پیش کرتے ہیں اسی مناسبت سے اس کی زبان استعمال کرتے ہیں تاکہ حقیقت کا گمان ہو۔اسی طرح ''بابو درگاہی'' کے خاکے میں اسی علاقائی زبان کو استعمال کیا ہے جو واقعتاً وہ بولتے رہے ہونگے:۔

---

۱۶ ''نیلم کا نگ'' مشمولہ کشکول محمد علی شاہ فقیر' صفحہ ۸۰

۱۷ ''نیلم کا نگ'' مشمولہ کشکول محمد علی شاہ فقیر' صفحات ۸۱ تا ۸۲

''سب سے پہلے ان کی نظر مزعفر پر پڑی اور ذرا سا چکھ کر طشتری دستر خوان پر سے اٹھا کر اپنے پہلو میں رکھ لی۔ میز بان نے اس کی وجہ پوچھی۔

بابو صاحب: ناہیں اب نہ کھیبا۔ ای کا جگنو کے کھاتر لئے جیبا (نہیں اب نہ کھائیں گے۔ اس کو جگنو کے واسطے لے جائیں گے)

میز بان: یہ جگنو کون ہیں۔

بابو صاحب: جگنو ہمری مہروا آئیں (جگنو ہماری بی بی ہیں)

میز بان: یہ خطاب ان کو آپ کے یہاں دیا گیا ہے یا پہلے ہی سے ان کا یہ نام تھا۔

بابو صاحب: ناہیں جب آئی رہے تو اس لو نکے جس دیا کی ٹیون۔ تو ہم کہا جگنو آئے (نہیں جب بیاہ کے آئی تھی تو ایسی چمکتی تھی جیسے شمع کی لو۔ تو ہم نے کہا تھا یہ جگنو ہے)''۱۸

یہ مکالمات ایک ایسے تعلقہ دار کے بارے میں لکھے گئے ہیں جو دیکھنے میں خالص دیہاتی، گنوار اور جاہل نظر آتا ہے۔ لیکن بہت دور کی کوڑی لانے والا اور عقلِ سلیم کا لطف اٹھانے والا شخص ہے۔ اس کی مناسبت سے اودھ کی ایسی دیہاتی زبان استعمال کی گئی ہے جو چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بولی جاتی ہے۔

نچلے طبقے میں ہونے والی باتوں کو بھی چودھری صاحب انتہائی مہذب انداز میں بیان کر جاتے ہیں۔ اور ان کی تحریر کا حسن برقرار رہتا ہے۔ ''مرزا منش'' نامی مضمون میں بھی جو زبان انہوں نے استعمال کی ہے وہ کچھ یوں ہے:

''اب تو لونڈوں کو مشغلہ ہاتھ آیا۔ جدھر سے مرزا نکلتے ہیں'' واہ مرزا'' کی آوازیں آرہی ہیں۔ گھوڑا کھڑا ہوا ہے۔ اور مرزا صاحب یکہ سے نیچے اترے، کوڑا ہاتھ میں لئے لونڈوں کی نانیوں، دادیوں اور ان کے خاندان کی دوسری عورتوں کے جنسی رجحان کی بکھان مختلف انداز مختلف پیرایوں سے بالا علان کررہے ہیں۔ جس میں شاعرانہ پہلو پر نظر رکھتے ہوئے اپنا تخلص بیچ بیچ ڈالتے چلے جاتے ہیں''۱۹

یہ مرزا منش کے عنوان سے مرزا سجاد کے خاکہ کا آخری پیراگراف ہے جو گردشِ زمانہ کی چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ آخر میں ایک تانگہ چلانے لگتے ہیں اور ٹٹو پر اپنی ساری محبت اس طرح نچھاور کر دیتے ہیں کہ اگر کوئی ٹٹو کی تعریف

---

۱۸ ''یادِ احباب'' مشمولہ کشکول محمد علی شاہ فقیر، صفحہ ۱۲۴

۱۹ ''مرزا منش'' مشمولہ کشکول، صفحہ ۱۹۸

کر دے تو انہیں ڈر غالب ہوتا ہے کہ مبادا کہیں نظر نہ لگ جائے۔ اور ان کی اسی کمزوری کو جان کر محلے کے آوارہ لڑکے چھیڑ خانی کرنے لگتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں مرزا صاحب جو حرکت کرتے ہیں اسے یہاں پر کس دلچسپ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ زبان دانی اور انداز بیان کی شوخی تو چودھری صاحب ہی کا وصف تھا۔

ایک اور جگہ پر زبان کا کتنا خوبصورت مظاہرہ کر رہے ہیں مثلاً:

''مولوی ابراہیم کی بی بی آئیں۔ ٹھیٹھ دیہاتن کئی دن تو شرم کے مارے دولہا سے بولیں نہیں۔ اس کے بعد بولیں بھی تو معلوم ہوا کہ نہ بولتیں تو اچھا تھا۔ مولوی صاحب کا دل چاہتا تھا کہ کچھ شوخی ہوتی' کچھ شرارت' کچھ اچپلاہٹ' کچھ ناز' کچھ غمزہ' کچھ کرشمہ' کچھ چٹکی' وہاں ہر بات کا ایک ہی جواب تھا۔ ''کا کچھ ہم پتر یا ہوں'' کبھی کبھی اسی مضمون کو دوسری طرح باندھتی تھیں۔ ''ای سب پتر یا جانیں ہم کا جانیں''۔ قصہ مختصر سائنس میں اگر وحدت حرکت میں بدل جاتی ہے تو یہاں ہر چیز جمود کا جامہ پہن لیتی تھی''۔ ۲۰

یہ دلچسپ گفتگو اس وقت دکھائی گئی جب شہر سے تعلیم حاصل کرنے والے' نہایت نفیس مزاج کے حامل مولوی ابراہیم کی شادی ان کے والد نے نسل نہ بگڑ جانے کے خیال سے خالص دیہات میں رہنے والی اپنی ہمشیرہ کی جاہل اور گنوار بیٹی سے کر دی تھی۔ یہاں جو چیز قابلِ غور ہے وہ یہ کہ چودھری صاحب نے ایک جاہل گنوار عورت کے تاثرات پیش کرنے میں جو زبان استعمال کی ہے وہ لاجواب ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ گاؤں کی عورتیں اسی انداز سے باتیں کرتی ہیں۔

اسی طرح ''گدھی کی بتیا'' میں دیہات میں بسنے والے ایک تیلی کی گفتگو کا نقشہ چودھری محمد علی نے اودھی زبان میں بہت ہی خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے:

''پنڈت: ارے لچھمن' ای گدھی کا کا ماملہ بھوا۔

لچھمن: مہراج گدھی کا کون ماملہ۔

پنڈت: ارے وہی جون تمرا لڑکا گدھی مار ڈالس۔

لچھمن: ہمرا لڑکا کاہے کا مار ڈالس۔ اوتو بہت دنن سے بیمار رہی مرگئی۔

پنڈت: سب لوگ کہت ہیں کہ تمرا لڑکا مار ڈالس۔

---

۲۰ ''خوش مذاقی کے اندھے'' مشمولہ کشکول' صفحہ ۲۸۵

لچھمن: ارے رام رام لڑکا کا ہے کا مار ڈالس۔ مری سسری اپنی موت سے اوکا مار کے کوئی کا کرتا۔

پنڈت: گدھی تمری پنواڑی ماں پڑی کہو ہاں۔ تمھار لڑکا گدھی کا ڈھکیل وہس کہو ہاں اور پھر کس ہوت ہے جیو لیب۔

لچھمن: ارے مہراج اوکا تو بہت دن بہے اور گدھی تو مری ہے اب ہیں۔

پنڈت: تیسرے دن مری ہے۔

لچھمن: اب تیسرا دن رہا ہو یا چوتھ دن۔ مل اوتو ھواں سے اپنے پاؤں چلی گئی رہے۔ پھر سنا کہ مر گئی اور اوتو پہلن سے ہی بیمار رہے۔

پنڈت: تو ہتیا لاگ گئی''۔ [۲۱]

یہ مکالماتی گفتگو اس وقت پیش آئی ہے جب گدھی کے مر جانے کی خبر سن کر ایک پنڈت مذہب کے نام پر بے وقوف بنانے اور پیسہ بٹورنے لچھمن کے گھر پہنچے اور اسے ہتیا دان دینے پر مجبور کر رہے ہیں۔ دیہاتی زبان کا استعمال چودھری صاحب نے اور جگہوں پر بھی کیا ہے مگر طبقاتی فرق کو موقعہ کی مناسبت سے دکھاتے ہیں مثلاً یہاں پر متعلقہ شخص جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا ویسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ مکالمات کے دوران پڑھنے والا بالکل ایسا محسوس کرتا ہے کہ جیسے سب کچھ اس کے گرد و پیش ہی ہو رہا ہو۔ جو بھی موضوع زیر بحث ہو چودھری صاحب کی گرفت اپنے موضوع پر بڑی سخت ہوتی ہے۔ وہ ادائے مطلب کے لئے کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن ہر لفظ معنویت سے بھرپور ہوتا ہے۔ وہ موقع محل کے لحاظ سے انتہائی موضوع الفاظ تلاش کر کے لاتے ہیں جس سے نہ صرف مفہوم واضح ہوتا ہے بلکہ قاری اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرتا ہے اور یہی ان کی تحریر کی خوبی ہے۔

''میرا مذہب'' چودھری محمد علی کی ایسی تصنیف ہے جس میں انہوں نے مذہب اسلام کے بارے میں اپنے مصلحانہ عقائد کی شرح اور ترجمانی کی ہے۔ یہ کتاب کسی کو مذہبی تعلیم دینے کی غرض سے یا دینیات کے نکتہ نگاہ سے نہیں تحریر کی گئی۔ مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں یعنی شیعہ و سنی کے درمیان مذہب کو بنیاد بنا کر جو زبردست خلیج پیدا ہو گئی ہے اس تفرقہ اور خلیج کے اسباب تلاش کئے گئے ہیں۔ سیاسی مصالح کے بناء پر مذہب اسلام میں کچھ ایسی ترمیم و تنسیخ، تراش، خراش اور زیادتیاں کی گئیں جن کے باعث آپس میں تنفر، تلخیاں اور افتراق پیدا ہوئے۔ ان پر بے لاگ تنقید کی گئی ہے۔ مستند دلائل،

---

[۲۱] ''گدھی کی ہتیا''، مشمولہ کشکول، صفحات ۳۲۳ تا ۳۲۴

حوالہ جات اور تاریخی حقائق وشواہد سے اپنی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چونکہ اس کتاب میں چودھری صاحب نے اپنے ذاتی خیالات بیان کئے ہیں۔ لہذا جا بجا اپنے مذہبی نظریات کا اعتراف اور برملا اظہار کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہوں نے یہ کتاب اس نظریہ سے تحریر کی ہے کہ اپنے مذہبی خیالات کی ترویج اور تبلیغ کرسکیں۔ بلکہ انہوں نے کوشش کی ہے کہ دونوں بڑے فرقوں کے لوگ منصفانہ نظر سے اسلامی تعلیمات پر غور وفکر کریں۔ اور اختلافی مسائل کو سلجھائیں تاکہ باہمی اختلافات کی خلیج کم ہو۔ لہذا اس کتاب میں انہوں نے اپنا مخصوص طریقہ اپنایا ہے۔ یعنی تحریر میں بات کرنے کا سا انداز اختیار کیا ہے۔ واقعات بیان کرتے کرتے بڑی گہری باتیں کہہ دی ہیں مثلاً:

''آٹھویں محرم کو حاضری بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ مجھ سے بھی تبرا کہنے کو کہا جاتا تھا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ میں نے ایک بار انکار کیا۔ میرے یہاں عورتوں نے کہا کہ یہ اثر سنی مولوی کا ہے۔ وہ نکال دیئے جائیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے اس میں میری سزا کی بھی غرض تھی۔ کیونکہ میں مولوی صاحب سے زیادہ مانوس تھا۔ اور لوگ جانتے تھے کہ اس طرح لڑکا دب جائے گا۔ میری سرتابی کی خبر مولوی صاحب تک بھی پہنچی تھی۔ مولوی صاحب کا رویہ میرے دل پر نقش کالنجر ہے۔ مولوی صاحب مجھے گود میں لے لیتے تھے اور پیار کرتے تھے۔ اور کہتے تھے جاؤ بیٹا جو کچھ تمہاری ماں کہتی ہیں کہہ دو۔ پیار کرنے میں ان کی بچ سے منڈی ہوئی مونچھیں میرے گال پر گڑ جاتی تھیں۔ یہ مجھ کو آج تک خوب یاد ہے'' ۲۲

اس کتاب میں انہوں نے تبرا کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ عمل انہیں بچپن سے ہی پسند نہیں تھا۔ چودھری صاحب نے انتہائی دلچسپ پیرایہ میں سنی مولویوں کے داڑھی کے ساتھ درمیان سے مونچھیں صاف کرنے کے عمل کو واضح کیا ہے۔ کتاب کے پہلے باب سے لے کر چوتھے باب تک گفتگو کا ہی انداز پایا جاتا ہے۔ زبان صاف وسادہ اور عام فہم ہے۔ ایک اور جگہ پر شیعوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

''شیعوں سے زیادہ کوئی فرقہ مسلمانوں میں اپنے مذہب سے آگاہ نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں مجالس عزا کا سلسلہ تعلیم کا ایسا ذریعہ ہے جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدقسمتی ہے کہ ذاکرین کمزور روایتیں' ضعیف روایتیں پڑھتے رہتے ہیں۔ میرے بچپن میں تو یہ حال تھا کہ لوگ گڑھی روایتیں تک پڑھ جاتے تھے۔ خیر اب تو ایسا کم

---

۲۲ ''میرا مذہب'' صفحات ۱۰ تا ۱۱

سنائی دیتا ہے۔ مگر پھر بھی بعض ذاکرین کا رجحان اس طرف دکھائی دیتا ہے۔ اس زمانے میں اگر غلط روایتیں پڑھی جاتی تھیں تو اب منطق کا ہیر پھیر، صغریٰ اور کبریٰ کا جھمیلا عقل کو چکرا دیتا ہے'' ۲۳

یہاں مذہب میں روایتیوں کے ذریعہ تراش خراش اور نئی نئی باتیں شامل کرنے اور نئے نئے مطلب نکالنے کے عمل کو بیان کیا گیا ہے چونکہ یہاں پر چودھری صاحب عام لوگوں سے مخاطب ہیں اس لئے زبان سادہ اور سلیس استعمال کی ہے مگر پوربی کے اثرات جگہ جگہ نمایاں ہیں۔

اسی کتاب میں اور جگہ پر وہ شیعوں کی نماز کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

''شیعوں کو جماعت کی نمازیں کم نصیب ہوتی ہیں۔ ہر جگہ پر امام نہیں ہوتے۔ اور نصیب بھی ہوگئیں تو کمیاب ہونے کی وجہ سے ان کا اہتمام کچھ ایسا ہو جاتا ہے جیسے عید کی سوئیاں، دہ روز والی مسادات جس کو آدمی اپنا حق سمجھتا ہے وہ بات نہیں رہ جاتی۔ پیش نمازی کا مسئلہ شیعوں کے یہاں اتنی احتیاط کے ساتھ کہاں سے آ گیا۔ مجھ کو نہیں معلوم'' ۲۴

اس پیراگراف میں بہت ہی سادہ الفاظ میں اس نکتہ کی وضاحت کی جارہی ہے کہ اہلِ تشیع حضرات امام کی کمیابی کی وجہ سے اکثر جماعت کی نماز سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے یہاں امامت کرنے والے کے لئے بڑی سخت شرائط ہیں۔ اس کتاب میں جہاں جہاں مضمون کے اعتبار سے ضرورت پیش آئی وہاں پر اصطلاحی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ورنہ زیادہ تر عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا اقتباس کے سلسلے میں آگے چل کر چودھری صاحب مزید رقمطراز ہیں:

''تقلید عالم کی کرنی چاہئے۔ اگر کوئی شخص کسی عالم کا مقلد نہیں ہے تو اس کی عبادت ہی بیکار ہے۔ (واضح ہو کہ یہ گنہگار بہت دن ہوئے تقلید چھوڑ چکا ہے) اس میں دقت یہ آن پڑتی ہے کہ خدا کی راہ ڈھونڈھنے سے بھی مشکل عالم کی تلاش ہوگئی۔ ہم تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جس نے امام ابو یوسف کی وردی (واضح ہو کہ سیاہ عمامہ اور عبا علماء کے لئے حضرت امام ابو یوسف ہی نے تجویز کیا تھا۔ ملاحظہ ہو ابن خلکان وغیرہ) پہن لی وہ پیش نماز ہوگیا۔ ترقی کی تو مجتہد ہوگیا اور اگر ان کے یہاں عاقبتی جوڑے زیادہ آنے لگے تو اعلم کہلایا۔ کیونکہ علاوہ علمی استعداد کے مرجع خلائق ہونا بھی تقدس کی ایک نشانی ہے'' ۲۵

یہاں پر گزشتہ موضوع کی ہی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ لیکن ضرورت کے تحت چند اصطلاحات بھی استعمال کی گئی

---

۲۳ ''میرا مذہب'' صفحات ۵۷ تا ۵۸

۲۴ ''میرا مذہب'' صفحہ ۵۲

۲۵ ''میرا مذہب'' صفحہ ۵۳

ہیں ۔ ان کے علاوہ زبان آسان اور عام فہم ہے ۔ چودھری صاحب کہیں کہیں پر شگفتہ انداز میں بہت خوبصورتی سے طنز کر جاتے ہیں' وہ بڑے اطمینان سے علماء کے سیاہ عمامہ اور عباء کو امام ابو یوسف کی وردی قرار دے دیتے ہیں ۔ مگر مضمون میں سنجیدگی اپنی جگہ برقرار رہتی ہے ۔ اسی کتاب میں ایک جگہ پر معجزات کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اپنے عقائد کے بارے میں یوں بتاتے ہیں:

''میں معجزوں کا کلیتہً منکر نہیں ہوں ۔ مثلاً دل سے قائل ہوں کہ قرآن شریف خود معجزہ ہے ۔ یا جو پیشین گوئیاں بر بنائے عقل و دور اندیشی عاقل ترین بشر (صلعم) نے فرمائیں ۔ اگر آپ کا دل چاہے ان کو بھی معجزہ کہہ لیجئے ۔ مگر جب قرآن شریف کی مختلف آیتوں میں وہ کہا جائے جو گزشتہ آیتوں میں یہ ناچیز نقل کر چکا ہے ۔ تو پھر تو میری سمجھ میں وہ معجزات نہیں آ سکتے جو صرف احادیث میں مذکور ہیں ۔ اور جن کا پتہ قرآن شریف میں نہیں ۔ نہ معلوم کتنے معجزات پانی کے متعلق' کھانے کے متعلق احادیث میں مذکور ہیں جن کا قرآن میں کہیں حوالہ نہیں'' ۲۶

اس پیراگراف میں چودھری محمد علی اپنی مخصوص سادہ اور سلیس زبان میں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جن معجزات کا قرآنِ پاک میں ذکر نہیں ملتا مگر وہ احادیث کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں' ان معجزات پر انہیں یقین نہیں ۔ ہاں وہ قرآن اور حضورؐ کی تعلیمات پر مکمل یقین رکھتے ہیں ۔

''گویا دبستاں کھل گیا'' چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مختلف دوست و احباب اور اعزاء قربا کو تحریر کئے ۔ ان میں زیادہ تر خطوط تو ایسے ہیں جو انہوں نے ہما بیگم کو لکھے ۔ اور ہما بیگم نے ان خطوط کو جمع کر کے اس کتاب کی شکل میں شائع کیا ۔ چودھری صاحب کے ان خطوط میں بڑی بے تکلفی اور برجستگی' خلوص و احساس یگانگت اور طنز و مزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے ۔ یہ خطوط شوخی' بذلہ سنجی اور ظرافت سے لبریز ہیں ۔ مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین ظہیر کے نام اپنے ۱۸/اگست ۱۹۵۱ء کے تحریر کردہ خط میں چودھری صاحب کچھ یوں لکھتے ہیں:

''سلام شوق ۔ بہت دن ہوئے یونیورسٹی کے پتے سے ایک خط بھیجا تھا ۔ چونکہ پتا مکمل نہ تھا' معلوم نہیں پہنچا تھا یا نہیں ۔ اب پھر لکھتا ہوں ۔ ''گناہ کا خوف'' اکثر احباب مانگتے ہیں ۔ میرے پاس صرف ایک جلد باقی ہے ۔ معلوم نہیں وہ کتابیں جو آپ کے ساتھ گئیں تھیں ردی کی ٹوکری میں پہنچ گئیں' کیڑے کھا گئے یا ابھی کچھ باقی ہیں ۔ اگر کچھ ہوں تو بھیج دیجئے' مشکور ہوں گا'' ۔ ۲۷

---

۲۶ ''میرا مذہب'' صفحہ ۱۱۹

۲۷ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۲۳

یہاں پر ''مشکور'' کا لفظ قواعد کے اعتبار سے درست نہیں مگر چونکہ یہ غلط العام لفظ ''شکر گزار'' کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے اس لئے شاید چودھری صاحب نے بھی دھیان نہیں دیا۔ قطع نظر اس کے کہ چودھری صاحب نے اپنے خطوط میں عام فہم زبان استعمال کی ہے مگر مزاح کا عنصر نمایاں ہے۔

مرزا محمد وصی ایڈووکیٹ کو یکم مئی ۱۹۵۲ء کے تحریر کردہ خط کا آغاز کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

''عزیزی وصی میاں دعا! آپ جس وقت چاہے تشریف لائیے ہم لوگوں کو دلی خوشی ہوگی۔ البتہ ان گرمیوں میں آپ لوگوں کو تکلیف ضرور ہوگی۔ زمینداری جانے کی وجہ سے نہال اقبال میں دیمک ضرور لگ چکی ہے اور گھڑی گھڑی ترقی کرتی جاتی ہے۔ مگر غریبی اور بے سروسامانی کی وجہ سے محبتیں کم نہیں ہو جاتیں۔ مثلاً یہ کہ ۱۹۵۲ء بعد از حضرت عیسیٰ پہلا سال ہے کہ میرے یہاں پنکھا قلی نہیں ہے۔ ہزار کوشش کی کہ مل جائے' مگر حاجی بغلول مرحوم کی گھوڑی کی طرح اگر جانور پسند آیا تو دام پسند نہ آئے' اور اگر دام پسند آئے تو گھوڑا ناپسند ہوا۔ بغیر پنکھا قلی کے بھی زندگی کے دن پورے ہو رہے ہیں'' ۲۸

اس خط میں چودھری صاحب نے زمینداری چلی جانے کا ذکر بہت ہی خوبصورت الفاظ کے ذریعہ مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی یہی خوبی غالب کی یاد دلاتی ہے۔ یہاں پر پنکھا قلی سے مراد ایسا ملازم ہے جو مکان کی چھت میں آویزاں کپڑے کے بنے ہوئے بڑے سے پنکھے کی ڈوری کو کھینچ سکے۔ یہ پنکھا بہت ہی خوبصورت جھالردار ریشمی کپڑے میں لپٹا ہوتا تھا اور کمرے کی سجاوٹ میں بھی کام آتا تھا' اب اس کی جگہ برقی پنکھوں نے لے لی ہے مگر وہ مشرقی حسن ان میں کہاں!

چودھری محمد علی کی خطوط نویسی کی ایک اور خصوصیت جو غالب کے خطوط سے مشابہہ ہے وہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دینا ہے۔ مثلاً وہ اپنے ایک کم سن دوست' شاہ آفاق احمد کو جو کہ انہیں اولاد کی طرح عزیز تھے ایک انتہائی مختصر خط میں مخاطب کرتے ہیں۔

''آفاق بیٹا! آج کیا پروگرام ہے؟ اگر گاؤں جاتے ہو تو ''بسلامت روی و باز آئی''۔ اگر گھر پر کوئی مشغلہ ہو تو ''چشم ما روشن دل ما شاد'' اگر بیکار بیٹھے ہو تو۔ کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانہ ءتست''۔ ۲۹

بس کل خط اتنا ہی ہے مگر اندازِ تخاطب غور طلب ہے۔ بالکل ایسا لگتا ہے جیسے دو بدو گفت و شنید کر رہے ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں فارسی تعلیم کا عام رواج تھا لہٰذا اس مختصر سے خط میں فارسی کے وہ جملے بھی نظر آ رہے ہیں جو عام طور پر مستعمل تھے۔ ویسے چودھری محمد علی ردولوی زیادہ تر خط سادہ اور عام فہم زبان میں ہی لکھا کرتے تھے مگر کبھی کبھی ذائقہ بدلنے کے لئے

---

۲۸ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۱۱۳

۲۹ ''گویا دبستاں کھل گیا'' صفحہ ۱۳۳

دوسری زبان کا سہارا بھی لے لیتے تھے۔ باب سوم میں ''گویا دبستاں کھل گیا'' کا بہت تفصیلی جائزہ لیا جاچکا ہے اس لئے یہاں پر زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔

۴۔ ادبی تخلیقات کی خصوصیات:۔

چودھری محمد علی ردولوی چونکہ تعلقہ دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا شروع سے ہی انہوں نے آرام و آسائش کی زندگی گزاری اور دور دراز علاقوں حد یہ کہ پہاڑوں تک کا سفر کیا۔ قریب و جوار کے علاوہ دور افتادہ علاقوں کی زندگی کا مشاہدہ کیا۔ چونکہ اپنے والدین کے یہ اکلوتے بیٹے تھے اس لئے بہت لاڈ و پیار سے پلے تھے۔ والد کے انتقال کے باعث تعلقہ کے ذمہ داریاں اور جلد شادی ہو جانے کی وجہ سے گھریلو ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ شاید اسی کے سبب وہ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر چونکہ علم دوست شخص تھے لہذا مسلسل اکتساب علم اور مطالعہ میں مصروف رہے۔ خصوصاً یورپ کے تمام سرکردہ مصنفین اور محققین کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ فارسی اور عربی کا مطالعہ تو ابتداء سے ہی کر رکھا تھا اس لئے ان کی علمی بصیرت بڑھتی ہی چلی گئی۔ چودھری محمد علی اپنی زندگی کے آغاز سے ہی بہت بزم آراء اور انتہائی خوش گفتار انسان تھے لہذا انہوں نے اس دور کے بیشتر مشاہیر اور اصحاب علم سے دوستانہ اور گہرے مراسم قائم کئے۔ چونکہ باذوق انسان تھے اس لئے ارباب علم و کمال کی صحبتوں سے فیض اور رہنمائی حاصل کی۔ ان کی طبیعت کی بزم آرائی نے انہیں مختلف طبقات کی زندگی اور محفلوں کی نشست و برخاست نے مختلف فطرت کے حامل لوگوں کی نفسیات سمجھنے کا بھرپور موقع عطا کیا۔

چودھری محمد علی نے اپنی ابتدائی زندگی میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوگا مگر نہ اس کا کہیں تذکرہ ملتا ہے اور نہ ہی کوئی ریکارڈ۔ ان کی دستیاب شدہ ادبی تصانیف کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے تقریباً چالیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اپنے سفینہ ادب میں قدم رکھا اور پھر اس کی ناخدائی کرتے چلے گئے۔ یہ وہ عمر تھی جب چودھری صاحب نہ صرف ذہن کی بلکہ علم و شعور کی پختگی حاصل کر چکے تھے اور مذکورہ وجوہات کی بناء پر علم و مشاہدات اور افکار و خیالات سے لبریز تھے۔ انہیں زبان و بیان پر اتنا عبور حاصل ہو چکا تھا کہ وہ کسی بھی کیفیت اور صورتِ حال کو برملا بیان کر سکتے تھے۔ انہیں کسی بھی کردار کو تخلیق کرنے اور اس کے گرد و پیش رونما ہونے والی کسی بھی صورت حال کی عکاسی کرنے کا ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔ طبیعت کی خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ قلم میں پختگی بھی پیدا ہو چکی تھی اور شاید انہیں وجوہات کی بناء پر ان کے قلمی دوست صلاح الدین احمد نے انہیں اتنے خوبصورت الفاظ میں خراج عقیدت پیش کی ''اردو کا اولین فطرت نگار''۔[۳۰]

۳۰۔ ''کشکول'' صفحہ ۹

چودھری محمد علی رودولوی کے ادب پاروں کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے بیشتر انہیں کرداروں اور ان کے ایسے گردوپیش کو اپنا موضوع بنایا ہے جن سے وہ بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا وہ حقیقت کے بالکل قریب نظر آتے ہیں۔ جو شخص بھی رودولی اور قرب و جوار کے ماحول سے واقف ہے اسے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کوئی سچی کہانی یا واقعہ پڑھ رہا ہے۔ ان کے اکثر افسانوں، کہانیوں، انشائیوں اور خاکوں میں اودھ کا قصباتی ماحول جھلکتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بدلتا رہتا ہے اور فضا میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ مگر چودھری صاحب کی تحریروں کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ انہوں نے الفاظ کا جامہ پہنا کر اس زمانے کے ماحول اور فضا کو مقید کر دیا۔ موجودہ نسل جو اس سے واقف نہ بھی ہو تو ان تحریروں کو پڑھ کر آگاہی حاصل کر سکتی ہے۔ ان کی تحریر کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں روانی و تسلسل ہے۔ قرۃ العین حیدر نے انہیں ویسے ہی تو اس نام سے موسوم نہیں کیا یعنی ''داستان طراز''۔ ۱؎

چودھری محمد علی کی تحریر کی روانی کا خاصہ ہے جو کسی سبک رفتار ندی کی مانند ذہن میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اور قاری پڑھنے میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ خود فراموشی کا شکار ہو کر کہانی کے اختتام پر پہنچ جاتا ہے تب ہی اپنے موجودہ ماحول میں واپس لوٹتا ہے۔ ان کے ادب پاروں میں نہ تو تصنع ہے نہ آورد، نہ اصلاح اور نہ ہی تبلیغ۔ بلکہ انہوں نے عام طور پر زندگی کو جس طرح رواں دواں دیکھا اور محسوس کیا، اسی طرح اسے اپنے تصور کی باریک بینی اور اپنے اظہار کی توانائی کی مدد سے اسے افسانہ، کہانی، انشائیہ یا خاکہ کا روپ دے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں اور کہانیوں میں زندگی کے تجربات، مشاہدات، بالغ النظری اور اظہارِ حقیقت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

چونکہ فطری طور پر چودھری محمد علی ایک زندہ دل اور خوش طبع انسان تھے، اس لئے ان کی تمام تحریروں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی تحریر کی تیسری خصوصیت طنز و مزاح کی چاشنی ہے۔ خواہ وہ کوئی افسانہ لکھ رہے ہوں یا کہانی یا انشائیہ و خاکہ تحریر کر رہے ہوں، حد یہ کہ ان کے سارے خطوط اس چاشنی سے لبریز ہیں۔ یہ وہ خوبی ہے جو ان کی تخلیقات کو پڑھنے کے لئے ایک ایسے اجنبی قاری کو مجبور کرتی ہے جو ان سے واقف نہیں ہے، بلکہ اتفاقیہ ان کی کوئی تحریر اس کے سامنے آجاتی ہے۔ چودھری محمد علی کی تحریروں کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ انسانی ذہن اگر تھکا ہوا ہو یا کسی قسم کے دباؤ میں ہو تو اسے پڑھ کر ایک گونہ سکون حاصل ہوتا ہے۔

۱؎ ''سوغات'' نمبر ۹، صفحہ ۳۱۴

چودھری محمد علی کی ادبی تخلیقات کی چوتھی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ انہوں نے تصویر کشی کے لئے زندگی کے ان پہلوؤں کا انتخاب کیا' جن میں کوئی نفسیاتی خصوصیت پائی جاتی ہو۔ انہوں نے اپنے افسانوں' کہانیوں' انشائیوں' خاکوں میں زیادہ تر نفسیاتِ انسانی کی کسی نہ کسی حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے علم النفس کے بیش قیمت دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف انسانی نفسیات کا گہرا علم رکھتے تھے بلکہ انہیں ہر نوع کی نفسیات کی جزئیات تک کا شعور و ادراک تھا' جس کا اندازہ ان کی ہر تحریر کو پڑھنے کے بعد بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی تصانیف کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات اور ان کی پیچیدگیوں' زندگی اور اس کی نیرنگیوں کی عکاسی کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا' جس کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔

جنسیات کا تعلق بھی انسانی نفسیات سے ہے۔ انسانی شخصیت میں اس کے اثرات مختلف طور پر نظر آتے ہیں۔ چودھری محمد علی کی تحریروں کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں جنسی پیچیدگیوں سے نہ صرف پردہ اٹھایا گیا ہے' بلکہ ان کی تہہ در تہہ حقیقتوں کو حیرت انگیز طور پر بیان کیا گیا ہے مگر کہیں بھی فحش نگاری یا کج بیانی کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ ان کے افسانوں' خاکوں' کہانیوں میں جا بجا جنسی عوامل کی کافی عملداری ملتی ہے' مگر کہیں بھی ابتذال' رکاکت اور سفلا پن پیدا نہیں ہونے پاتا۔ چودھری صاحب کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علم النفس خصوصاً اس کے جنسی پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ مردوں اور عورتوں کی جنسی نفسیات کے عمیق مطالعات اور تجربات کے ذریعہ اپنے افسانوں کا تانا بانا بن لیتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چودھری صاحب جنسیات کی سربستہ نازک ترین حقیقتوں کا ادراک رکھتے اور انہیں انتہائی فن کاری کے ساتھ جائز ادب میں آراستہ کر کے پیش کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔

چودھری محمد علی ردولوی کے تحریر کردہ خطوط کے علاوہ ان کے افسانے بھی بے تکلفانہ گفتگو معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر کی چھٹی خصوصیت ان کا نہایت پرکشش اور لطیف اسلوب بیان ہے۔ ان کا لطیف و بلیغ اندازِ بیان سلاست اور رنگینی سے متصف ہوتا ہے۔ انہوں نے زبان و الفاظ کی نسبت ایک انفرادی بلکہ خودسرانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ ایسے قصہ گو ہیں جو اپنے ناظر سے اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ گویا اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے بڑی شانِ بے تکلفی سے اس سے گفتگو کر رہے ہوں۔ وہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت کو عین وہی الفاظ دینے پر اصرار کرتے ہیں' جن میں وہ ان پر وارد ہوئی۔ ان کے افسانوں میں بڑا دوستانہ ماحول پایا جاتا ہے۔

چودھری صاحب کے افسانوں اور خاکوں کی زبان نہایت صاف سادہ اور دلکش ہے۔ روز مرہ اور محاورات کا استعمال بڑے سلیقے سے برمحل کیا گیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ادبی زبان میں مقامی زبان کی پیوندکاری ہے۔ ان کے تخلیق کردہ کردار جس طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں ان کی زبان بھی اسی کے مطابق ہوتی ہے۔

''ادبی زبان سے انہوں نے حسنِ تعمیر کا اور مقامی زبان سے اظہار صداقت کا ثبوت دیا ہے'' ۳۲ چودھری محمد علی نے اپنے دور کے معاشرے کی مختلف طبقات کی خواتین کی زبان کا استعمال انتہائی چابکدستی سے کیا ہے۔ اس سے ان کی حقیقت بیانی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی زبان اپنے عہد کی شائستہ زبان ہے' جو سلاست کے اعتبار سے افسانوی زبان کے معیار پر پوری اترتی ہے۔

چودھری صاحب حقیقتوں کے چہروں پر پڑے ہوئے ظاہری پردوں کو فنکاری کے ساتھ ہٹا کر بڑی خوبصورتی سے اسے بے حجاب کر دیتے ہیں۔ ان کا تخلیق کردہ کردار اس قدر حقیقی معلوم ہوتا ہیں کہ پڑھنے والا اسے اپنے ساتھ چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ انہوں نے جب بھی کوئی خاکہ تحریر کیا اس کی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالی کہ گویا اس کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ کر رکھ دی' ایسی تصویر جو کسی بھی اعتبار سے نامکمل نہیں لگی۔ ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک سلیقہ منداور باشعور مصنف تھے۔

چودھری محمد علی کی بعض تحریروں میں کچھ منفی پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ افسانوں' کہانیوں اور خاکوں کے علاوہ انہوں نے جو مختلف موضوعات پر کتابیں تحریر کی ہیں ان میں کبھی کبھی شروع کی عبارت کچھ زیادہ رواں اور پرکشش محسوس نہیں ہوتی مگر بعد میں آہستہ آہستہ روانی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کتاب ''صلاح کار'' کا دیباچہ کچھ گنجلک سا محسوس ہوتا ہے۔ بیان میں کچھ ربط نظر نہیں آتا جسے پڑھ کر قاری اکتاہٹ سی محسوس کرتا ہے۔ لیکن کتاب کو آگے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیان کی پیچیدگی کم ہوتی چلی جارہی ہے۔ اسی طرح کتاب ''میرا مذہب'' کے پہلے باب میں جہاں چودھری صاحب نے اپنے حج کا تذکرہ کیا ہے وہاں درمیان میں انہوں نے اپنے مذہبی خیالات اور ان باتوں کا تذکرہ کیا ہے جو ان کے لئے خلش کا باعث ہیں۔ یہاں مختلف بیانات کی بناء پر ان کے خیالات میں کچھ بے ربطی سی محسوس ہوتی ہے۔ مگر آگے چل کر وہ اپنے مخصوص اندازِ تحریر کے ساتھ اصل موضوع کی طرف واپس آجاتے ہیں۔

---

۳۲ ''اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش'' صفحہ

چودھری صاحب کی بعض تحریروں میں کہیں کہیں کچھ نامانوس الفاظ اور نامناسب تراکیب بھی پائی جاتی ہیں جن سے عبارت کے حسن میں کجی پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان کی کتاب ''یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم'' میں ''برج مرج'' ''تا بہ دروازہ'' ''نظام الوان'' ''صعب'' اور ''باہمہ دبے ہمہ'' وغیرہ۔ اسی طرح ان کی دوسری تصنیف ''پردے کی بات'' میں بھی کچھ نامانوس الفاظ پائے جاتے ہیں جیسے ''بیسی کھیسی'' وغیرہ ان الفاظ کا استعمال تو شاید پوربی سے انسیت کی بناء پر ہو مگر انگریزی کے بھی کچھ نامانوس الفاظ ملتے ہیں، جبکہ اردو میں اسی مفہوم کے عام فہم الفاظ موجود ہیں۔

۵۔ ادبی خدمات کی قدر و قیمت کا تعین:۔

چودھری محمد علی ردولوی کی ادبی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ وہ اردو زبان و ادب میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے تجربات و مشاہدات کا ایک ذرخیز اور حیرت انگیز ذخیرہ اپنے قلم کے ذریعہ ادب میں منتقل کیا۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار اور صاحبِ طرز فطرت نگار اور اعلیٰ درجے کے مکتوب نگار تھے۔ ان کی تخلیقات دنیائے علم و ادب میں ہمیشہ درخشاں ستارے کی طرح چمکتی رہینگی۔ وہ ایک اچھے انشاء پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات اور جنسیات کے علم سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اردو ادب کو جو خزینہ عطا کیا وہ نفسیاتِ انسانی اور جنسیات کے رموز و اسرار سے لبریز ہے۔

''اتالیق بی بی'' چودھری محمد علی کی ایک بڑی ہی دلچسپ تصنیف ہے۔ اس میں شوہروں پر بیویوں کی بے جا شکایتوں اور بے معنی نکتہ چینیوں کا زبردست نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جبکہ یہ انگریزی میں تحریر شدہ کتاب ''کرٹین لیکچرز'' سے ماخوذ ہے۔ مگر چودھری صاحب نے اس کا ماحول تبدیل کر کے اسے اودھ کی گھریلو خواتین کی زبان میں ڈھال کر اس میں وہ خوبیاں پیدا کیں، جس کے باعث یہ کتاب ایک ادبی شاہکار بن گئی۔ اس کتاب میں تحریر کردہ چھوٹے چھوٹے خاکوں میں ہماری گزشتہ تہذیب و معاشرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ چونکہ اس زمانے میں ہندوستان پر انگریزوں کی عملداری تھی لہذا اس کتاب میں دو مختلف تہذیبوں کے تصادم کی نہ صرف واضح تصویریں نظر آتی ہیں، بلکہ دونوں تہذیبوں کے اختلاف کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ مختصر سی کتاب طنز و مزاح کی چاشنی سے لبریز ہے۔ اس میں جگہ جگہ پر ایسے جملے اور عبارتیں لکھی ہوئی ہیں کہ پڑھنے والا محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب اس قبیل اور مزاج کی عورت کا خاکہ ہے جو تقریباً ہر گھر میں پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کا ایک ایک جملہ اس طرح ناپ تول کر لکھا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ مصنف عورتوں کی نفسیات پر کتنی گہری نگاہ رکھتا تھا اور انہیں خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنے کا فن بھی بخوبی جانتا تھا۔

''یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم'' میں چودھری محمد علی نے اپنے ایک کرم فرما کی آخری عمر کے چند واقعات کو کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ مولانا کی شخصیت' علمی مرتبہ اور دینی خدمات کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ چودھری صاحب نے ان کی صحبت میں رہ کر نہ صرف اکتساب علم کیا' بلکہ بڑے علمی مشاہدات کئے اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ مولانا کی شخصیت' علمیت' کردار و اخلاق اور ان کے تعلیم نسواں کے سلسلے میں کی جانے والی خدمات سے بہت متاثر تھے۔ اور اسی وجہ سے چودھری صاحب نے یہ کتاب لکھ کر انہیں زندہ جاوید کر دیا۔ ادبی نقطہ نگاہ سے یہ ایک بلند پایہ شخصی خاکہ ہے جس میں تمام وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک قابلِ قدر خاکے میں ہونا چاہئیں۔ اس کتابچے میں چودھری صاحب نے اس بات کی بھرپور کوشش کی ہے کہ مولانا کی صحیح اور سچی تصویر کی عکاسی ہو اور عقیدت کی بناء پر صحتِ مضمون پر اثر نہ پڑے۔ اپنے چلبلے مزاج کے مطابق وہ عبارت میں جگہ جگہ مزاحیہ انداز بھی اختیار کرتے ہیں' جو ان کی تحریر کی جان ہے۔

''پردے کی بات'' ۔ اس کتاب کو چودھری صاحب نے حفظانِ صحت کے نظریہ کے تحت تصنیف کیا تھا۔ اصل مقصد درپیش یہ تھا کہ بچوں کی کثرتِ پیدائش کو روکا جا سکے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بدقسمتی سے اتنے سال گذر جانے کے باوجود آج بھی اسی طرح جوں کا توں ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ چودھری محمد علی نے اس کی اہمیت کا اندازہ اس زمانے میں لگایا اور عام گھرانوں کی عورتوں کو انہیں کی زبان میں اس کتابچے کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے کہ سب سے زیادہ عورتیں ہی متاثر ہوتی ہیں۔ بچوں کی یکے بعد دیگرے جلدی جلدی پیدائش سے ان کی صحت بری طرح متاثر ہوتی ہے اور ان کی تندرستی پر ناقابلِ تلافی نقصانات رونما ہوتے ہیں۔ جسمانی کمزوری کے ساتھ ساتھ دماغی کمزوری بھی پیدا ہوتی ہے جو چڑچڑے پن' جھنجھلاہٹ اور بدمزاجی پیدا کرتی ہے' جس سے پورا خاندان متاثر ہوتا ہے۔ کثرت اولاد سے مرد بھی متاثر ہوتے ہیں اس لئے کہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑھنے والے اخراجات معاشی مسائل کا باعث بنتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ بچوں کی مناسب نگہداشت نہ ہو پانے کی وجہ سے ان کی پرورش پر اثر پڑتا ہے۔ ان کی صحیح تعلیم و تربیت نہیں ہو پاتی۔ چودھری صاحب نے ان تمام باتوں کو نہایت آسان اور عام فہم زبان میں سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے معاشرے کا لحاظ کرتے ہوئے فطری ضبطِ تولید کے موثر طریقے بھی بیان کئے ہیں۔ ایک چارٹ بنا کر بڑی وضاحت سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مہینے کے کون سے ایام ایسے ہونگے جن میں استقرارِ حمل کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ضبطِ تولید اور حفظانِ صحت کے نقطہ نگاہ سے یہ ایک نہایت بیش قیمت کتابچہ ہے۔

''صلاح کار'' - یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے ذریعہ نوجوانوں کو جنسی معاملات کی پیچیدگیوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ جنسی بے راہ روی کے خطرناک انجام سے متنبہ کیا گیا ہے۔ چودھری محمد علی نے یہ کتاب لوگوں کو ذہنی عیاشی مہیا کرنے کی غرض سے نہیں لکھی ہے بلکہ انہیں جنسی خواہشات کی تکمیل کے صحیح' صالح اور صحت مند طریقے سمجھانے کی غرض سے تحریر کی ہے تاکہ وہ جنسی حظ اور لطف ولذت حاصل کرسکیں۔ بہتر اور خوشگوار ازدواجی زندگی گذار سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آنے والی نسلوں کی صحت وتندرستی کا باعث بنیں۔ ہمارے معاشرے میں جنسی مسائل کچھ ایسی نوعیت رکھتے ہیں کہ انسان حجاب کے باعث نہ والدین سے مشورہ کرسکتا ہے' اور نہ ہی شرم وحیا کی وجہ سے دوستوں اور ہم جولیوں سے ان پر گفتگو کرسکتا ہے۔ بلکہ شرمندگی کی وجہ سے ڈاکٹر اور طبیب کے سامنے بھی ان کو بیان کرنے سے کتراتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اندر ہی اندر گھلتا رہتا ہے اور اس کا ذہنی سکون برباد ہو جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اثر اس کے مزاج اور اس کی نفسیات پر پڑتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جنسی مسائل ناواقفیت کی بناء پر حل نہ ہونے کی وجہ سے بڑی بڑی ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے ماحول میں انسان کتاب پڑھ کر ہی ان گتھیوں کو سلجھا سکتا ہے۔ اس زمانے میں جب جنسیات کے موضوع پر اردو میں کچھ زیادہ نہیں لکھا گیا تھا چودھری محمد علی کی یہ تصنیف ایک بیش قیمت اثاثہ ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے وضاحت وآگہی کی خاطر مرد کے اعضاء تناسل کے ساتھ ساتھ عورت کے مقام تولید اور تناسل کو بھی بیان کیا ہے تاکہ مجامعت کا صحیح عمل سمجھا جاسکے۔ اور یہ بھی واضح ہو کہ استقرار حمل اور عمل تولید کس طرح رونما ہوتا ہے۔ اس بیان پر عبدالقیوم رسا نے اپنی تنقید میں یوں پیش کیا ہے:

''الغرض پوری کتاب اسی قسم کی گندی اور بیہودہ عبارتوں سے بھری ہے۔ اس کتاب میں صرف ایک کمی رہ گئی ہے جس کا احساس غالباً مصنف کو بھی ہوگا اور وہ یہ ہے کہ اس میں اِن مقامات اور حالات کی رنگین اور تشریحی تصویریں نہیں۔ آسنوں کا ذکر بھی کتاب کی قیمت کو بڑھانے میں بہت زیادہ کارآمد ہوتا'' ۳۳

مذکورہ بالا تنقید کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جولائی ۱۹۳۲ء میں مرد وعورت کے اعضائے تناسل وتولید کو بیان کرنا کس قدر ''گندی اور بیہودہ عبارت'' تصور کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں چودھری محمد علی ردولوی کا یہ ہمت کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اگر اس کتاب میں ان اعضاء کی بقول عبدالقیوم رسا کے ''رنگین اور تشریحی تصویریں'' بھی ہوتیں تو کیا بری بات ہوتی۔

---

۳۳ تلخیص وتنقید ماہنامہ ''ایوان'' گورکھپور جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۶۱

کیا یہ تصاویر طبی اور سائنسی کتابوں میں نہیں بنی ہوتی ہیں؟ ''آسنوں کا ذکر'' اگر نہیں ہے تو یہ صحیح ہے اس لئے کہ یہ ''کام شاستر'' کے موضوع کی کتاب نہیں ہے۔ کیا کہیں کسی نے ''کوکھ شاستر'' ''گربھ شاستر'' اور ''کام شاستر'' جیسی کتابوں کی افادیت سے انکار اور اعتراض کیا ہے؟ رہی بات قیمت بڑھانے کی تو یہ انتہائی نامناسب بات لکھی گئی ہے۔ اس لئے کہ یہ کتاب فروخت کرنے کی غرض سے یا روپیہ کمانے کے مقصد سے لکھی ہی نہیں گئی تھی۔

جس وقت چودھری محمد علی نے یہ کتاب تصنیف کی اس وقت مغربی تہذیب کے اثرات سے برصغیر کی حالت بدل رہی تھی۔ ترقی پسندی کے نام پر اچھائی اور برائی کے پیمانے تبدیل ہو رہے تھے۔ ان بدلتے ہوئے حالات کا احساس کرتے ہوئے چودھری صاحب نے یہ کتاب اس غرض سے تحریر کی کہ مغربی اثرات کے تحت جنسی آزادی کا جو سیل رواں سلطنت انگلستان کے متبوضہ ہندوستان میں آ رہا ہے اس کے نقصانات کا سدباب ہو سکے۔ مگر اس کو عبدالقیوم رسا نے بالکل دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھا۔ وہ اپنی مذکورہ بالا تنقید میں یوں رقمطراز ہیں:

''انسانی عقل و حکمت کی انتہا خود انسان کے لئے تباہی کا باعث ہوگی۔ اس کا ثبوت رفتہ رفتہ مغرب دے رہا ہے۔ مغرب کی تقلید نے ہر بری اور اچھی چیز کو ایک علم بنا دیا۔ انسانی غیرت اور شرم و حیا اس کی مقتضی تھی کہ یہ پوشیدہ علم' باوجود اپنی پیچیدگی اور اہمیت کے یوں ہی تاریکی میں رہتا تو کہیں بہتر تھا۔ جس طرح یہ مسلم ہے کہ قانون کا وضع کرنا سوسائٹی کو جرم کی ترغیب دینا ہے اسی طرح یہ بھی مسلم ہے کہ معائب کی تشریح و توضیح اور ان سے بچنے کی تلقین کرنا یا ان کے عواقب و عقوبت سے ڈرانا بالواسطہ معائب کی اشاعت ہے۔ اس علم کی سائنٹیفک تحقیقات نے انسان کی صحت میں گھن لگا دیا ہے۔ مغربی تہذیب کے نفوذ سے قبل یہ علم مشرق میں صرف بادشاہوں اور امراء کے مخصوص درباریوں تک محدود تھا اور عوام کے نزدیک اس سے زیادہ شرمناک کوئی بات نہیں تھی'' ۳۴

مذکورہ بالا تنقید کا سبب مغربی تہذیب کے خلاف جذبہ تنافرت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ دنیا کو معلوم ہے کہ آج علوم و فنون کے ہر میدان میں مغرب کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔ اہلِ مغرب نے چاند پر واقعتاً کمند ڈال دی ہے بلکہ چہل قدمی بھی کر آئے ہیں۔ جنسیات آج ایک اہم علم تصور کیا جاتا ہے جس کے بارے میں ہر بالغ مرد و عورت کو آگہی حاصل کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا اس کو ''تاریکی'' میں رکھنا سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس علم کی سائنسی تحقیقات نے ''انسانی صحت میں گھن''

---

۳۴ تلخیص و تنقید ماہ نامہ ''ایوان'' گورکھپور جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۶۰

نہیں لگایا بلکہ اس کے خوب وزشت پر سے پردہ اٹھایا اور حقائق کو واضح کیا۔ خورد ونوش کے بعد جنس ایک جوان انسان کی جسمانی اور ذہنی ضرورت قرار پاتا ہے' تو پھر اس کی وضاحت ''عوام کے نزدیک شرمناک بات'' کس طرح ہوسکتی ہے۔

اس کتاب میں چودھری صاحب نے سوزاک اور آتشک جیسی جنسی بیماریوں اور ہیسٹریا جیسے اعصابی امراض کے اسباب ان کی علامتیں' مختلف مدارج میں مرض کی نوعیت' جسم اور ذہن پر رونما ہونے والے بھیانک اثرات اور امراض کی ہولناکیاں نہایت سادہ اور آسان الفاظ میں بیان کی ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کیا ہے کہ ان امراض کا اثر کسی دوسرے فرد اور معاشرے پر کتنا خراب پڑتا ہے اور آئندہ آنے والی نسلیں کس طرح متاثر ہوسکتی ہیں۔ مزید براں ان سے بچنے کے لئے طریقے اور احتیاط بھی تحریر کی ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ عبدالقیوم رسا کو یہ بات بھی پسند نہیں آئی اور وہ انتہائی حقارت کے ساتھ تحریر کرتے ہیں:

''بدکاری سے سوزاک یا آتشک والوں کو مرض سے نجات حاصل کرنے کی یہ ترکیب بتائی ہے۔۔۔۔۔ زبان اور اسٹائل کے اعتبار سے کتاب بہت پست ہے'' ۳۵

مذکورہ بالا تنقید نگار کی رائے سے قطع نظر یہ اپنے دور کی ضرورت پوری کرنے والی ایک انتہائی مفید کتاب ہے اور بحیثیت مجموعی اردو کے جنسی ادب کے دورِ اول کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ آج جب اردو زبان میں اسلام الدین کے ماہنامہ ''جنسیات'' اور احسن مارہروی کے تیس روزہ ''چاند'' کے بے شمار شماروں کے علاوہ بے انتہا جنسی کتابیں موجود ہیں' شاید اس کتاب کی اب زیادہ ضرورت نہ ہو' مگر یہ کتاب تو اپنا کام کرگئی۔ اس کے بارے میں خود چودھری صاحب کتاب کے آخری باب ''خاتمہ'' میں تحریر کرگئے ہیں:

''کل جب ہندوستان یورپ کا جامہ پہن لیگا اور یہ کتاب اپنا کام کرچکے گی' آپ ہی طاقِ نسیاں پر پہنچ جائے گی'' ۳۶

''میرا مذہب'' میں چودھری صاحب نے اسلام کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ یہ کوئی اسلامی یا دینیات کی کتاب نہیں ہے بلکہ ان کے ذاتی مصلحانہ عقائد کی تشریح وترجمانی کرتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ان باتوں کی تحقیق پیش کرتی ہے جو چودھری محمد علی کے لئے باعثِ خلش تھیں۔ ایک طویل عرصے سے مسلمان شیعہ اور سنی دو فرقوں میں منقسم ہیں۔ وقت کے

---

۳۵ تلخیص وتنقید' ماہنامہ ''ایوان'' گورکھپور' جولائی ۱۹۳۲ء صفحات ۶۱ تا ۶۲

۳۶ ''صلاح کار'' صفحہ ۱۲۰

ساتھ ساتھ دونوں فرقوں کے مذہبی ٹھیکیدار سیاسی اغراض اور مقاصد کے تحت رفتہ رفتہ اضافہ وتخفیف کرتے چلے جاتے اور افتراق اور کشیدگی بڑھاتے ہیں۔ اس طرح یہ خلیج اس قدر وسیع وعمیق ہوگئی کہ اس کا پر کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ اسی بات کو چودھری صاحب نے بہت اچھی طرح محسوس کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جہاں ان کے والد اور دادا سنی تھے اور والدہ و دادی شیعہ تھیں۔ گھر کا ماحول خواتین کے باعث ضرور شیعہ تھا مگر بچپن میں ان کو پڑھانے والے مولوی سنی تھے۔ اور یکے بعد دیگرے عقد میں آنے والی ان کی دونوں بیویاں بھی سنی تھیں۔ چودھری محمد علی نے بچپن سے شیعہ ذاکرین کو سنا اور بڑے ہو کر مولانا کرامت حسین جیسے صاحب فکر اور دانشمند انسان کی صحبت سے استفادہ کیا جو کہ سنی تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی جیسے جید سنی عالم ان کے احباب میں شامل تھے لہٰذا دونوں فرقوں کے بارے میں وہ گہرا علم رکھتے تھے۔

چودھری صاحب نے یہ کتاب یہ واضح کرنے کے لئے تحریر نہیں کی کہ آیا وہ شیعہ یا سنی ہیں' صرف یہ بیان کرنے کی غرض سے نہیں لکھی کہ ان کے مذہبی عقائد کیا ہیں۔ بلکہ ان کا مقصد ان دونوں فرقوں کے درمیان پیدا ہونے والی تاریخی تلخیاں دور کرنا تھا جو آپس کے تنفر اور افتراق کا باعث بنیں۔ انہوں نے اس کتاب میں دونوں فرقوں کی آپس کی زیادتیوں اور خامیوں کو اپنے نقطہ نظر سے بیان کیا اور ہر بات کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔ انہوں نے حقائق اور شواہد پیش کرتے ہوئے ان اختلافات پر بے لاگ تنقید کی ہے۔ ان کے خیال میں سیاسی مصالحت کی بناء پر لوگوں نے مذہب میں ترمیم وتنسیخ اور قطع وبرید سے کام لیا ہے' جس سے پیدا ہونے والی خلیج بڑھتی ہی چلی گئی۔ اور چودھری صاحب نے اپنی اس کتاب میں اسی خلیج کو پر کرنے اور دلوں کی کدورت کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

مذہبی معاملات میں بڑے اختلافات ہیں۔ شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے اندر خود بڑے بڑے شرعی اور رسوماتی اختلافات ہیں۔ فقہی اور مسلکی مسائل درپیش ہیں' علاقائی رسومات مذہب کی آڑ لے کر انسانی زندگی میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہر گروہ اپنے آپ کو صحیح راستے پر گامزن تصور کرتا اور دوسرے سے صرف نفرت کرتا' اسے حقیر گردانتا ہے۔ فرقہ وارانہ مسائل پر لکھی جانے والی ہر کتاب اپنی توقیر اور دوسرے کی تحقیر میں ہی اوراق سیاہ کر دیتی ہے۔ ایسے ماحول میں چودھری صاحب کی یہ کتاب ایک نعمتِ غیر مترقبہ اور انتہائی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے آج بھی اپنی قدر و قیمت نہیں کھوئی۔ اس کے مطالعے سے آج بھی لوگوں کا مذہبی جنون کم ہوگا' جذبہ تنافرت میں کمی آئے گی اور ایک مسلمان اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ضرور سوچے گا اور اپنے خیالات کو پرکھے گا۔ مسلمان نہ تو شیعہ ہوتا ہے اور نہ ہی سنی وہ تو

صرف مسلمان ہوتا ہے اور چودھری محمد علی ردولوی نے اپنی اس کتاب میں یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

''نقادی کے نکتے'' - یہ چودھری محمد علی ردولوی کی ایسی تصنیف ہے جو بدقسمتی سے نایاب ہے۔ اس میں اردو ادب کے فنِ لطیف کو جانچنے کے اصول بیان کئے گئے ہیں آج کل تو تقریباً ہر صنفِ ادب پر بے شمار تنقیدی کتابیں دستیاب ہیں۔ اس زمانے میں جب یہ کتاب تحریر کی گئی یقیناً یہ ایک بیش قیمت کتاب تھی جس میں فنِ لطیف کو پرکھنے کے قوانین وضوابط تحریر میں لائے گئے۔ چودھری صاحب کے زمانے میں قلمی تصاویر کا بڑا رواج تھا۔ آج کل ڈیجیٹل فوٹوگرافی اور کمپیوٹر گرافکس کے دور میں اس فن کا رواج معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن قلمی تصاویر کی افادیت اور اہمیت آج بھی قائم و دائم ہے۔ اس فن کو جانچنے کے اصول بیان کر کے چودھری محمد علی نے ایک بہت ہی کام کی کتاب تحریر کی اور اس فن کو زندہ رکھنے کے لئے ایک بڑی خدمت انجام دی۔

''گویا دبستاں کھل گیا'' - یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں چودھری محمد علی کے وہ خطوط جمع کر کے شائع کئے گئے ہیں جو انہوں نے اپنے اعزاء اقرباء اور دوست واحباب کے نام تحریر کئے تھے۔ ان کے خطوط کا یہ مجموعہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ مکاتیبی ادب میں غالب کے بعد خطوط نگاری کے متعینہ معیار پر اگر کسی کے خطوط پورے اترتے ہیں تو وہ چودھری صاحب کے ہی خطوط ہیں جو دراصل ان کے علم وفضل اور تجربات ومشاہدات کا بیش بہا خزینہ ہیں۔ ان کے مشاہدات کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر خوبصورت شے اور ہر پرکیف منظر کو پورے شعور کے ساتھ پرکھتے اور پھر اپنے خطوط میں ان مناظر اور کیفیات کی ہو بہو تصویر پیش کر دیتے تھے۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اس زمانے میں رونما ہونے والے واقعات اور ان کے گرد وپیش کے لمحات محفوظ ہو گئے اور اس طرح یہ تاریخی اہمیت کے حامل تصور کئے جا سکتے ہیں۔

چودھری صاحب نے اپنے خطوط میں نہ صرف بے تکلفانہ انداز بیان اختیار کیا ہے بلکہ کسی بھی موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے لطیفے، چٹکلے اور چھوٹے چھوٹے قصے بھی بیان کئے ہیں۔ جس سے غیر متعلقہ قاری کو بھی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور پڑھنے کے لئے ایک اچھا مواد میسر آ جاتا ہے۔ عام طور پر کسی ایک کا دوسرے کے نام تحریر کردہ خط تیسرے کے لئے قطعاً بے معنی ثابت ہوتا ہے، لیکن چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط میں پائی جانے والی داستان گوئی کی کیفیت اور طرزِ گفتگو کا انداز تیسرے شخص کو بھی اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ چند خطوط تو ایسے ہیں جو طنز وظرافت کا نادر شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔

''گناہ کا خوف'' - یہ چودھری محمد علی ردولوی کے افسانوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے اپنے گرد و

پیش کے ماحول کا بہترین نقشہ پیش کیا ہے۔ اس میں پائے جانے والے کرداروں کو تلاش کر کے ان کے قلمی خاکے رقم کیے ہیں۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ان میں اس عہد کے لوگوں کی طرز زندگی' انداز تکلم' رسومات اور آپس کے تعلقات کی عکاسی کی گئی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں انسانی نفسیات کے ایسے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے کہ پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے اور چودھری صاحب کی فہم وفراست اور عقل و دانش کو داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ انہیں ہر نوع کی نفسیات کی جملہ جزئیات کا کس قدر شعور تھا۔ انہوں نے نفسیات انسانی کے تمام پیچیدہ پہلوؤں کی کس خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے ان کی فنکارانہ عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ جنسیات کا تعلق بھی نفسیات انسانی سے ہے اور چودھری محمد علی ردولوی اس علم کے عالم محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی تیسری خوبی یہ ہے کہ ان میں جنس کی تہہ در تہہ حقیقتوں اور دلوں میں پوشیدہ جذبات کو انتہائی باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔ اکثر افسانے حضرت انسان کے مختلف النوع جنسی پہلوؤں کے مطالعہ کی بیش بہا دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' - یہ ایک ایسی ادبی تصنیف ہے جس میں بڑا تنوع ہے۔ ادبیات کے اعتبار سے اس میں کہانیاں ہیں' افسانے ہیں' مضامین' انشائیے' خاکے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ افادیت کے اعتبار سے اس میں علم وآگہی ہے' معلومات ہیں' انسانی نفسیات' جنسیات' طنز ومزاح' تاریخ وجغرافیہ ہے۔ اس میں مشرق بھی ہے اور مغرب بھی' حیوانیات بھی ہے اور نباتیات بھی' فنون بھی ہیں اور سائنسی علوم بھی۔ اور سوال یہ ہے کہ فقیر کی اس جھولی میں کیا نہیں ہے؟ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ کسی بھی موضوع میں دلچسپی رکھنے والا اپنے مطلب کا مضمون اس میں تلاش کر سکتا ہے۔ کتاب پڑھ لینے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا چودھری محمد علی ردولوی علم وادب کی نگری سے فقیرانہ گذرے' اس کی تنگ وتاریک گلی کوچوں میں انہیں جو کچھ نظر آیا اور دورویہ کچے و نیم پکے' بوسیدہ اور شکستہ جھونپڑوں کے نیم وا دروازوں پر دستک دینے سے جو کچھ بھی ملا اپنے حافظے کے کشکول میں ڈالتے چلے گئے۔ اور بعدازاں اپنے تصور کی باریک بینی اور اپنے اظہار کی توانائی سے اسے قرطاس ابیض پر انڈیل دیا۔ کشکول کو الٹ دیا اور فقیر کی جھولی خالی کر دی۔

فقیر کا کشکول جب الٹ دیا گیا تو اس میں سے کبھی سبز پان کے پتے' کتھے چونے اور اپنے اجزائے ترکیبی' افادیت اور ضرر رسانی کے ساتھ برآمد ہوئے۔ کبھی ''پیراسائٹ'' پودے نکلتے نظر آئے تو کبھی ''سیز وکزم'' جیسی جنسی بیماریوں پر روشنی پڑی تو کبھی ''نیلم کے نگ'' کے نفسیاتی پہلو اجاگر ہوئے۔ کبھی ''ٹیگور'' کی موسیقی میں ڈوبی ہوئی شاعری کی مدھر دھن سنائی دی تو کبھی ''برٹرنیڈ رسل'' کی تقریر۔ کبھی میر' غالب' جرات اور سودا کے اشعار ایک ایک کر کے نظر کے سامنے

گذرنے لگے تو کبھی ''وزیر کنج کے غیر مطبوعہ گزیٹر کا ورق'' ہوا سے پھڑ پھڑانے لگا۔ الغرض اس کشکول سے کیا کچھ برآمد نہیں ہوا جس کے بارے میں چودھری صاحب خود ہی تحریر کر گئے ہیں:

''سائیں کی جھولی میں بندے کا دیا' اللہ کا دلوایا' کیا کچھ نہیں نکلتا'' ۳۷

چودھری محمد علی ردولوی کی گراں قدر ادبی خدمات کو جس قدر بھی تولا جائے' مروجہ اوزان کم پڑ جائیں گے۔ اردو ادب کے ہراول دستے کے اس جری سپاہی کی کاوشات کو وہ مقام نہ مل سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ لیکن ان کی صلاحیتوں کی سب سے بڑی قدرداں ان کی اپنی بیٹی ہما بیگم نکلیں' جنہوں نے تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ کر ان کی ادبی خدمات سے دنیائے ادب کو متعارف کروایا۔ جس سے ان کی تخلیقات زندہ جاوید ہو گئیں۔ اور بزم ادب کے شرکاء کو معلوم ہوا کہ وہ بلند پایہ فطرت نگار' اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار اور صاحب طرز مکتوب نگار تھے۔ وہ ایک منفرد ادیب تھے' انہوں نے جو کچھ بھی لکھا قاری کے قلب میں اتر کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر گفتگو اور بات چیت کے انداز میں لکھا جس سے قاری ''مخاطب'' بن جاتا ہے۔ اور مضمون میں اپنائیت محسوس کر کے اس میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ گرد و پیش کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ چودھری محمد علی تو اب نہیں ہیں مگر وہ مقناطیسی کشش رکھنے والے ایسے جواہر پارے چھوڑ گئے ہیں جو آسمانِ ادب پر ہمیشہ تاباں رہینگے۔

---

۳۷ ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' صفحہ ۲۸۵

باب نہم

کتابیات

۱۔ کتب:۔

اعجاز الحق قدوسی (؟۱۹۲۱ء) : عبدالقدوس کنگوہی اوران کی تعلیمات۔

اکبرحمیدی (۱۹۹۱ء) : جدید اردو انشائیہ۔اکادمی ادبیات پاکستان۔اسلام آباد۔۲۰۸صفحات۔

انیس قدوائی (۱۹۸۰ء) : اب جن کے دیکھنے کو۔۔۔۔۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔نئی دہلی۔۱۲۰صفحات۔

برج بھوکن لال محب (۱۹۲۵ء) : تاریخ دریا آباد۔نامی پریس۔لکھنؤ۔

پروفیسر شجاع احمد زیبا (۱۹۹۳ء) : اردو میں قلمی خاکے۔اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ' آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔کراچی۔۱۴۰صفحات۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۹۸۶ء) : فسانہء آزاد' جلد چہارم' حصہ دوم۔دہلی۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۱۷ء) : یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم۔نول کشور پریس۔لکھنؤ۔۴۱صفحات۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۲۶ء) : صلاح کار۔جامعہ ملیہ۔دہلی۔۱۲۴صفحات۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۳۹ء) : گناہ کا خوف۔نیا سنسار۔لکھنؤ۔۱۴۹صفحات۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۴۰ء) : خطبی۔انوار بکڈپو۔لکھنؤ۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۴۴ء) : سیرۃ الاقطاب اردو۔نول کشور۔لکھنؤ۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۵۱ء) : کشکول محمد علی شاہ فقیر۔صدیق بک ڈپو۔لکھنؤ۔۳۲۶صفحات۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۵۱ء) : میرا مذہب۔یونائیٹڈ پریس' امین آباد۔لکھنؤ۔۱۷۱صفحات۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۵۶ء) : گویا دبستاں کھل گیا۔بار اول۔اکادمی پنجاب۔لاہور۔۲۸۴صفحات۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۷۷ء) : گویا دبستاں کھل گیا۔اضافہ شدہ ایڈیشن۔اردو اکیڈمی سندھ۔کراچی۔۴۰۰صفحات۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۸۰ء) : کشکول ۔اردو اکیڈمی سندھ ۔کراچی ۔۶۳۹ صفحات ۔

چودھری محمد علی ردولوی (؟؟؟۱ء) : اتالیق بی بی ۔دل گداز پریس ۔لکھنؤ ۔

چودھری محمد علی ردولوی (؟؟؟۱ء) : پردے کی بات ۔نیا سنسار ۔لکھنؤ ۔

چودھری محمد علی ردولوی (؟؟؟۱ء) : نقادی کے نکتے ۔سرفراز قومی پریس ۔لکھنؤ ۔

خلیق ابراہیم خلیق (۱۹۹۹ء) : منزلیں گرد کے مانند ۔۔۔۔فضلی سنز لمیٹڈ ۔کراچی ۔۵۷۷ صفحات ۔

ڈاکٹر انور حسین خاں (۱۹۹۲ء) : چودھری محمد علی ردولوی (حیات اور ادبی خدمات) ۔فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش ۔لکھنؤ ۔۲۳۰ صفحات ۔

ڈاکٹر انور سدید (۱۹۸۳ء) : اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش ۔اردو رائٹرز گلڈ ۔الہ آباد ۔

ڈاکٹر انور سدید (۱۹۸۵ء) : انشائیہ اردو ادب میں ۔مکتبہ فکر و خیال ۔لاہور ۔۳۱۹ صفحات ۔

ڈاکٹر بشیر سیفی (۱۹۸۹ء) : اردو میں انشائیہ نگاری ۔نذیر سنز پبلشرز ۔لاہور ۔۲۹۶ صفحات ۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ (۱۹۹۶ء) : اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر ۔انجمن ترقی اردو پاکستان ۔کراچی ۔۵۴۴ صفحات ۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی (۱۹۶۴ء) : ادب کا تنقیدی مطالعہ ۔لاہور ۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی (۱۹۸۹ء) : ادب کا تنقیدی مطالعہ ۔مکتبہ میری لائبریری ۔لاہور ۔۲۲۲ صفحات ۔

ڈاکٹر سلیم اختر (۱۹۸۶ء) : انشائیہ کی بنیاد ۔سنگِ میل پبلی کیشنز ۔لاہور ۔۳۸۲ صفحات ۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین (۱۹۷۵ء) : لکھنؤ کی تہذیبی میراث ۔لاہور ۔

ڈاکٹر شارب ردولوی (۱۹۸۴ء) : تنقیدی مطالعے ۔نصرت پبلشرز ۔لکھنؤ ۔۲۳۲ صفحات ۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری (۱۹۸۹ء) : اردو نثر کا فنی ارتقاء ۔اردو اکیڈمی سندھ ۔کراچی ۔۶ ۲۵ صفحات ۔

ڈاکٹر محمد عمر (؟؟؟۱ء) : ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر ۔اسکائی لارک پرنٹرز ۔دہلی ۔

ڈاکٹر نصیر احمد خاں (۱۹۹۱ء) : آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ ۔اردو اکادمی ۔دہلی ۔۳۱۹ صفحات ۔

ڈاکٹر وحید قریشی (۱۹۶۴ء) : اردو کا بہترین انشائی ادب ۔مکتبہ میری لائبریری ۔لاہور ۔

ڈاکٹر وحید قریشی (۱۹۸۶ء) : اردو نثر کے میلانات ۔لاہور ۔

ڈاکٹر وزیر آغا (۱۹۶۸ء) : تنقید اور احتساب۔ لاہور۔

ڈاکٹر وزیر آغا (۱۹۹۰ء) : انشائیہ کے خدوخال۔ مکتبہ فکر و خیال۔ لاہور۔ ۱۱۰ صفحات۔

رشید احمد صدیقی (۱۹۶۶ء) : طنزیات و مضحکات۔ لاہور۔

سید سجاد ظہیر (۱۹۵۴ء) : روشنائی۔ مکتبہ اردو۔ ۳۹۸ صفحات۔

سید شاہ صغیر احمد اشرفی (غیر مطبوعہ) : اشرف التواریخ۔ پورہ کامگار۔ بارہ بنکی۔

سید شاہ صغیر احمد اشرفی (غیر مطبوعہ) : تصوف۔ پورہ کامگار۔ بارہ بنکی۔

سید علی محمد زیدی (۱۹۷۷ء) : اپنی یادیں' ردولوی کی باتیں۔ عزمی پبلی کیشنز۔ ردولوی۔ ۹۶ صفحات۔

شاہ مبین احمد فاروقی منظر (۱۹۷۲ء) : شخصیت و سیرت۔ نامی پریس۔ لکھنؤ۔

شمس الرحمٰن (۱۹۴۴ء) : اردو خطوط۔ کتابی دنیا لمیٹڈ۔ دہلی۔ ۲۴۷ صفحات۔

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی (؟؟۱۹ء) : کلیاتِ نثر حالی' جلد اول۔

صہبا لکھنوی (۱۹۶۷ء) : مجاز ایک آہنگ۔ دوسرا ایڈیشن۔ مکتبہ افکار۔ کراچی۔ ۹۵۲ صفحات۔

لطیف ساحل (۱۹۹۴ء) : اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش۔ الحمد پبلی کیشنز۔ لاہور۔ ۱۹۲ صفحات۔

محمد حلیم انصاری (؟؟۱۹ء) : سفرنامہ مظہری۔ کریمی پریس۔ لاہور۔

محمد نجم الغنی رامپوری (۱۹۱۹ء) : تاریخ اودھ' جلد پنجم۔ نولکشور پریس۔ لکھنؤ۔

مولانا تقی شبر ردولوی (غیر مطبوعہ) : حرف و نحو اور رموزِ زبان ردولی۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی (۱۹۷۹ء) : آپ بیتی۔ شاداب بک سینٹر۔ لاہور۔ ۴۰۲ صفحات۔

مشکور حسین یاد (۱۹۸۳ء) : ممکناتِ انشائیہ۔ لاہور۔

نامعلوم (؟؟۱۹ء) : سوتنترا سنگرام کے سینک' حصہ بارہ بنکی نمبر ۲۱۔ پریم پریس۔ پریاگ۔

نظیر صدیقی (۱۹۷۹ء) : شہرت کی خاطر۔ کراچی۔

ہما اخلاق حسین (۱۹۴۸ء) : بھولی ہوئی باتیں۔ سول اینڈ ملٹری پریس' حسن علی آفندی روڈ۔ کراچی۔ ۱۹۰ صفحات

ہما اخلاق حسین (؟؟۱۹ء) : جوئیبار۔ فیروز سنز۔ کراچی۔ ۱۱۵ صفحات۔

۲۔ رسائل واخبارات :۔

ادبی دنیا' لاہور (۱۹۵۰ء) : خاص نمبر۔ دورِ پنجم' شمارہ اول۔ لاہور۔

ایوان' گورکھپور (۱۹۳۲ء) : جولائی۔ گورکھپور۔

تعمیرِ حیات' لکھنؤ (؟؟۱۹ء) : اشاعتِ خاص شاہ معین الدین ندوی' جلد ۱۲۔ لکھنؤ۔

سوغات' بنگلور (۱۹۹۵ء) : ستمبر' شمارہ ۹۔ بنگلور۔

صدقِ جدید' لکھنؤ (۱۹۵۹ء) : ستمبر۔ لکھنؤ۔

فروغِ اردو' لکھنؤ (۱۹۵۵ء) : جنوری۔ جلد ۱' شمارہ ۹۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ۔ ۸۰ صفحات۔

قومی آواز' لکھنؤ (۱۹۸۲ء) : ۶ رجنوری۔ لکھنؤ۔

نقوش' لاہور (۱۹۵۵ء) : شخصیات نمبر۔ ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔

نقوش' لاہور (۱۹۵۵ء) : افسانہ نمبر' دسمبر۔ شمارہ ۵۳' ۵۴۔ ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔

نقوش' لاہور (۱۹۵۷ء) : مکاتیب نمبر' نومبر۔ شمارہ ۶۵' ۶۶۔ ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔

نقوش' لاہور (۱۹۵۹ء) : طنز و مزاح نمبر' جنوری و فروری۔ ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔

نقوش' لاہور (۱۹۶۴ء) : آپ بیتی نمبر' جون۔ ادارہ فروغِ اردو۔ لاہور۔

نقوش' لاہور (۱۹۶۸ء) : خطوط نمبر' اپریل و مئی۔ شمارہ ۱۰۹' حصہ اول۔ ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔ ۴۹۶ صفحات۔

نقوش' لاہور (۱۹۶۸ء) : خطوط نمبر' اپریل و مئی۔ شمارہ ۱۰۹' حصہ دوم۔ ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔ ۶۲۰ صفحات۔

نقوش' لاہور (۱۹۶۸ء) : خطوط نمبر' اپریل و مئی۔ شمارہ ۱۰۹' حصہ سوم۔ ادارہ فروغ اردو۔ لاہور ۴۹۶ صفحات۔

نگار پاکستان' کراچی (۲۰۰۲ء) : خصوصی شمارہ' چودھری محمد علی ردولوی۔ فروری' جلد ۸۱' شمارہ ۲۔ ایجوکیشنل پریس' اردو بازار' کراچی۔ ۶۴ صفحات۔

ہماری زبان' نئی دہلی (۱۹۵۹ء) : نئی دہلی۔

۳۔ مضامین:۔

امجد کندیانی (۱۹۸۹ء) : اردو میں خاکہ نگاری۔مشمولہ: اردو نثر کا فنی ارتقاء۔از ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔اردو اکیڈمی سندھ۔کراچی۔صفحات ۲۲۵ تا ۲۴۴۔

انیس قدوائی (۱۹۸۰ء) : چودھری محمد علی ردولوی۔مشمولہ : اب جن کے دیکھنے کو۔۔۔۔از انیس قدوائی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔نئی دہلی۔صفحات ۵۳ تا ۶۲۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۴۸ء) : مقدمہ۔مشمولہ : بھولی ہوئی باتیں۔از ہما اخلاق حسین۔سول اینڈ ملٹری پریس' حسن علی آفندی روڈ۔کراچی۔صفحات ۱ تا ۷۔

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۶۴ء) : (چودھری) محمد علی ردولوی۔مشمولہ : نقوش' لاہور' آپ بیتی نمبر' جون۔ صفحات ۹۹۴ تا ۱۰۰۰۔

چودھری محمد علی ردولوی (؟؟۱۹ء) : سرخے آم (نظم)۔مشمولہ : جوئیبار۔از ہما اخلاق حسین۔فیروز سنز۔ کراچی صفحات ۴۶۵ تا ۴۶۶۔

خلیق ابراہیم خلیق (۱۹۹۹ء) : ترقی پسند ادب کی تحریک کا پس منظر۔مشمولہ : منزلیں گرد کے مانند۔۔۔۔ (خودنوشت سوانح عمری)۔از مصنف۔فضلی سنز لمیٹڈ۔کراچی۔صفحات ۱۲۴ تا ۱۴۲۔

ڈاکٹر اختر اورینوی (۱۹۷۷ء) : انشائیہ نگاری۔مشمولہ : مہر نیم روز' کراچی۔اختر اورینوی نمبر۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام (۱۹۸۹ء) : خطوط نگاری۔مشمولہ : اردو نثر کا فنی ارتقاء۔از ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔اردو اکیڈمی سندھ۔کراچی۔صفحات ۲۴۵ تا ۲۴۹۔

ڈاکٹر سید عبداللہ (۱۹۵۷ء) : اردو خط نگاری۔مشمولہ : نقوش' لاہور۔مکاتیب نمبر۔صفحات ۱۵ تا ۳۸۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین (۱۹۸۹ء) : ادب کی ایک خاص صنف' انشائیہ۔مشمولہ : اردو نثر کا فنی ارتقاء۔از ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔اردو اکیڈمی سندھ۔کراچی۔صفحات ۱۲۷ تا ۱۳۴۔

ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی (۱۹۹۳ء) : مقدمہ۔مشمولہ : اردو میں قلمی خاکے۔از پروفیسر شجاع احمد زیبا۔ اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔کراچی صفحات ہ تا ک۔

سید احتشام حسین رضوی (۱۹۵۵ء) : لکھنؤ کے موجودہ ادیب : چودھری محمد علی ردولوی۔مشمولہ : فروغ اردو' لکھنؤ۔صفحات ۶۵ تا ۶۸۔

سید سجاد ظہیر (۱۹۸۰ء) : اقتباس از روشنائی ۔مشمولہ : کشکول ۔ اردو اکیڈمی سندھ ۔ کراچی ۔ صفحات ر تا ز۔

سید علی کاظم (۱۹۸۰ء) : حرفِ اول ۔مشمولہ : کشکول ۔ اردو اکیڈمی سندھ ۔ کراچی ۔ صفحات ط تا ت۔

سید علی محمد زیدی (۱۹۷۷ء) : چودھری محمد علی ۔مشمولہ : اپنی یادیں' ردولی کی باتیں ۔ از مصنف ۔ عزمی پبلی کیشنز ۔ ردولی ۔ صفحات ۲۶۰ تا ۲۶۲۔

شان الحق حقی (۱۹۷۷ء) : تعارف ۔مشمولہ : کویا دبستاں کھل گیا ۔ اضافہ شدہ ایڈیشن ۔ اردو اکیڈمی سندھ ۔ کراچی ۔ صفحات ۱۳ تا ۱۶۔

صلاح الدین احمد (۱۹۵۰ء) : محمد علی ردولوی (ایک مطالعہ) ۔مشمولہ : ادبی دنیا' لاہور ۔ خاص نمبر' دور پنجم' شمارہ اول ۔ صفحات ۱۳۸ تا ۱۴۲۔

صلاح الدین احمد (۱۹۵۱ء) : تعارفِ مصنف ۔مشمولہ : کشکول محمد علی شاہ فقیر از چودھری محمد علی ردولوی ۔ صدیق بک ڈپو ۔ لکھنؤ ۔ صفحات ۵ تا ۲۴۔

صلاح الدین احمد (۱۹۵۶ء) : اس کتاب میں ۔مشمولہ : کویا دبستاں کھل گیا' بار اول ۔ اکادمی پنجاب ۔ لاہور ۔ صفحات ۱۱ تا ۱۳۔

صلاح الدین احمد (۱۹۷۷ء) : اس کتاب میں ۔مشمولہ : کویا دبستاں کھل گیا' اضافہ شدہ ایڈیشن ۔ اردو اکیڈمی سندھ ۔ کراچی ۔ صفحات ۱۰ تا ۱۲۔

صلاح الدین احمد (۱۹۸۰ء) : تعارفِ مصنف ۔مشمولہ : کشکول ۔ اردو اکیڈمی سندھ ۔ کراچی ۔ صفحات ۹ تا ۳۰۔

صلاح الدین احمد (۱۹۹۵ء) : اردو کا اولین فطرت نگار ۔مشمولہ : سوغات' بنگلور ۔ شمارہ ۹' ستمبر ۔ صفحات ۳۰۴ تا ۳۱۳۔

عبدالقیوم رسا (۱۹۳۲ء) : تلخیص وتنقید ۔مشمولہ : ایوان' گورکھپور ۔ شمارہ جولائی ۔ صفحات ۵۹ تا ۶۲۔

غلام رسول مہر (۱۹۵۷ء) : علم و ادب میں خطوط کا درجہ ۔مشمولہ : نقوش' لاہور ۔ مکاتیب نمبر ۔ صفحات ۱۳ تا ۱۴۔

قرۃ العین حیدر (۱۹۹۵ء) : داستان طراز ۔مشمولہ : سوغات' بنگلور ۔ شمارہ نمبر ۹' ستمبر ۔ صفحات ۳۱۴تا۳۲۳۔

کلیم الدین احمد (۱۹۵۹ء) : اردو میں طنز وظرافت ۔مشمولہ : نقوش' لاہور ۔ طنز و مزاح نمبر ۔ صفحات ۴۹تا۸۵۔

مالک رام (۱۹۵۷ء) : اردو کے منفرد مکتوب نگار ۔مشمولہ : نقوش' لاہور ۔ مکاتیب نمبر ۔ صفحات ۱۲تا۱۴۔

مرزا حامد علی بیگ (۱۹۹۵ء) : چودھری محمد علی ردولوی (حیات وحالات) ۔مشمولہ : سوغات' بنگلور ۔ شمارہ ۹' ستمبر ۔ صفحات ۳۰۲تا۳۰۳۔

مرزا محمد عسکری (۱۹۹۵ء) : چودھری محمد علی ردولوی ۔مشمولہ : سوغات' بنگلور ۔ شمارہ ۹' ستمبر ۔ صفحات ۳۲۴تا۳۲۵۔

مسعود الحق (۲۰۰۲ء) : چودھری محمد علی ردولوی ۔مشمولہ : نگار پاکستان' کراچی ۔ جلد ۸۱' شمارہ ۲' فروری ۔ صفحات ۵تا۳۰۔

مسعود الحق (۲۰۰۲ء) : چودھری محمد علی ردولوی کی تصانیف ۔مشمولہ : نگار پاکستان' کراچی ۔ جلد ۸۱' شمارہ ۲' فروری ۔ صفحات ۳۱تا۳۲۔

نظیر صدیقی (۱۹۸۹ء) : انشائیہ کیا ہے؟ مشمولہ : اردو نثر کا فنی ارتقاء ۔ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری ۔ اردو اکیڈمی سندھ' کراچی ۔ صفحات ۱۳۵تا۱۴۳۔

ہما اخلاق حسین (۱۹۵۰ء) : (چودھری) محمد علی (ردولوی) ۔مشمولہ : ادبی دنیا' لاہور ۔ خاص نمبر' دور پنجم' شمارہ اول ۔ صفحات ۱۳۸تا۱۴۲۔

ہما اخلاق حسین (۱۹۵۵ء) : (چودھری) محمد علی ردولوی ۔مشمولہ : نقوش' لاہور ۔ شخصیات نمبر ۔ صفحات ۳۵۴تا۳۵۸۔

ہما اخلاق حسین (۱۹۵۶ء) : پیش لفظ ۔مشمولہ : گویا دبستاں کھل گیا' بار اول ۔ اکادمی پنجاب ۔ لاہور ۔ صفحات ۱۱تا۱۳۔

ہما اخلاق حسین (۱۹۷۷ء) : پیش لفظ ۔مشمولہ : گویا دبستاں کھل گیا' اضافہ شدہ ایڈیشن ۔ اردو اکیڈمی سندھ ۔ کراچی ۔ صفحات ۷تا۹۔

۴۔ مستند سرکاری و غیر سرکاری کاغذات :۔

آئین اکبری (فارسی)' جلد دوم ۔نولکشور پریس ۔لکھنؤ۔

دی امپیریل گزیٹیر آف انڈیا (انگریزی)' جلد ۲۱۔

عابد سلمان : سلمانز ۔فیملی ہسٹری (انگریزی)۔

گزیٹیر آف پراونس اودھ (انگریزی)' جلد اول (۱۸۷۷ء) : نولکشور پریس ۔لکھنؤ۔

واجب العرض تعلقہ امیر پور۔ ۲ رمئی ۱۸۷۰ء۔

واجب العرض تعلقہ نرولی۔ ۱۰ رجنوری ۱۸۷۰ء۔

واجب العرض ردولی قصبہ۔ ۲۶ رفروری ۱۸۷۰ء۔